4	رسید بابت وصولی رقم: گائے	766
5	رسید بابت وصولی رقم: لگان	767
6	رسید بابت وصولی رقم: وظیفہ	767
	اضافی اہم رسیدیں (بمطابق سابقہ بورڈز پیپرز)	
7	رسید برائے وصولی رقم بابت فروختگی مکان	768
8	رسید برائے وصولی رقم بابت فروختگی سائیکل	768
9	رسید برائے وصولی رقم بابت بھینس	769
10	رسید برائے وصولی رقم بابت بھیڑ	769
11	رسید برائے وصولی رقم بابت آبیانہ و مالیہ	770
12	رسید برائے وصولی رقم بابت ٹھیکہ زمین	770
13	رسید برائے وصولی رقم بابت بھوسہ	771
14	رسید برائے وصولی رقم بابت قرض حسنہ	771
15	رسید برائے وصولی رقم بابت ریڈیو سیٹ مع ٹیپ ریکارڈر	772
16	رسید برائے وصولی رقم بابت چندہ	772
17	رسید برائے وصولی رقم بابت کتب	773
18	رسید برائے وصولی رقم بابت قربانی کا بکرا	773
19	رسید برائے وصولی رقم بابت ٹی وی سیٹ مع وی سی آر	774
20	رسید برائے وصولی رقم بابت فروختگی موبائل فون	774
21	رسید راہداری	775
22	کتابوں کے ناشر سے کتابیں وصول کرنے کی رسید	775
23	رسید برائے وصولی رقم بابت مرمت سامان	776
24	رسید برائے وصولی رقم بابت کرایہ رکشہ	776
25	گاڑی / کار کی فروخت کی رسید	777
	تلخیص نگاری (امتحانی نقطہ نظر سے مطالعہ)	778
	نمونۂ تلخیص بمطابق اردو قواعد و انشا (پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ)	780
	اضافی اہم حل شدہ عبارات (بمطابق سابقہ بورڈز پیپرز)	785
	مشقی عبارات بمطابق اردو قواعد و انشا (پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ)	803
	حصہ معروضی	
1	علم قواعد، تعارف (علم، ہجا، رسم الخط، حرف، مرکب / کلام، تشبیہ، استعارہ، تلمیح، مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف) مع کثیر الانتخابی سوالات	806
2	تذکیر و تانیث (1۔ اصول قواعد 2۔ کثیر الانتخابی سوالات)	873
3	**تمام بورڈز کے حل شدہ پرچہ جات**	893

امتحانی پرچہ حل کرنے کا طریقہ / ہدایات

سوال نمبر 2

اشعار کی تشریح

(الف) حصہ نظم وقت: 15 منٹ نمبرز: (1+1+4+4 = 10)

اے رسولِ امیں ﷺ خاتم المرسلیں ﷺ، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
ہے عقیدہ یہ اپنا بہ صدق و یقین، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
اے براہیمی و ہاشمی خوش لقب، اے تُو عالی نسب، اے تُو والا حسب
دُودمانِ قریشی کے دُرِ ثمیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

نظم کا عنوان: نعت
شاعر کا نام: سید نفیس الحسینی نفیس
مفہوم: (مفہوم مختصر اور جامع ہو۔ چار سطور سے زائد نہ ہو)
تشریح:

تشریح طلب اشعار کے پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔
(نظم کے دونوں اشعار کی تشریح تین سے چار صفحات پر مشتمل ہو)
(حوالے کے اشعار ضرور لکھیں)

(ب) حصہ غزل وقت: 25 منٹ نمبرز: (1+3+3+3 = 10)

شعر نمبر 1

پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

شاعر کا نام: میر تقی میر
مفہوم: (مفہوم مختصر اور جامع ہو۔ دو سطور سے زائد نہ ہو)
تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔
(غزل کے ہر شعر کی تشریح ڈیڑھ سے دو صفحات پر مشتمل ہو)
(حوالے کے اشعار ضرور لکھیں)

شعر نمبر 2

لگنے نہ دے بس ہو تو اُس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پُتلی کا تارا جانے ہے

شاعر کا نام: میر تقی میر
مفہوم: (مفہوم مختصر اور جامع ہو۔ دو سطور سے زائد نہ ہو)

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ----------

(غزل کے ہر شعر کی تشریح ڈیڑھ سے دو صفحات پر مشتمل ہو)

(حوالے کے اشعار ضرور لکھیں)

شعر نمبر3

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہو گا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس نے اپنا وارا جانے ہے

شاعر کا نام: میر تقی میرؔ

مفہوم: (مفہوم مختصر اور جامع ہو۔ دو سطور سے زائد نہ ہو)

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ----------

(غزل کے ہر شعر کی تشریح ڈیڑھ سے دو صفحات پر مشتمل ہو)

(حوالے کے اشعار ضرور لکھیں)

سوال نمبر3

عبارت کی تشریح وقت:25منٹ

نمبرز: (1+1+3+10 = 15)

(الف)

حوالۂ متن:

سبق کا عنوان: اخلاقِ نبوی ﷺ

مصنف کا نام: علامہ شبلی نعمانیؒ

ماخذ: سیرت النبیؐ جلد دوم

صنف: سیرت نگاری

سیاق وسباق:

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتا ہے کہ----------

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتا ہے کہ----------

نوٹ۔ (سیاق وسباق کم از کم آٹھ سطور اور زیادہ سے زیادہ بارہ سطور پر مشتمل ہو)

تشریح:

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتا ہے کہ----------

(عبارت کی تشریح اصل عبارت سے کم از کم تین گنا ہو)

نوٹ۔ (حوالۂ متن، سیاق وسباق اور تشریح تین صفحات سے زائد نہ ہو)

سوال نمبر4

خلاصہ وقت:15منٹ

نمبرز: (1+9 = 10)

سبق کا عنوان: نیا قانون

مصنف کا نام: سعادت حسن منٹو

ماخذ: فسانے منٹو کے

صنف: افسانہ

خلاصہ:

نوٹ: (سبق کا خلاصہ دو صفحات سے زائد نہ ہو)

سوال نمبر5

خلاصہ وقت:5منٹ (5)

نظم کا عنوان: آزادیٔ

شاعر کا نام: احسان دانشؔ

خلاصہ:

شاعر کہتا ہے کہ----------

نوٹ: (نظم کا خلاصہ کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ دس سطور پر مشتمل ہو)

سوال نمبر6

مکالمہ وقت:20منٹ(10)

عنوان: دہشت گردی

تمہیدی منظر نامہ:

( )

.....

.....

.....

.....

نفسِ مضمون: .....

.....

.....

اختتامی منظر نامہ: ( )

یا

سوال نمبر 6

روداد

عنوان: محفلِ مشاعرہ کی روداد

سوال نمبر 7

درخواست وقت: 10 منٹ (10)

بخدمت جناب پرنسپل، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج، الف۔ب۔ج۔

عنوان: درخواست برائے فیس معافی

جناب عالی!

تمہیدی کلمہ: نہایت ادب سے التماس ہے کہ----------

نفسِ مضمون: اصل مدعا----------

اختتامی کلمہ: میں تاحیات آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

درخواست گزار

۱۵-مارچ ۲۰۲۵ء آپ کا تابع فرمان

د۔ر۔س

جماعت------

رول نمبر-----

سوال نمبر 7

رسید

عنوان: رسید بابت وصولی کرایہ مکان

باعثِ تحریر آنکہ

نفسِ مضمون----------

---

۱ گواہ شد	۱ العبد	گواہ شد
حافظ محمد عمیر خالد ولد خالد محمود	عبدالہادی ولد محمد عمران	محمد شعیب خالد ولد خالد محمود
قوم راجپوت	قوم راجپوت	قوم راجپوت
ساکن سیٹلائیٹ ٹاؤن	ساکن سیٹلائٹ ٹاؤن	ساکن سیٹلائیٹ ٹاؤن
شہر الف۔ب۔ج	شہر الف۔ب۔ج	شہر الف۔ب۔ج
تحصیل وضلع الف۔ب۔ج	تحصیل وضلع الف۔ب۔ج	تحصیل وضلع الف۔ب۔ج
قومی شناختی کارڈ نمبر-----	قومی شناختی کارڈ نمبر-----	قومی شناختی کارڈ نمبر-----
دستخط-------	دستخط-------	دستخط-------

۱۵-مارچ ۲۰۲۵ء

سوال نمبر 8 وقت: 20 منٹ (10)

تلخیص

کل الفاظ: 100

تلخیص شدہ الفاظ: 33

مناسب یا مجوزہ عنوان: ۱۔ ۲۔

تلخیص شدہ عبارت:

شاعر
حفیظ تائبؔ
(1931-2004)

سبق:1 حمدؔ

شاعر کا تعارف

حفیظ تائبؔ کا اصل نام عبدالحفیظ منہاس ہے مگر وہ اپنے قلمی نام حفیظ تائبؔ سے اتنے معروف ہوئے کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے۔ ان کا آبائی وطن تحصیل وزیر آباد کا ایک نواحی قصبہ احمد نگر ہے جہاں آپ کے والد حاجی چراغ دین منہاس ایک بڑے نیکوکار معلّم اور امام وخطیب کے طور پر جانے جاتے تھے۔ حفیظ تائبؔ نے عربی، فارسی کی بنیادی تعلیم اپنے والد سے اور مڈل تک کی روایتی تعلیم اپنے قصبے کے مڈل سکول سے حاصل کی اور 1947ء میں میٹرک زمیندار ہائی اسکول گجرات سے پاس کرنے کے بعد زمیندار کالج گجرات میں پری انجینئرنگ کلاس میں داخلہ لے لیا مگر ان کا طبعی میلان چوں کہ شعروشاعری کی طرف تھا اس لیے کالج کی تعلیم ترک کر دی اور 1947ء تا 1979ء محکمہ برقیات اور واپڈا میں ملازمت کی مگر اس دوران میں اردو فاضل اور پنجاب یونی ورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایم۔اے پنجابی کے امتحانات پاس کر لیے اور واپڈا کی ملازمت کے ساتھ ساتھ جزوقتی استاد کی حیثیت سے پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ پنجابی کے ساتھ منسلک ہو گئے اور جب واپڈا کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لی تو پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ پنجابی میں باقاعدہ طور پر کنٹریکٹ پر پڑھانے لگے اور یہ سلسلہ 2003ء تک بخیر وخوبی جاری رہا۔

حفیظ تائبؔ پنجاب یونی ورسٹی کے ساتھ منسلک ہونے سے پہلے بھی ایک مشہور حمد ونعت گو کی حیثیت سے پاکستان اور بیرون پاکستان جانے جاتے تھے اور ان کے مداحین ومعتقدین قابلِ رشک تعداد میں موجود تھے۔ وہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں حمد ونعت اور مناجات کہتے تھے۔

حکومتِ پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں 1994ء میں تمغۂ حسنِ کارکردگی عطا کیا اور اہلِ لاہور نے ان کی بے مثال کارکردگی کے پیشِ نظر لاہور کی ایک اہم سکیم علامہ اقبال ٹاؤن کی سب سے اہم اور بڑی سڑک کا نام ان سے منسوب کیا۔

حفیظ تائبؔ کے اب تک گیارہ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں اور وہ ''کائناتِ حفیظ تائبؔ'' کے نام سے کلیات کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں مگر جہاں ان کی نعت گوئی کے میدان میں خدمات بے مثال ہیں وہیں ان کے ہر مجموعے میں حمدیں بھی لازوال ہیں۔ شاملِ نصاب ''حمدؔ'' بھی ایک اعلیٰ پائے کا کلام ہے جس میں لفظوں کی تکرار اس طرح کی گئی ہے کہ یہ تکرارِ لفظی حمد کی شان بن گئی ہے۔

نظم کا خلاصہ

پوری دنیا خدا کے بنائے ہوئے نظام کے ماتحت ہے۔ ساری دنیا میں اسی کی بقا کا ڈنکا بج رہا ہے۔ پہاڑ اس کی شانِ جلالت کی عکاسی کرتے ہیں۔ کائنات میں ہر جگہ اس کی قدرت کے کرشمے عیاں ہیں۔ کہکشاؤں کے ستارے، بادِ صبا کے نغمے اور صبح کی روشنی اسی کی نشانیاں ہیں۔ صدف میں موتی بننے کا عمل اسی کے کرم کا مرہونِ منت ہے۔ اس کی وفا و مہربانی سے ساری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ تمام مخلوق اس کی حمد وثنا کرتی ہے۔ ہر دل میں اس کی طلب موجزن ہے۔ شاعر کی شعلہ نوائی اسی کی یاد کی وجہ سے ہے۔

مرکزی خیال

اس کائنات کا نظم ونسق خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ کائنات میں اس کی قدرت کے کرشمے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر دل میں اس کی چاہت جلوہ فرما ہے۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

کس کا نظام راہ نما ہے اُفق اُفق
کس کا دوام گونج رہا ہے اُفق اُفق

حلِ لغت

نظام (سلسلہ، ترتیب، بندوبست)، راہ نما (راہ دکھانے والا، رہبر)، افق (آسمان کا کنارا، مراد دنیا)، دوام (ہمیشگی، ابدیت)، گونج (بلند آواز)

مفہوم

اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ نظام ساری دنیا کی رہنمائی کر رہا ہے اور اس کی ابدیت کا ڈنکا پورے عالم میں بج رہا ہے۔

تشریح

حفیظ تائبؔ اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی قدرت بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر استفہامیہ انداز میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کون ہے وہ ذات جس کے نظام سے کاروبارِ جہاں چل رہا ہے؟ یہ کائنات اور اس میں موجود اشیا کس کی رہبری اور رہنمائی سے چل رہی ہیں؟ چاند کا گھٹنا اور بڑھنا، سورج کا طلوع وغروب، ستاروں کا چمکنا اور سیاروں کی گردش، دن اور رات کا آنا جانا، موسموں کا تبدیل ہونا، ان سب کو کس ہستی نے ایک نظم وضبط اور قاعدے میں باندھ رکھا ہے؟ انسان غور کرے تو اس نظامِ کائنات کے پیچھے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کارفرما نظر آتی ہے۔ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وہی ہے جس نے تہ بہ تہ سات آسمان بنائے۔ رحمٰن کی تخلیق میں تم کوئی خلل نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کیا کوئی نقص کہیں پاتے ہو؟ پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ تھک کر تمھارے پاس ناکام لوٹ آئے گی۔'' (سورہ ملک: 3-4)

یہ کائنات اسی ہستی کی تخلیق کردہ ہے۔ اسی نے اس کائنات میں ایسی ترتیب وتنظیم رکھی ہے کہ کہیں ذرہ بھر نقص اور اونچ نیچ نظر نہیں آتی۔ ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اسی کی گواہی دے رہی ہے۔ بقول شاعر:

؎ نظامِ آسمانی ہے اُسی کی حکمرانی سے بہارِ جاودانی ہے اُسی کی باغبانی سے (حفیظ جالندھری)

اگر انسان عقل وشعور سے کام لے اور کائنات پر غور کرے تو اللہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ زمین وآسمان میں بکھری ہوئی ہزاروں نشانیاں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس کارخانۂ حیات کو چلانے والی کوئی ہستی موجود ہے۔ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آ گئی بلکہ اس کا ایک خالق ومالک ہے جس نے ایک مقصد کے تحت اس کائنات اور اس کی مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ اس کے وضع کردہ نظام کی رہنمائی کے تحت ہی یہ کائنات چل رہی ہے۔ جس طرح ایک مکان کو دیکھ کر اس کے معمار کا تصور ذہن میں آتا ہے، ایک گھڑی کو دیکھ کر گھڑی ساز کا تصور ذہن میں آتا ہے اور کرسی کو دیکھ کر بڑھئی کا تصور ذہن میں آتا ہے، اسی طرح کائنات کا بغور مشاہدہ کرنے سے اس کے خالق کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کی ذات عیاں ہو جاتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ جگہ

جگہ اپنی پہچان کے لیے اہلِ عقل کو کائنات کے مشاہدے کی دعوت دیتا ہے، ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے:

"اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ"

(سورہ آلِ عمران:190)

ترجمہ: "بے شک زمین و آسمان کی پیدائش میں اور دن اور رات کے آنے جانے میں اہلِ عقل کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں"

بقول شاعر:

؎ اُسی کا یہ جلوہ ہے چاروں طرف ہزاروں نشاں ہیں ، ہزاروں طرف (امیر مینائی)

تشریح طلب شعر کے پہلے مصرع میں جو سوال اٹھایا گیا تھا دوسرے مصرع میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جسے ہمیشگی اور دوام حاصل ہے۔ اس کی قدرت و حکمت پوری کائنات میں گونج رہی ہے۔ کائنات کی ہر چیز پکار پکار کر اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق و مالک ابدی و ازلی ہے۔ وہ زندہ ہے اور قائم بالذات ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دنیا اور دنیا کی مخلوقات مرتی اور مٹتی رہتی ہیں جب کہ خدا کی ذات ہر قسم کے تغیر و تبدل سے پاک ہے۔ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

"زمین پر موجود ہر شے فانی ہے۔ صرف تیرے رب کی عزت و جلالت والی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔"

(سورہ رحمٰن:26۔27)

کائنات اور اس میں موجود اشیا چاند، سورج، ستارے، موسم، ہوا، بادل، بارش، دریا اور سمندر، ذرے (ایٹم) سے لے کر سورج تک ہر چیز میں ایک نظم و ترتیب کا قائم ہونا کسی زبردست خالق کے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ ہر ایک شے میں جھلک وہ اپنی ربوبیت کی دکھا رہا ہے نظام اس کائنات کا جو بہ حُسن و خوبی چلا رہا ہے

انسان اپنے وجود پر غور کرے تو عیاں ہوتا ہے کہ اس کا وجود خود ایک حیرت کدہ ہے۔ انسان کا دل جو ہر لحہ دھڑک رہا ہے، اس کا خون جو خاموشی سے گردش میں ہے، اس کا دماغ جو ہر لحہ خیالات کو گرفت میں لا رہا ہے۔ گردے جو خون کو آلائشوں سے پاک کر رہے ہیں، پھیپھڑے جو سانسوں میں زندگی اور تازگی بھر رہے ہیں، اس کا ڈی۔ این۔ اے جو پیچیدہ ترین رازوں کو محفوظ کیے ہوئے ہے، یہ سب ایک ہی صدا بلند کر رہے ہیں کہ کوئی ہے جو خالق ہے، جو حکمت والا ہے، جو علم والا ہے اور جو قدرت والا ہے۔

انسان چاہے کسی بھی قوم، قبیلے یا مذہب میں پیدا ہو، اس کے دل میں نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کیا گیا ہے۔ اس کا ضمیر اسے بتاتا ہے کہ سچائی خیر ہے، جھوٹ شر ہے۔ یہی وہ فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (سورۃ الروم:30)

ترجمہ: "اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا۔"

کائنات میں بکھرا ہر رنگ، ذرات میں جھلکتی ترتیب اور انسان کے نفس کی پکار یہی ہے کہ یہ نظام اسی کا ہے جس کا نور زمین و آسمان میں ضیا بن کر پھیلا ہے۔ جس کی حکمت ہر رگ و پے میں رواں ہے۔ صرف وہی ایک ذات ہے جس کا دوام وقت کی حدود سے ماورا ہے۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ شعر کی ردیف میں "افق افق" کے الفاظ صنعتِ تکرار ہیں، جن سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ اسی طرح "نظام راہ نما" اور "دوام گونج رہا" کے الفاظ بطور کنایہ استعمال ہوئے ہیں۔ شعر کا استفہامیہ انداز غور و فکر پر مائل کرتا ہے اور تجسس کو ابھارتا ہے۔ مصرع ثانی میں مصرع اولیٰ کے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ صنعت سوال و جواب ہے۔ مصرع اولیٰ کا ہر لفظ مصرع ثانی کے مقابل اور ہم وزن ہے یہ صنعتِ ترصیع ہے۔

شعر نمبر 2

شانِ جلال کس کی عیاں ہے جبل جبل
رنگِ جمال کس کا جما ہے اُفق اُفق

حل لغت

شانِ جلال (رعب و دبدبہ کی شان، عظمت و بزرگی)، عیاں (ظاہر)، جبل (پہاڑ)، رنگِ جمال (خوب صورتی کا رنگ)، جما (ثبت)

مفہوم

خدا کی ہیبت اور شان کی عکاسی پہاڑوں سے عیاں ہے اور اس کی خوب صورتی تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔

تشریح

حفیظ تائب اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جمال کے حسین امتزاج کو دل نشیں انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ استفہامیہ اسلوب میں سوال اٹھا کر قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتا ہے اور کائنات کی عظیم الشان تخلیقات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں میں جو عظمت، ہیبت اور رعب نمایاں ہے وہ دراصل خدا کی شانِ جلال کی روشن دلیل ہے۔ دوسری طرف آسمان کی وسعتوں، افق کے کناروں، بادلوں کے رنگ، روشنی کے کھیل اور فضا میں بکھرے حسن کی لطافت، اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمال کا پرتو ہے۔

شاعر کا انداز دراصل کائنات کے مشاہدے کی طرف بلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان پہاڑوں کی بلندیاں، ان کا سکوت، ان کی عظمت اور ان کی ہیبت کسی عظیم ہستی کے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ وہ عظیم ہستی اللہ تعالیٰ ہے جو قہار بھی ہے اور جمیل بھی۔ جبار بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کی بے مثال صفات کا ایک پہلو جلال ہے جو پہاڑوں جیسی پرشکوہ چیزوں میں جلوہ گر ہے، قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ انھیں لے کر لڑھک نہ پڑے۔" (سورۃ الانبیا:31)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں قرار دیا ہے۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

"کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو اس کی میخیں بنایا۔" (سورۃ النبا:6,7)

یقیناً پہاڑ اللہ تعالیٰ کی صفتِ جلال کی علامت ہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت عیاں ہے۔ اس نے کتنے ہی پہاڑی سلسلے تخلیق کیے ہیں جو بلند و بالا پہاڑوں پر مشتمل ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلے سیکڑوں میل کی طوالت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بے شمار پہاڑ ایسے ہیں جن کی بلندی سطحِ سمندر سے ہزاروں میٹر ہے۔ ان پہاڑی سلسلوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کا احساس ہوتا ہے۔

دوسرے مصرع میں اللہ تعالیٰ کے رنگِ جمال کا ذکر ہے۔ اس مصرع میں شاعر کائنات میں پھیلے حسن و جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ہمارے سامنے صبح کی کرنیں، شام کی سرخی، بہار کے رنگ، چاند کی چاندنی، پھولوں کی خوش بو، پرندوں کے نغمے، بہتی ندیوں کے ساز، بارش کی رم جھم، یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمال کے مظاہر ہیں۔ کائنات میں بکھرا حسن و جمال، اللہ تعالیٰ کے صفتِ جمال کا پرتو ہے۔

آنحضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

ان اللہ جمیل ویحب الجمال

"بے شک اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند فرماتا ہے۔"

دوسرے مصرع "رنگِ جمال کس کا جما ہے افق افق۔ میں "جما" سے مراد "سجا ہوا اور پوری طرح ظاہر ہو رہا" ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جمال کے رنگ پوری طرح سجے ہوئے اور رچ بس گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے جمال کے رنگ نہ صرف موجود ہیں بلکہ پوری کائنات میں پختگی سے سجے ہوئے، جمے ہوئے اور ہر طرف ظاہر ہو رہے ہیں۔

اس مصرع میں بھی شاعر سوالیہ انداز میں کہتا ہے کہ ہر سمت، ہر افق پر جو خوب صورتی چھائی ہوئی ہے، جو رنگ بکھرے ہوئے ہیں وہ آخر کس کے جمال کا پرتو ہے؟ اگر غور کریں تو کائنات رنگوں سے بھری ہوئی ہے، سورج کے طلوع و غروب کے وقت افق رنگین ہو جاتا ہے۔ بارش کے بعد قوسِ قزح بھی افق پر رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ کبھی افق پر گھٹائیں نیلی پریوں کی طرح رقص کرتی نظر آتی ہیں، اسی طرح زمین پر کھلے ہزاروں رنگوں کے پھول بھی دراصل خدا کی قدرت کے رنگ بکھیرتے ہیں۔ ان پھولوں کی نزاکت، لطافت، رنگت اور خوش بو انسان کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ:

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیوں کر ہوا (علامہ اقبالؒ)

اللہ تعالیٰ "احسن الخالقین" ہے۔ اس کی تخلیق میں حُسن، ترتیب اور توازن نمایاں ہے۔ دنیا میں انسان بھی تخلیق کار ہوتے ہیں یعنی انسان بھی چیزیں بناتے ہیں لیکن وہ محض مادے کو ترتیب میں لا کر کچھ تخلیق کرتے ہیں۔ وہ جو بھی بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ مادے یا چیزوں کو ترتیب دے کر نئی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ تخلیق کی اصل اور حقیقی طاقت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی صفت اس کی تخلیق کردہ کائنات میں جھلکتی ہے۔ ہر ذرے، ہر منظر اور ہر نظام میں جو حسن، رعنائی، رنگ، ترتیب اور حکمت کی جھلک نظر آتی ہے وہ صرف اسی کی قدرت کا کمال ہے۔

یہ شعر بظاہر ایک سوال ہے مگر درحقیقت یہ ایک اعلان ہے۔ یہ کائنات کا منظر نامہ پڑھنے کی دعوت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم دیکھ سکتو پہاڑوں کی ہیبت میں اللہ تعالیٰ کا جلال دکھائی دے گا۔ اگر محسوس کرو تو افق کے رنگوں میں اس کا جمال جھلکتا نظر آتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز، اسے بار بار دیکھ

یہ کائنات محض ظاہری، مادی چیزوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں حسن، معنویت، حکمت اور اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ شعر خدا کی جمالیاتی اور جلالی صفات کے اظہار کا ایک بھرپور اور مؤثر بیان ہے۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرعِ اولیٰ میں "جبل جبل" کے الفاظ اور مصرعِ ثانی میں "افق افق" کے الفاظ صنعتِ تکرار ہیں، جن سے شعر میں ایک حسین ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح "شانِ جلال" اور "رنگِ جمال" کی تراکیب ایک دوسرے کے مقابل آئی ہیں جس سے شعر کا صوتی حسن مزید نکھر گیا ہے۔ شعر کا استفہامیہ انداز اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے جو انسان کو غور و فکر پر مائل کرتا ہے۔ مصرعِ اولیٰ کے ہر لفظ کے مقابل مصرعِ ثانی کے الفاظ بھی ہم وزن ہیں، یہ صنعتِ ترصیع کا بہترین استعمال ہے۔

شعر نمبر 3

کس کے لیے نجوم بکف ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کھلا ہے اُفق اُفق

حلِ لغت

نجوم بکف (ستارے ہتھیلی پر لیے)، روش روش (ہر کیاری، مراد کہکشائیں)، بابِ شہود (گواہی/شہادت کا دروازہ)

مفہوم

ہر کہکشاں ہتھیلی پر ستارے لیے ہوئے ہے۔ گویا تمام دنیا میں ظہورِ حق کا دروازہ کھلا ہے۔

تشریح

حفیظ تائب اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

یہ شعر ایک سوال ہے مگر اس سوال میں یقین چھپا ہوا ہے۔ شاعر کائنات کے نظام پر غور کرتا ہے اور حیرت سے پوچھتا ہے کہ یہ ستارے جو آسمان کی وسعتوں میں روشن ہیں، یہ کس کی خاطر روشنی بکھیر رہے ہیں؟ ان کا نور، ان کا نظم اور ان کی رعنائی آخر کس کے لیے ہے؟ یہ ایک معمولی سوال نہیں بلکہ خدا کی پہچان کی طرف ایک فکری دعوت ہے۔ نجوم یعنی ستارے، کائنات کے چراغ ہیں۔ ہر روش (راستے) میں ان کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ کسی اعلیٰ ہستی نے انھیں کسی خاص حکمت کے تحت وہاں سجا رکھا ہے۔ ان کی روشنی، ان کا راستوں پر بکھرے ہونا، سب ایک مقصد کے تحت ہے۔ اور وہ مقصد، انسان کو خدا کے وجود کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ستاروں کا ذکر کیا ہے۔ سورۃ الملک میں انھیں آسمان کی زینت بھی کہا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَ لَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ

"ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے سجا دیا ہے۔"

یہ ستارے جو آسمان کی خوب صورتی کا ذریعہ ہیں وہ اپنے خالق کی پہچان کا ذریعہ بھی ہیں۔ ستارے رات کو جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے ہیں حالاں کہ ان کا وجود زمین کے حجم سے بھی کئی گنا زیادہ بڑے آگ کے گولے کی طرح ہے۔ آگ کے اتنے بڑے گولے کس طرح انسانوں کے لیے ایک خوب صورت وجود بن جاتے ہیں، یہ امر انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ بقول شاعر:

ہر ستارے میں آباد ہے اک جہاں چاند سورج تری روشنی کے نشاں (مظفر وارثی)

دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ "بابِ شہود کس کا کھلا ہے افق افق۔" یہاں "بابِ شہود" ایک گہرا مفہوم رکھنے والی صوفیانہ ترکیب ہے۔ اس شعر میں یہ خاص معنویت رکھتی ہے۔ اس ترکیب میں "باب" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "دروازہ، راستہ یا داخل ہونے کی جگہ۔" "شہود" بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "مشاہدہ کرنا، آنکھوں سے دیکھنا، حاضر ہونا یا کسی حقیقت کا شعوری ادراک کرنا۔" صوفیانہ اصطلاح میں "شہود" اس تجربے کو کہتے ہیں جس میں انسان کسی سچائی یا حقیقت کو اپنی باطنی یا ظاہری آنکھ سے براہِ راست دیکھتا یا محسوس کرتا ہے۔

چناں چہ "بابِ شہود" سے مراد وہ دروازہ یا راستہ ہے جس سے گزر کر حقیقتِ کائنات کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ یہ دروازہ عقل، معرفت اور باطنی بیداری کے ذریعے کھلتا ہے۔ یہ انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا کے وجود، اس کے جلووں اور کائنات میں اس کے مظاہر کو محسوس کر سکے۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (سورۃ فصّلت:53)

"ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق (کائنات) میں اور خود ان کے اندر دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ وہی (اللہ) حق ہے۔"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات اور انسان کے اندر ادراک کے ایسے دروازے کھولے جاتے ہیں جن سے خدا کی معرفت آشکار ہوتی ہے۔ قرآنی آیات سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ خدا کا مشاہدہ یعنی شہود، صرف آسمانوں اور زمین میں نہیں بلکہ خود انسان کے باطنی شعور سے بھی ممکن ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ (20) وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (21)

"اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمھارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں۔" (سورۃ الذاریات)

قرآنِ مجید بار بار اہلِ عقل کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات کا مشاہدہ کریں۔ سورج، چاند، ستارے، دن، رات، پہاڑ، دریا، بارش، فصلیں سب ایک ہی پیغام دے رہے ہیں اور وہ پیغام ہے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کا۔ بقول شاعر:

ہر ایک شے میں جھلک وہ اپنی ربوبیت کی دکھا رہا ہے ۔۔۔ نظام اس کائنات کا جو بہ حُسن و خوبی چلا رہا ہے

شاعر کہتا ہے کہ افق افق پر مشاہدے، گواہی اور پہچان کے دروازے کھلے ہیں لیکن وہ سوال کرتا ہے کہ یہ کس کی پہچان اور معرفت کے دروازے کھلے ہیں؟ یہ سوال دراصل انسان کو متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کائنات کے ہر افق، ہر کنارے اور ہر سمت میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں۔ کائنات کے ہر گوشے میں صرف اس کے وجود کی جھلک ہے۔ مشاہدہ کرنے والی آنکھ کے لیے ہر منظر ایک دروازہ ہے جو خالق کی طرف کھلتا ہے۔ ہر ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ نظمِ کائنات ایک صاحبِ حکمت ہستی کے دستِ قدرت کا کرشمہ ہے، ہر طرف اسی کے نشان بکھرے ہوئے ہیں۔ بقول امیر مینائی:

اسی کا یہ جلوہ ہے چاروں طرف ۔۔۔ ہزاروں نشاں ہیں، ہزاروں طرف

اس شعر میں نجوم بکف روشوں کا بابِ شہود کے ساتھ ایک گہرا معنوی ربط ہے۔ نجوم بکف کا مطلب ہے کہ ''ہاتھ میں ستارے لیے'' ہونا۔ پہلے مصرع کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ کائنات کی ہر روش، ہر راستہ اور ہر کنارا ہاتھوں میں ستارے لیے ہوئے ہے۔ ستاروں کی روشنی بابِ شہود یعنی اللہ تعالیٰ کی پہچان کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ نجوم بکف روش دراصل بابِ شہود کی تمہید ہے۔ جب انسان کائنات کی روشوں میں بکھرے ''نجوم'' کو دیکھتا ہے یعنی خدا کی نشانیوں پر غور کرتا ہے تو اس پر ''بابِ شہود'' کھلتا ہے۔ یعنی اس پر معرفتِ الٰہی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ شاعر ستاروں کی روشنی اور ہر افق پر قدرت کی نشانیوں کا ذکر کر کے سوال کرتا ہے کہ کبھی ان پر غور کیا کہ یہ سب کس کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ یہ سب انسان کے لیے دعوتِ فکر ہیں کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے اور اس کی بندگی بجالائے۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرعِ اولیٰ میں ''روش روش'' کے الفاظ اور مصرعِ ثانی میں ''افق افق'' کے الفاظ صنعتِ تکرار ہیں، جن سے شعر میں ایک ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح ''نجوم بکف'' اور ''بابِ شہود'' کی تراکیب نہایت بلیغ ہیں۔ شعر کا استفہامیہ انداز اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے جو انسان کو کائنات پر غور و فکر پر مائل کرتا ہے۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا ۔۔۔ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا (میر درد)

شعر نمبر 4

کس کے لیے سرودِ صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے نمودِ ضیا ہے اُفق اُفق

حلِ لغت

سرودِ صبا (صبح کی ہوا کا نغمہ)، چمن چمن (تمام باغ میں)، نمودِ ضیا (روشنی کا ظہور)، اُفق اُفق (تمام دنیا میں)

مفہوم

صبح کی ہوا کا گیت اور دنیا میں روشنی کا ظہور خدا کے ہونے کی نشانیاں ہیں۔

تشریح

حفیظ تائب اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر سوالیہ انداز میں فطرت میں پھیلی قدرت کی نشانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تمام چمن میں بادِ صبا کا نغمہ کس کے لیے ہے؟ اور تمام دنیا میں روشنی کا ظہور کس کے لیے ہے؟ شاعر سوالیہ انداز میں دراصل غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ کائنات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ کائنات میں جا بجا خدا کی قدرت کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ہر چیز پکار پکار کر اپنے خالق کی گواہی دیتی ہے۔ باغ میں صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا میں جو سرسراہٹ ہے وہ دراصل خدا کی حمد و ثنا کا نغمہ ہے جو تمام چمن میں پھیل جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ"

''کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے'' (سورہ بنی اسرائیل:44)

صبح کی ہوا باغ کے درختوں کے پتوں سے ٹکراتی ہے تو ایک خوب صورت ترنم پیدا کرتی ہے۔ یہ آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے اور ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کوئی خوش گلو نغمہ گنگنا رہا ہے۔ بادِ صبا کے نغمے اتنے خوب صورت ہوتے ہیں کہ دنیا کے نغمے ان پر فدا ہو جائیں۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوش بو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر چہار جانب پھیل جاتی ہے۔ بادِ صبا کے چلنے سے سرسبز گھاس، درخت، پھول اور پودے لہلہاتے ہیں اور کھیت خوشی سے جھومتے ہیں۔ یہ نظارا بہت اثر انگیز ہوتا ہے۔ چمن چمن ہوا کے یہ نغمے دراصل خدا کے ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ صبح کی ہوا دراصل خدا کا پیغام سناتی ہے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری ۔۔۔ گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں روشنی کا نمودار ہونا بھی خدا کی ایک نشانی ہے۔ کائنات کی اصل اندھیرا ہے۔ خدا ہے جو اندھیرے میں سے روشنی کو کھینچ لاتا ہے۔ روشنی کے لیے اس نے سورج بنایا ہے جو خدا کی تخلیق کا شہکار ہے۔ نمودِ صبح کے وقت سورج کی کرنوں سے جیسے ہی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا ہے، ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔ ہر طرف نور ہی نور اور حسن ہی حسن چھا جاتا ہے۔ زمین پر ریت کے ننھے ذرے مسکرانے لگتے ہیں۔ ریت کے ذروں پر جب روشنی کی کرن پڑتی ہے تو وہ ہیروں کی مانند چمکنے لگتے ہیں۔ سورج کے طلوع و غروب سے کائنات میں رنگ بکھرتے ہیں۔ ہزاروں جلوے اور نظارے تخلیق پاتے ہیں۔ بقول شاعر:

صبح کا منظر ہے کتنا دل نشیں ۔۔۔ ہر طرف ہے نور سا پھیلا ہوا

اور بقول حفیظ جالندھری:

زمیں پہ نور چھا گیا ۔۔۔ فلک پہ رنگ آ گیا

شعر میں شاعر نے فطرت کے دو خوب صورت مظاہر کو بڑی لطافت سے پیش کیا ہے۔ ''سرودِ صبا'' یعنی ہوا کا نغمہ اور ''نمودِ ضیا'' یعنی روشنی کی جلوہ گری، دونوں کا ذکر سوالیہ انداز میں کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چمن میں صبح کی نرم ہوا پتوں کو یوں چھوتی ہے جیسے ساز بجا رہی ہو۔ پھولوں اور پودوں کی نرم پتیوں کو چھو کر شیریں نغمہ سناتی ہے۔ وہ چمن میں پھولوں کے ساتھ سرگوشیاں کرتی ہے۔ صبا کی سرگوشیاں دل کو سکون اور روح کو مہکا دیتی ہیں۔ لیکن یہ حسن، یہ نغمگی، یہ سرور آخر کس کے لیے ہے؟ اسی طرح ہر افق پر جو روشنی بکھری ہے، سورج کی کرنیں جو آسمان کو روشن اور چمن کو رنگین کر رہی ہیں، آخر کس کے استقبال کی تیاری میں مصروف ہیں؟

شاعر کا سوال ایک دعوتِ فکر ہے۔ یہ سوال دل میں غور و فکر کی ایک چمک پیدا کرتا ہے اور اس کا جواب خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ بندے کی روح کی بیداری اور خالق کی پہچان کے لیے ہے۔ بقول شاعر:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے ۔۔۔ اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی (جوش ملیح آبادی)

الغرض شاعر کہتا ہے کہ چاند، سورج اور ہوا یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں۔ اگر تم غور و فکر کرو تو ان سے خدا کے ہونے کا ثبوت لے سکتے ہو۔ خدا نے یہ سب چیزیں بے مقصد پیدا نہیں کیں۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں ''چمن چمن'' کے الفاظ اور مصرع ثانی میں ''افق افق'' کے الفاظ صنعتِ تکرار ہیں، جن سے شعر میں ایک حسین ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح ''سرودِ صبا'' اور ''نمودِ ضیا'' کی تراکیب ایک دوسرے کے مقابل آئی ہیں جس سے شعر کا صوتی حسن مزید نکھر گیا ہے۔ شعر کا استفہامیہ انداز اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے جو انسان کو غور و فکر پر مائل کرتا ہے۔ شاعر بڑی مہارت سے مصرع اولیٰ کے ہر لفظ کے مقابل مصرع ثانی کے الفاظ لایا ہے جو ہم وزن بھی ہیں، یہ صنعتِ ترصیع کا بہترین استعمال ہے۔

شعر نمبر 5

مکتوم کس کی موجِ کرم ہے صدف صدف
مرقوم کس کا حرفِ وفا ہے اُفق اُفق

حلِ لغت

مکتوم (مخفی، چھپا ہوا)، موجِ کرم (فضل و رحمت کی لہر)، صدف (سیپ جس میں موتی بنتا ہے)، مرقوم (لکھا ہوا، رقم کیا گیا)، حرفِ وفا (وفا کی بات، محبت و کرم)

مفہوم

سیپ میں کس کا فضل و کرم مخفی ہے اور کس کی وفاداری پوری دنیا میں مرقوم ہے۔

تشریح

حفیظ تائب اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر اللہ تعالیٰ کی کاری گری اور حسنِ تخلیق کو بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات احسن الخالقین ہے۔ اس کی تخلیق کے بے مثال نمونے تمام کائنات میں جا بجا موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بادل جہاں پر برستا ہے تو بارش کے قطرات کھیتوں کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب کرتے ہیں اور پھولوں، پھلوں اور اناج کے بننے کا باعث ہیں۔ اسی طرح کئی قطرے سمندر کنارے سیپ میں داخل ہو کر موتی بن جاتے ہیں۔ یہ خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہی پانی زمین میں جا کر کھیتی کی شادابی کا باعث بنتا ہے اور سیپ میں داخل ہو کر بیش قیمت موتی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے (علامہ اقبالؒ)

چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ ہر صدف میں جو موتی بننے کا عمل ہے اس کے پسِ پردہ خدا کی رحمت اور فضل و کرم مخفی ہے۔ یہ اس کی کاری گری اور کرشمۂ قدرت ہے کہ وہ پانی کو نایاب موتی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

پھول میں مثلِ بُو، چھپ کے بیٹھا ہے تُو
جس نے کی جستجو، مل گیا اس کو تُو

یہ مصرع اپنے اندر ایک گہری روحانی معنویت رکھتا ہے۔ یہاں ''مکتوم'' یعنی ''چھپی ہوئی، پوشیدہ'' شے کا ذکر ہے۔ ''موجِ کرم'' سے مراد مسلسل، جاری، خاموش مہربانی اور رحمت ہے۔ صدف، ایک سیپی ہے جو بظاہر ایک عام سی چیز ہے لیکن اس کے اندر ایک نایاب موتی چھپا ہوتا ہے۔ اس نکتے کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر صدف میں، ہر ذرے میں اور ہر وجود میں کوئی نہ کوئی عطا اور نعمت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ نعمت اللہ تعالیٰ کے کرم کی وہ موج ہے جو ہر شے میں رواں دواں ہے۔ جو ظاہر کم ہے لیکن

باطن میں بہت گہری اور فراواں ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (سورۃ النحل:18)

ترجمہ: اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو تم انھیں شمار نہ کر سکو گے۔''

اس آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ انسان جن نعمتوں کو روز دیکھتا ہے، ان کے علاوہ بھی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو اس کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ نعمتیں کبھی صلاحیت کی شکل میں ہوتی ہیں، کبھی صبر کی، کبھی سکون و اطمینان کی شکل میں ہوتی ہیں۔ یہ سب نعمتیں پوشیدہ انداز میں، اندر ہی اندر انسان کی شخصیت کو سنوار رہی ہوتی ہیں۔ یہی دراصل ''مکتوم موجِ کرم'' ہیں۔

علم، محبت، ہدایت، معرفت، رحمت، تحفظ اور صلاحیت ایسی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں اسی طرح ودیعت کی ہیں جس طرح صدف میں موتی چھپا رکھا ہو۔ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی ''موجِ کرم'' ہیں۔ پودا، جانور ہو یا انسان، ہر مخلوق اپنی اپنی سطح پر اللہ کی اس موجِ کرم سے فیض پا رہی ہے۔ اکثر یہ فیض مکتوم ہوتا ہے یعنی نظر نہیں آتا مگر اثر ضرور رکھتا ہے۔ کائنات میں جو کچھ بھی پوشیدہ حسن، چھپی ہوئی خوبی یا نادیدہ عطا ہے، وہ سب درحقیقت اللہ کی رحمت کی تجلی ہے۔

شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر آسمان کے افق پر بکھری روشنیوں، رنگوں اور وسعتوں کو ایک زندہ تحریر تصور کرتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتا ہے کہ یہ جو ہر افق پر وفا کا لکھا ہوا نشان دکھائی دیتا ہے، یہ تحریر آخر کس کی ہے؟ یہاں ''مرقوم'' لکھی ہوئی چیز اور ''حرفِ وفا'' سے مراد ایسا لفظ ہے جو کسی دائمی محبت، کسی لازوال وعدے اور کسی نہ ٹوٹنے والے تعلق کی علامت ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کی وسعت میں جو کچھ پھیلا ہے وہ درحقیقت کسی ایسی ہستی کا لکھا ہوا وعدہ ہے جو مہر و وفا کا سرچشمہ ہے۔

یہ وفا کسی انسان کی وفا نہیں، یہ ربِ ذوالجلال کی وفا ہے جس نے اپنی مخلوق سے وعدہ کیا ہے کہ:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (سورۃ الاعراف:156)

''میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔''

شاعر کے نزدیک آسمان کا ہر کنارہ اور مظاہرِ فطرت کا ہر پرتو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک علامتی تحریر ہے۔ یہ تحریر ایک وعدہ ہے کہ وہ کبھی اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی مخلوق سے نہ کبھی منہ موڑتا ہے نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے۔ بقول ظفر علی خان:

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اس کا

شاعر کہتا ہے کہ اس کائنات کا پالن ہار اور پروردگار خدا ہی ہے۔ کائنات کی ہر شے اسی کے دم سے خوشنما ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ وہی تمام کائنات کا نظم و نسق بہ حسن و خوبی چلا رہا ہے۔ جس طرح ایک مالی اپنے باغ سے وفاداری کرتا ہے اور اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا ہے، وقت پر پانی دیتا ہے اور اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کائنات کی نگہبانی کرتا ہے۔ وہ اس کائنات کا محافظ بھی ہے اور رازق بھی۔ وہ اس دنیا کے گلشن کی تزئین و آرائش بھی کرتا ہے۔ اسی کے سہارے یہ نظام احسن طریقے سے چل رہا ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز پر اسی کا نام اور اسی کی کاری گری ثبت ہے۔ ہر چیز اس عظیم خالق کی نشانی ہے۔ بقول شاعر:

ہر ذرہ ہے اس بات کا شاہد کہ خدا ہے
حیراں ہے مگر عقل کہ وہ کیسا ہے کیا ہے

شعر میں ''صدف صدف'' اور ''افق افق'' کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار ہے۔ شعر کا استفہامیہ انداز اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے جو انسان کو غور و فکر پر مائل کرتا ہے۔ شاعر بڑی مہارت سے مصرع اولیٰ کے ہر لفظ کے مقابل مصرع ثانی میں ہم وزن الفاظ لایا ہے۔ مکتوم، مرقوم، کس کا، کس کی، موجِ کرم، حرفِ وفا، صدف صدف، افق افق۔ یہ الفاظ نہ صرف ایک دوسرے کے مقابل ہیں بلکہ ہم وزن بھی ہیں، یہ صنعتِ ترصیع کا بہترین استعمال ہے۔

شعر نمبر 6

کس کی طلب میں اہل محبت ہیں داغ داغ
کس کی ادا سے حشر بپا ہے اُفق اُفق

حل لغت

طلب (چاہ، چاہت، محبت)، اہل محبت (محبت کرنے والے، عاشق)، داغ داغ (زخم زخم)، ادا (ناز، شان)، حشر بپا (حشر قائم ہونا)

مفہوم

اہلِ محبت خدا کی چاہت میں بے قرار ہیں اور اسی کی اداؤں سے دنیا میں حشر بپا ہے۔

تشریح

حفیظ تائب اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر ان لوگوں کی بات کرتا ہے جن کے دل عشق سے بھرے ہوئے ہیں۔ جو محبت کرنے والے، سچے عاشق ہیں۔ وہ کسی ایسی ہستی کی تلاش میں ہیں جس نے ان کے دلوں کو تڑپا رکھا ہے۔ جس کی طلب نے ان کے دلوں کو زخموں سے چور کر دیا ہے۔ وہ دلوں میں دکھ اور فراق کے داغ لیے پھرتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ وہ کون ہے جس کے حسن، جلال یا ادا کی جھلک سے دنیا میں ہلچل مچ گئی ہے؟ وہ کون ہے جس کے جلووں نے افق کو روشن کر دیا ہے؟ وہ کون ہے جس کی اداؤں نے ایک حشر بپا کر رکھا ہے؟ یقیناً وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس کی ایک جھلک، ایک تجلی کائنات کے لیے ایک حشر کی مانند ہے۔ اسی کے عشق میں اہلِ محبت سرگرداں ہیں۔ انھیں کے بارے میں قرآنِ مجید میں خدا کا فرمان ہے:

والذین امنوا اشد حبا للہ

ترجمہ: ''اور جو اہلِ ایمان ہیں وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔'' (سورہ بقرہ: 165)

خدا کے یہ سچے عاشق خدا کی محبت میں تلواروں سے کٹ جاتے ہیں، نیزوں میں پرو دیے جاتے ہیں، بے خوف وخطر آگ میں کود پڑتے ہیں۔ یہ کبھی گرم ریت پر احد احد کی صدائیں بلند کرتے نظر آتے ہیں، کبھی تختۂ دار پر کلمہ حق بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی خدا کی محبت میں اہل وعیال، مال ومنال رشتہ وپیوند اور وطنِ عزیز، ہر چیز چھوڑ دیتے ہیں۔ بقول شاعر:

؎ سلام اُن پر تہِ تیغ بھی جنھوں نے کہا — جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے (مجید امجد)

الغرض خدا کے عاشق خدا کی محبت میں ہر تکلیف گوارہ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ جان کی بازی لگانے کے لیے ہمہ وقت بے قرار رہتے ہیں۔ ان کا دل خدا کی محبت کی شدت میں داغ داغ (بے قرار) ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

؎ کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ کس کی اداؤں سے پوری دنیا میں ایک حشر بپا ہے۔ اداؤں سے مراد اللہ تعالیٰ کی خوب صورت صفات ہیں جو پوری کائنات میں پھیلی نظر آتی ہیں۔ ہر چیز میں اس کی صفتِ جمال کی جھلک نظر آتی

ہے۔ اس کے حسن کے جلوے افق افق پھیلے ہوئے ہیں۔ خدا سے محبت کرنے والے جب کائنات کے ذرے ذرے میں محبوبِ حقیقی کے حسن وجمال کے جلوے دیکھتے ہیں تو خدا کی محبت میں اور زیادہ بے قرار ہو جاتے ہیں۔ جس طرح دنیوی عاشق محبوب کی اداؤں کو دیکھ کر بے قرار و بے تاب ہو جاتے ہیں، اسی طرح خدا کے عاشق کائنات کی کسی بھی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس میں انھیں محبوبِ حقیقی کے جلوے، اس کا جمال اور اس کی ادائیں نظر آتی ہیں۔ سمندروں، پہاڑوں اور دریاؤں میں اس کا جلال نظر آتا ہے۔ خوب صورت پھولوں اور سرسبز وادیوں میں اس کا جمال نظر آتا ہے۔ چاند، سورج اور ستاروں میں اس کی قدرت کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ الغرض پوری کائنات میں اس کے جلووں کا حشر بپا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"کل یوم ھو فی شان"

ترجمہ: ''ہر روز اس کی شان جدا ہے۔'' (سورہ رحمٰن:29)

ہر روز خدا کی ادا اور اس کی شان نرالی ہوتی ہے۔ ہر شے میں خدا کی جلوہ گری اور اس کی صفات وتجلیات کا اظہار ہے۔ ہر زمانے، ہر دور، ہر روز اور ہر وقت خدا ایک نئے انداز اور ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ محتاج کو غنی کرتا ہے، ٹوٹے دلوں کو جوڑتا ہے، کسی کو عطا کرتا ہے، کسی کو محروم کرتا ہے، وہ موت دیتا ہے، وہ زندگی دیتا ہے، کسی کو پست کرتا ہے، کسی کو بلند کرتا ہے۔ الغرض ایک حشرِ اصغر کا سا ساماں ہوتا ہے۔ اس کی نوازشیں اور اس کا لطف وکرم ہر آن اور ہر لحظہ تمام مخلوقات پر سایہ فگن رہتا ہے۔ ہر روز خدا کی قدرت کے کرشمے اور اس کی کاری گری اہلِ محبت کو مزید دیوانہ کر دیتی ہے۔ وہ اسے پانے کے لیے اس کی طلب اور چاہت میں بے قرار ہو جاتے ہیں۔

جس طرح ایک دنیا دار عاشق اپنے مجازی محبوب کی طلب اور چاہت میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے دیدار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار و بے تاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے عشاق اور صوفیا اپنے محبوبِ حقیقی کی طلب میں جنگلوں، وادیوں، پہاڑوں اور صحراؤں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اس کے جلوۂ حسن کو دیکھنے کے لیے بے تاب و بے قرار رہتے ہیں۔ بقول شاعر:

؎ تجھی کو جو یاں جلوہ فرمانہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا (میر درد)

وہ اپنے آپ کو دنیوی آلائشوں، کثافتوں اور خواہشوں کے غبار سے پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہزار ہا ریاضت ومشقت اور مراقبے کرتے ہیں۔ تصوف کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ذات ''کل'' ہے اور انسان ''جز'' ہے۔ جز ہمیشہ اپنے کل سے ملنے کے لیے اسی طرح بے قرار رہتا ہے جس طرح مچھلی پانی کے لیے تڑپتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے عاشق اللہ سے ملاقات اور اس کے دیدار کے لیے ہمیشہ بے قرار و بے تاب رہتے ہیں۔

؎ سرِ طور ہو، سرِ حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے — وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ کہیں سہی (پیر نصیر الدین نصیر)

شعر میں ''داغ داغ'' اور ''افق افق'' کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ شعر کا استفہامیہ انداز اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے جو انسان کو غور وفکر پر مائل کرتا ہے۔

شعر نمبر 7

سوزاں ہے کس کی یاد میں تائبؔ نفس نفس
فرقت میں کس کی، شعلہ نوا ہے اُفق اُفق

حل لغت

سوزاں (بے قرار، تڑپنا، جلنا)، نفس نفس (ہر سانس، ہر لحہ)، فرقت (جدائی، ہجر)، شعلہ نوا (آتش بیانی، آواز میں گرم جوشی)

مفہوم

تائبؔ ہر سانس خدا کی یاد میں جل رہی ہے اور اسی کے فراق میں پوری کائنات تڑپ رہی ہے۔

تشریح

حفیظ تائب اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو فنی نزاکت اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں داخلی سوز اور عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔

اس شعر میں شاعر ایک ایسے عاشق کی کیفیت بیان کرتا ہے جس کا سینہ عشقِ الٰہی کی آگ سے لبریز ہے۔ وہ آگ عاشق کے باطن کو لمحہ بہ لمحہ جلا کر کندن بناتی ہے۔ اس شعر میں جذبِ محبت کی وہ کیفیت بیان ہوئی ہے جو محض سوچ یا خیال نہیں بلکہ ایک مسلسل سوز ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر سانس کو رب کی یاد میں دہکا رہا ہے۔ افق افق پھیلی یہ شعلہ نوائی دراصل فرقت کی آگ ہے جو روح میں بیتابیاں جگاتی ہے۔ شاعر کی ہر سانس، ہر لفظ اور ہر نگاہ جدائی کی اسی آگ سے روشن ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر سوالیہ انداز میں خدا سے اپنی محبت بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ کس کی یاد میں ہر لمحہ میری سانسیں جل رہی ہیں۔ ظاہر ہے وہ خدا کی ذات ہے۔ میں ہر لمحہ خدا کی یاد میں مشغول رہتا ہوں۔ جس طرح ایک عاشق محبوب کی یاد میں بے قرار رہتا ہے، اسی طرح خدا کی یاد مجھے اس سے ملاقات کے لیے بے قرار رکھتی ہے۔ کس وقت میں خدا سے ملاقات کر سکوں گا اور کب مجھے اس کا دیدار نصیب ہوگا، میری ہر ہر سانس خدا کی یاد میں سوزاں ہے۔ شاعر نے خدا کی یاد کی شدت اور اس کے اثر کو ''سوزاں'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خدا دلوں میں جلوہ گر ہے اور انسان کی رگِ جاں سے بھی قریب تر ہے۔ وہ ہر سانس کے ساتھ موجود ہے اور اسے بے قرار رکھتا ہے۔ بقول شاعر:

ہر ایک سانس سے آواز آ رہی ہے تری　　مرا دھڑکتا ہوا دل پیام تیرا ہے

تشریح طلب شعر میں شاعر ایک آفاقی نوعیت کا سوال اٹھاتا ہے۔ وہ عشقِ الٰہی کی شدت اور فراقِ محبوب کی تپش بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آخر وہ کون ہے جس کی یاد میں سینہ جل رہا ہے؟ کس کی یاد نے ہر سانس کو سوز میں بدل دیا ہے؟ کس کی جدائی نے ہر نفس کو ایک انگارے کی صورت عطا کر دی ہے؟ یہاں ''نفس نفس'' سے مراد صرف انسانی سانسیں نہیں بلکہ پوری کائنات کے ہر ذرے کی کیفیت ہے۔ ہر شے کسی کی یاد میں جھلس رہی ہے۔ ہر وجود کسی کی جدائی کو محسوس کر رہا ہے۔ شاعر پوچھتا ہے کہ وہ کون ہے جس کی فرقت نے پوری کائنات کو شعلہ نوا بنا دیا ہے۔ ''شعلہ نوا'' ایک نہایت بلیغ علامت ہے۔ یہ صرف جلنے اور تڑپنے کی کیفیت نہیں بلکہ جدائی کی شدت اور الم کی حدت کا بیان ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان کے کنارے اور زمین کے گوشے جدائی کے شعلوں میں جل رہے ہوں۔ یہاں ''افق افق'' کا پھیلاؤ صرف جغرافیائی وسعت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ روحانی اور داخلی تڑپ کی گہرائی کا اظہار بھی ہے۔

شاعر کی نظر میں کائنات ایک زندہ وجود ہے جو اپنے رب کی جدائی میں بے قرار ہے۔ انسان اور کائنات دونوں کا اصل سکون صرف محبوبِ حقیقی کے قرب میں ہے۔ محبوبِ حقیقی کی جدائی ہر کیفیت، ہر احساس اور ہر صدا میں شعلہ بن کر گونج رہی ہے۔ بقول شاعر:

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ　　کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے (حیدر علی آتش)

یہ شعر محبتِ الٰہی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کا دل محبتِ الٰہی میں تڑپ رہا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ صرف اسی کا دل بے چین اور بے قرار نہیں بلکہ پوری کائنات اس جذبے میں شریک ہے۔ خدا سے جدائی کا یہ غم اور اس سے ملاقات کے لیے گرم جوشی کائنات کے ذرے ذرے میں پائی جاتی ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنے خالق و مالک سے محبت کرتی ہے۔ شاعر جب کائنات کی ہر شے میں خدا کے جلوے دیکھتا ہے اور ہر شے کو خدا کے لیے بے قرار دیکھتا ہے تو وہ خود انسان ہونے کے ناتے اپنے محبوبِ حقیقی کی یاد میں بے قرار ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی ہر سانس میں خدا کی یاد کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اسے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

تجھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں　　کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اسی کی جدائی میں شاعر کے جذبات اور احساسات اشعار کی صورت زبان پر نمودار ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں وہ سوز، تڑپ اور آتش بیانی ہے کہ ساری دنیا میں اس کی دھوم ہے۔ یہ سب خدا کی محبت کے باعث ہے۔

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے　　کچھ رنگِ بیاں حالیؔ سب سے جدا تیرا
(مولانا حالی)

افلاک میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی　　نالے مرے افلاک کا پیوند رہے ہیں (ساغر صدیقی)

شعر میں ''نفس نفس'' اور ''افق افق'' کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ سوزاں، فرقت اور شعلہ نوا کے الفاظ خدا کی محبت کی شدت کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ شعر کا استفہامیہ انداز اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے جو انسان کو غور و فکر پر مائل کرتا ہے۔

مشقی سوالات

سوال ۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) حفیظ تائب کی شاعری کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

جواب: حفیظ تائب کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں عشقِ الٰہی، عشقِ رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال و جمال کا بیان شامل ہیں۔ اکثر مضامین قرآن و حدیث سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔

(ب) حفیظ تائب کی وجہِ شہرت شاعری کی کون کون سی اصناف ہیں؟

جواب: حفیظ تائب کی وجہِ شہرت شاعری کی مشہور اصناف حمد اور نعت ہیں۔ جہاں ان کی نعت گوئی کے میدان میں خدمات بے مثال ہیں وہیں ان کے ہر مجموعے میں حمدیں بھی لازوال ہیں۔ شاملِ نصاب ''حمد'' بھی ایک اعلیٰ پائے کا کلام ہے جس میں لفظوں کی تکرار اس طرح کی گئی ہے کہ یہ تکرارِ لفظی حمد کی شان بن گئی ہے۔

(ج) حرف و فا افق افق مرقوم کرنے کا مطلب کیا ہے؟

جواب: اسی کی بدولت کائنات کا نظم و نسق چل رہا ہے۔ اس کے کرم، مہربانی اور رحمت سے ہر شے کو وہ نعمت ملتی ہے جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ستاروں کو ایندھن ملتا ہے۔ پھولوں کو رس ملتا ہے۔ انسان کو غذا ملتی ہے۔ ہر شے کی زندگی اور بقا کے لیے جو ضروری عناصر اور ماحول ہوتا ہے خدا کی رحمت سے اسے وہ ملتا رہتا ہے۔

(د) شانِ جلال اور رنگِ جمال سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: شانِ جلال سے مراد خدا کی وہ شان اور عظمت ہے جو اس کی صفتِ جلال یعنی رعب و ہیبت سے عیاں ہے۔ اس کی عمدہ مثال پہاڑ ہیں۔ ہر پہاڑ سے اللہ تعالیٰ کی شانِ جلال عیاں ہے۔ بلند و بالا پہاڑ اور پہاڑی سلسلے ایک ہیبت اور رعب و جلال کی علامت ہیں۔ انھیں دیکھ کر انسان کے خالق کی عظمت اور اس کے رعب و جلال کی دھاک دل پر بیٹھ جاتی ہے۔

رنگِ جمال سے مراد حسن و جمال اور خوب صورتی کا رنگ ہے۔ کائنات میں بکھرا حسن و جمال، رونقیں اور نظارے یہ سب خدا کی صفتِ جمال کا اظہار ہیں۔ خوب صورت رنگ برنگے پھول، بہتی ندیاں، گرتی آبشاریں، روشن ستارے، قوسِ قزح کے نظارے، برف سے ڈھکے بلند و بالا کہسار، جنت نظیر وادی و سبزہ زار، چہچہاتے پرندے، موسموں کی دل کشی، افق کی سرخی، چاند کی چاندنی الغرض پوری کائنات میں موجود حسن و جمال خدا کی اس صفت کی عکاسی کرتا ہے۔

(ہ) اس نظم کی ہیئت کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب: یہ نظم غزلیہ ہیئت میں ہے۔

سوال ۲۔ حوالوں کے ساتھ درج ذیل اشعار کی تشریح کریں:

کس کے لیے نجوم بکف ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کھلا ہے اُفق اُفق

کس کے لیے سرو و صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے ہمو و ضیا ہے اُفق اُفق

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

سوال ۳۔ طلبہ باری باری بلند آواز میں ایک ایک شعر درست تلفظ اور لب و لہجہ کے ساتھ پڑھیں اور ان اشعار میں موجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات پر تبصرہ کریں۔

سوال ۴۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) افق افق راہ نما ہے:
(الف) نظام (ب) دوام (ج) نام (د) جام

(ii) جبل جبل عیاں ہے:
(الف) جمال (ب) کمال (ج) جلال (د) استقلال

(iii) افق افق مرقوم:
(الف) حرف و معنی (ب) لفظ (ج) وفا (د) حرف وفا

(iv) اللہ کی محبت میں داغ داغ ہیں:
(الف) اہلِ عقیدت (ب) اہلِ محبت (ج) اہلِ ثروت (د) اہلِ شریعت

(v) شعلہ نوائی کا سبب ہے:
(الف) محبت (ب) وصال (ج) فرقت (د) دیدار

سوال ۵۔ لغت کی مدد سے درج ذیل الفاظ کے معانی تلاش کریں اور اعراب لگا کر درست تلفظ واضح کریں:

جواب:

الفاظ	اعراب	معانی
نجوم	نُجُوم	ستارے
شہود	شُہُود	شاہد کی جمع، حاضر ہونا، ظاہر ہونا
نفس	نَفْس	وجود، ہستی، انسان
مکتوم	مَکْتُوم	پوشیدہ، چھپا ہوا
فرقت	فُرْقَت	ہجر، جدائی
مرقوم	مَرْقُوم	لکھا ہوا
حشر	حَشْر	قیامت، روزِ حساب

سوال ۶۔ اصنافِ شعری (موضوع کے اعتبار سے):

حمد: جس نظم میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ربوبیت، یکتائی اور دیگر صفات کا بیان ہو۔

نعت: جس نظم میں سرکارِ دو عالم خاتم النبیین ﷺ کی شان و شوکت، اوصاف و افعال کا بیان ہو۔

منقبت: جس نظم میں اہلِ بیت، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اولیائے عظام، بزرگانِ دین یا کسی معروف شخصیت کے اوصاف بیان کیے جائیں۔

مناجات: جس نظم میں اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقت انگیز انداز میں التجائیں اور دعائیں کی جائیں۔

۶۔ اصنافِ شعری کی درج بالا وضاحت کی روشنی میں ان اصناف کی مثالیں تلاش کریں۔

حمد

کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے
دکھائی بھی جو نہ دے، نظر بھی جو آ رہا ہے، ، وہی خدا ہے

تلاش کر اس کو نہ بتوں میں، وہ ہے بدلتی ہوئی رتوں میں
جو دن کو رات اور رات کو دن بنا رہا ہے ، ، وہی خدا ہے
وہی ہے مشرق وہی ہے مغرب، سفر کریں سب اسی کی جانب
ہر آئینے میں جو عکس اپنا دکھا رہا ہے، ، وہی خدا ہے
کسی کو سوچوں نے کب سراہا، وہی ہوا جو خدا نے چاہا
جو اختیارِ بشر پہ پہرے بٹھا رہا ہے ، ، وہی خدا ہے
نظر بھی رکھے سماعتیں بھی، وہ جان لیتا ہے نیتیں بھی
جو خانۂ لاشعور میں جاگتا رہا ہے، ، وہی خدا ہے
کسی کو تاجِ وقار بخشے، کسی کو ذلت کے غار بخشے
جو سب کے ماتھے پہ مہرِ قدرت لگا رہا ہے ، وہی خدا ہے
سفید اس کا سیاہ اس کا، نفس نفس ہے گواہ اس کا
جو شعلۂ جاں جلا رہا ہے، بجھا رہا ہے، ، وہی خدا ہے

(مظفر وارثی)

نعت

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں جی رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اوّلیں کا اجالا تمھیں تو ہو
سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمھیں تو ہو
جلتے ہیں جبرائیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھیں تو ہو
جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نوردِ جادۂ اسریٰ تمھیں تو ہو
دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھیں تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاج دارِ یثرب و بطحا تمھیں تو ہو

(مولانا ظفر علی خاں)

منقبت

عائشہؓ میری ماں ، کوئی تجھ سا کہاں
تیری مدحت میں قرآن رطب اللساں
دل کا اندھا ہے وہ جو ہے منکر ترا
سورۂ نور ہے تیری تطہیر ماں
تیرا حجرہ ہوا روضہ محبوب کا
ہیں ملائک بھی آ کر مؤدب یہاں

کار زارِ بدر میں وہ آنچل ترا
بہر پرچم لیا تو ہوئے کامراں
علمِ قرآں، احادیث پر دسترس
نطق سے فیض و حکمت کے دریا رواں
آخرت میں ملے گا صلہ بالضرور
مدحتِ عائشہؓ غوریؔ کر تُو بیاں

(یامین غوریؔ)

مناجات

الٰہی تیری چوکھٹ پر بھکاری بن کے آیا ہوں
سراپا فقر ہوں عجز و ندامت ساتھ لایا ہوں
بھکاری وہ کہ جس کے پاس جھولی ہے نہ پیالہ ہے
بھکاری وہ جسے حرص و ہوس نے مار ڈالا ہے
متاعِ دین و دانش نفس کے ہاتھوں سے لٹوا کر
سکونِ قلب کی دولت ہوس کی بھینٹ چڑھوا کر
لٹا کر ساری پونجی غفلت و عصیاں کی دلدل میں
سہارا لینے آیا ہوں ترے کعبے کے آنچل میں
گناہوں کی لپٹ سے کائناتِ قلب افسردہ
ارادے مضمحل، ہمت شکستہ، حوصلے مردہ
ترے دربار میں لایا ہوں اب اپنی زبوں حالی
تری چوکھٹ کے لائق ہر عمل سے ہاتھ ہیں خالی ہے
یہ تیرا گھر ہے تیرے مہر کا دربار ہے مولا
سراپا نور ہے اک مہبطِ انوار ہے مولا
تری چوکھٹ کے جو آداب ہیں میں ان سے خالی ہوں
نہیں جس کو سلیقہ مانگنے کا وہ سوالی ہوں
زباں غرقِ ندامت دل کی ناقص ترجمانی پر
خدایا رحم میری اس زبانِ بے زبانی پر
یہ آنکھیں خشک ہیں یارب انھیں رونا نہیں آتا
تھکے داغ ہیں دل میں جنھیں دھونا نہیں آتا
الٰہی تیری چوکھٹ پر بھکاری بن کے آیا ہوں
سراپا فقر ہوں عجز و ندامت ساتھ لایا ہوں

(مفتی تقی عثمانی)

سرگرمیاں برائے طلبہ:

۱۔ حمدیہ کلام ترنم سے پڑھنے کے مقابلے میں حصہ لیں۔
۲۔ حمدیہ اشعار پر مبنی چارٹ بنائیں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

۱۔ طلبہ کو اردو شاعری میں حمد نگاری کی تاریخ اور روایت سے آگاہ کریں۔
۲۔ حفیظ تائب کی شاعرانہ خصوصیات اور انفرادیت کے بارے میں بتائیں۔

شاعر
سیّد نفیس الحسینی نفیسؔ
(1933-2008)

سبق ۲۰: نعت

شاعر کا تعارف

سیّد انور حسین، المعروف بہ سیّد نفیس الحسن الحسینی نفیس، سیّد القلم اور نفیس رقم کے نام سے بھی معروف تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں سولہ مرتبہ قرآن پاک کی کتابت کی۔ آپ کی جائے ولادت تحصیل ڈسکہ میں موضع گھوڑیالہ ہے اور آپ کا سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے حضرت خواجہ گیسو درازؒ تک پہنچتا ہے۔ آپ نے اپنے نواحی گاؤں بھوپال والا سے 1946ء میں مڈل، سٹی مسلم ہائی اسکول لائل پور (فیصل آباد) سے 1948ء میں میٹرک، گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے 1950 میں ایف۔ اے اور 1953ء میں اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔

سیّد انور حسین کا گھرانا فنِ خطاطی کا مرکز تھا اور آپ کو چھوٹی عمر ہی سے خطاطی کا شوق تھا۔ آپ کے والد صاحب جب خطاطی کرتے تو آپ ان کے دائیں جانب کھڑے ہو جاتے اور انھیں کتابت یا خطاطی کرتے دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ سکول کے ابتدائی دور میں آپ کی لکھائی ہم جماعت طلبہ سے بہت اچھی تھی اور وہ آپ سے اپنی کاپیوں پر اپنا نام لکھواتے تھے۔ اس حوالے سے آپ کا آبائی پیشہ خوش خطی تھا۔

اس ضمن میں آپ نے بذاتِ خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ دیوانی، خطِ ثلث، خطِ رقاع اور خطِ کوفی میں متعدد فن پاروں کے علاوہ کلامِ اقبال پر نستعلیقِ جلی میں بڑے دل کش انداز میں خطاطی کے فن پارے تخلیق کیے جو ایوانِ اقبالؒ میں آویزاں ہیں۔ آپ کو عجائب گھر لاہور اور خانہ کعبہ کے دروازے پر بھی خطاطی کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اسی بنا پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے آپ کے فن کے اعتراف میں 1986ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس کا اعزاز حاصل ہوا۔

سیّد نفیس الحسینی نفیسؔ کا میلانِ طبع اوائل عمری ہی سے شاعری کی طرف تھا۔ اس ضمن میں ان کے تین نعتیہ شعری مجموعے ''گلہائے نقش''، ''برگِ گل''، اور ''نفائس النبی ﷺ'' جن کی کتابت بھی آپ نے خود کی تھی، بڑے اہتمام سے شائع ہوئے۔ ان تینوں مجموعوں کا تمام تر کلام عشق و عقیدت کے جذبات سے لبریز ہے۔ ''برگِ گل'' میں حمد و نعت، ساقیِ کوثر، تجھ سا کوئی نہیں، یارسول اللہ صلی اللہ علیک، یادِ مدینہ، ارمغانِ مدینہ، انوارِ مدینہ، آرزوئے حسرت، صحنِ حرم، پیام آ ہی گیا اور میں تو اس قابل نہ تھا، جیسا کلام شامل ہے جو عشق و محبت کے وفورِ جذبات کا حامل ہے۔

نظم کا خلاصہ

خلاصہ

اے رسولِ امین ﷺ خاتم المرسلین ﷺ ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ جیسا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ براہیمی و ہاشمی لقب والے، آپ ﷺ عالی حسب و نسب والے، قبیلہ قریش کے سب سے معزز فرد ہیں۔ پہلے دنیا کی محفل سجائی گئی پھر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا ظہور ہوا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اولین و آخرین کے امام ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ اور قاب قوسین سے بھی آگے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی منزل ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ خدا کے قریب ہیں اور خدا آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے قریب ہے۔ کہکشائیں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے تاجِ رسالت کی روشنی ہیں۔ معراج کی رات دراصل آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی زلفِ تاباں کا استعارہ ہے۔ لیلۃ القدر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی منورجبین کا استعارہ ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی مدح و ثنا کماحقہٗ بیان کرنا میرے بس میں

نہیں، میرے دل کو حوصلہ نہیں پڑتا۔ آپ ﷺ کے خلفائے راشدین کی شان دنیا پر واضح ہے۔ آپ ﷺ کے یہ جانشین عدل وانصاف کے پیکر ہیں۔ اے دو جہانوں میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہستی، عاشقوں کے محبوب، میری جانِ حزیں آپ ﷺ کو تلاش کر رہی ہے۔ بلاشبہ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں۔

مرکزی خیال

دنیا میں کوئی آپ ﷺ کا ہمسر نہیں۔ خدا نے آپ ﷺ کی ذات میں تمام اوصافِ حمیدہ جمع فرما دیے۔ آپ ﷺ اوّلین وآخرین کے امام ہیں۔ آپ ﷺ کی رسائی عرش تک ہے۔ آپ ﷺ کی مکمل مدحت کسی کے بس میں نہیں۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

اے رسولِ امیؐ خاتم المرسلیںؐ، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
ہے عقیدہ یہ اپنا بہ صدق ویقیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حلِ لغت

رسولِ امی (دیانت دار رسول) خاتم المرسلیں (تمام نبیوں کی نبوت ختم کرنے والے مراد محمد ﷺ، آخری رسول)
عقیدہ (پختہ یقین) بہ صدق ویقین (سچائی اور یقین کے ساتھ)

مفہوم

اے اللہ کے رسول ﷺ آپ صادق وامین اور خاتم الانبیا ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم وادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام سے مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول ﷺ سے والہانہ عشق ومحبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر دل کی گہرائی سے آنحضور ﷺ سے عقیدت اور ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ وہ انتہائی ادب واحترام سے نبی کریم ﷺ کو ''رسولِ امیؐ'' اور ''خاتم المرسلیںؐ'' کہہ کر یاد کرتا ہے۔ ''رسولِ امیؐ'' وہ ہستی ہیں جو سچائی اور امانت کا کامل نمونہ ہیں جن پر دشمن بھی بھروسا کرتے تھے۔ ''خاتم المرسلیںؐ'' کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ شاعر یقینِ کامل سے اعلان کرتا ہے کہ آپ ﷺ جیسا نہ کوئی ہوا ہے اور نہ کوئی ہوسکتا ہے۔ یہ محض ایک جذباتی دعویٰ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا دنیا بھی اعتراف کرتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ پوری دنیا کو دیکھ لیا جائے، سب زمانوں کو چھان لیا جائے تب بھی

حضور اکرم ﷺ کی مثال نہیں مل سکتی۔ نبی کریم ﷺ کا مقام سب سے بلند اور سب سے جدا ہے۔ یہ وہ صدا ہے جو ہر سچے عاشقِ رسول ﷺ کے دل سے نکلتی اور پورے جہان میں گونجتی ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر حضور اکرم ﷺ کی مدحت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ ﷺ خدا کے صادق وامین رسول ہیں۔ آپ ﷺ نبوت سے پہلے بھی سچے اور امانت دار مشہور تھے۔ قول وقرار کو پورا کرنے والے تھے۔ لوگ اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھواتے تھے۔ تجارتی لین دین اور ذاتی معاملات میں آپ ﷺ کی امانت داری بے مثال تھی۔ خدا نے آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو آپ ﷺ نے دیانت داری سے خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کے اخلاق اور صدق وامانت کی گواہی دیتے تھے۔ نضر بن حارث جو قریش کے بڑے رئیس تھے وہ کہتے ہیں:

''محمدؐ ہمارے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ خدا کی قسم اوہ ہم میں سب سے سچے، شریف اور دیانت دار ہیں۔''

بقول ماہر القادری:

کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت — اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآں

شاعر نے آپ ﷺ کی دوسری صفت ''خاتم المرسلین'' بیان کی ہے۔ جس کا مطلب آخری رسول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں آئے گا۔ اس لیے آپ ﷺ کو خاتم المرسلین کہا جاتا ہے۔ یعنی آپ ﷺ پر نبوت ورسالت کا سلسلہ مہر بند ہو گیا۔ جس طرح کسی چیز کو مہر لگا کر سیل (بند) کر دیا جاتا ہے کہ اندر سے کوئی چیز باہر نہ نکلے اور باہر سے کوئی چیز اندر داخل نہ ہو، اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت کا سلسلہ مہر بند کر دیا۔ اب رہتی دنیا تک اس سلسلہ میں باہر سے کوئی نیا نبی اور رسول داخل نہیں ہوسکتا اور اس سلسلہ میں موجود کسی نبی ورسول کو باہر نکالا نہیں جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے نبیوں اور رسولوں کا جو سلسلہ شروع فرمایا تھا وہ محمد رسول اللہ پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم کر دیا: چناں چہ ارشاد فرمایا:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین

ترجمہ: محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں مگر ہاں وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ (سورہ احزاب:40)

اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ وحی کا سلسلہ آپ ﷺ کے بعد بند ہو گیا۔ اب آپ ﷺ ہی تمام انسانیت کے ہادی ومسیحا ہیں اور رہتی دنیا تک آپ ﷺ ہی رشد وہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

انا خاتم النبیین لانبی بعدی (حدیث)

''میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں''

اور بقول مولانا ظفر علی خاں:

ہوئی تکمیلِ دین تم سے کہ ختم المرسلیں تم ہو — رسالت ہے اگر انگشتری اس کے نگیں تم ہو

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ یہ میرا عقیدہ اور پختہ یقین ہے کہ آپ ﷺ جیسا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آپ ﷺ بطور انسان اور بطور نبی ورسول ہر لحاظ سے بے مثال ہستی ہیں۔ آپ ﷺ ہر اعتبار سے کامل، اکمل اور مکمل انسان ہیں۔ آپ ﷺ انسان تو ہیں مگر عظیم الشان ہیں۔ نبی اور رسول تو ہیں مگر امام الانبیا اور خاتم الرُّسل بھی ہیں۔ اسی

طرح آپ ﷺ بشر تو ہیں مگر خیر البشر ہیں۔ الغرض آپ جیسا کوئی نہیں ہے۔ بقول شاعر:

محمدؐ کا ہمسر جہاں میں نہیں ہے — زمیں میں نہیں، آسماں میں نہیں ہے
محمدؐ کو جو دی فضیلت خدا نے — وہ ہرگز کسی کی جہاں میں نہیں ہے

شعر میں ''تجھ سا کوئی نہیں'' کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ شعر میں زبردست روانی اور موسیقیت ہے۔ ''رسولِ ہاشمی'' اور ''خاتم المرسلیں'' کے القابات سے شعر کی معنویت بڑھ گئی ہے۔

شعر نمبر 2

اے براہیمی و ہاشمی خوش لقب، اے تُو عالی نسب، اے تُو والا حسب
دُودمانِ قریشی کے دُرِ ثمیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حل لغت

براہیمی (حضرت ابراہیم کی نسبت والے)، ہاشمی (ہاشم کی نسبت والے)، خوش لقب (اچھے لقب والے)، عالی نسب (باپ کی طرف سے اونچے خاندان والے)، والاحسب (ماں کی جانب سے بلند مرتبہ خاندان والے، شرف والے، عالی نسل)، دودمانِ قریشی (قبیلہ قریش)، دُرِ ثمیں (قیمتی موتی)

مفہوم

اے نبی آپ ﷺ خوب صورت براہیمی و ہاشمی لقب والے ہیں، آپ ﷺ عالی حسب و نسب والے خاندانِ قریش کے معزز فرد ہیں۔ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتم النبیین ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر کے پہلے مصرع میں شاعر نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے اعلیٰ خاندان اور شجرۂ نسب کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ رسول خاتم النبیین ﷺ کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جاتا ہے جس پر تمام سیرت نگار متفق ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، انھیں جدالانبیا بھی کہا جاتا ہے۔ اس نسبت سے شاعر نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو براہیمی لقب کہا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا ایک خوب صورت لقب ہاشمی بھی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا خاندان آپ کے پردادا ہاشم کی نسبت سے بنوہاشم کہلاتا ہے۔ اس نسبت سے آپ خاتم النبیین ﷺ کو ہاشمی بھی کہا جاتا ہے۔ ہاشم کا اصل نام تو عَمرو تھا۔ وہ بے حد سخی اور مہمان نواز تھے۔ قحط کے زمانے میں وہ ملک شام سے خشک روٹیاں منگوا کر حاجیوں کو بڑے بڑے پیالوں میں چُور کر کے کھلاتے تھے۔ اس وجہ سے لوگوں نے انھیں ہاشم (یعنی روٹیاں چور کر کے کھلانے والا سخی) کہنا شروع کر دیا۔

شاعر مزید کہتا ہے کہ اے نبی خاتم النبیین ﷺ! آپ خاتم النبیین ﷺ حسب و نسب کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ ہیں۔ حسب ماں کی جانب سے خاندان کو کہتے ہیں جب کہ نسب باپ کی جانب سے خاندان کو کہتے ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ عالی حسب اور عالی نسب ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے شجرۂ نسب میں حضرت عبداللہؓ سے آدم علیہ السلام تک آپ ﷺ کے سبھی والدین اعلیٰ اخلاق و اطوار کے مالک تھے۔ ان میں کوئی اخلاقی برائی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ سب

سخاوت، رحم دلی اور خدمتِ خلق میں بے مثل تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی والدہ کا نام حضرت آمنہؓ بنت وہب تھا۔ جن کا تعلق قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنو زہرہ سے تھا۔ اس طرح والد اور والدہ دونوں جانب سے آپ ﷺ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نسبتیں اعلیٰ ہیں۔ ایک دوسرے شعر میں سید نفیس الحسینی کہتے ہیں:

دستِ قدرت نے ایسا بنایا تجھے، جملہ اوصاف سے خود سجایا تجھے
اے ازل کے حسیں، اے ابد کے حسیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ قبیلہ قریش کے دُرِ ثمین (گوہرِ بے بہا) ہیں۔ قبیلہ قریش مکہ کا سب سے معزز قبیلہ تھا۔ قریش کے کئی معنی بیان کیے جاتے ہیں۔ قریش ''قرش'' سے ہے جس کے معنی سمندر کی بڑی مچھلی، بہادر لوگ، لوگوں کو جمع کرنے والے اور تجارت پیشہ لوگ وغیرہ ہیں۔ قریش عرب کا مشہور، طاقت ور قبیلہ تھا جو تجارت کے پیشے سے منسلک تھا۔ قبیلہ قریش کی بہت سی شاخیں تھیں جن میں سے بنوہاشم سب سے زیادہ معزز تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا تعلق قبیلہ قریش کی اسی شاخ (بنوہاشم) سے تھا۔ خانہ کعبہ کی تولیت (نگرانی، سربراہی) انھی کے سپرد تھی۔ اس لحاظ سے انھیں معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ قبیلہ قریش کے گوہرِ بے بہا یعنی موتیوں میں بھی سب سے اعلیٰ موتی آپ خاتم النبیین ﷺ ہیں۔ رسول خاتم النبیین ﷺ کا فرمان ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد سے اسماعیل کو چن لیا اور بنی اسماعیل سے بنو کنانہ کو منتخب کیا پھر بنو کنانہ سے قریش کو، قریش سے بنوہاشم کو اور بنوہاشم سے مجھے منتخب کیا۔'' (ترمذی)

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اے نبی خاتم النبیین ﷺ آپ جیسا کوئی نہیں ہے۔ خدا نے آپ خاتم النبیین ﷺ کی ذات کو تمام اعلیٰ خوبیوں سے آراستہ کیا۔ آپ حسن و جمال میں بے مثال اور خاندانی وجاہت و شرافت میں باکمال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ خاتم النبیین ﷺ میں تمام ظاہری و باطنی اعلیٰ اوصاف رکھ دیے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا حسب و نسب انتہائی اعلیٰ اور افضل ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ میں فصاحت و بلاغت، سخاوت و شجاعت، متانت و وقار، امانت و دیانت جیسی خوبیاں بدرجۂ اتم تھیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ انتہائی ملنسار، محبت والفت اور لطف و کرم کرنے والے، عفو و درگزر کرنے والے، رحم دل اور اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔ الغرض آپ خاتم النبیین ﷺ انسانوں میں سب سے بہترین انسان ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ایسے انسان ہیں کہ جن کی ذات اور صفات میں مُصوّرِ حقیقی نے تمام جمال و کمال جمع کر دیے۔ جس کی مثال نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے۔ شاعرِ رسول حضرت حسانؓ آپ خاتم النبیین ﷺ کی مدحت میں فرماتے ہیں:

''آپ خاتم النبیین ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے دیکھا ہی نہیں اور آپ خاتم النبیین ﷺ سے زیادہ جمیل کسی عورت نے جنا ہی نہیں۔
آپ خاتم النبیین ﷺ ہر عیب سے پاک و صاف پیدا کیے گئے، گویا آپ خاتم النبیین ﷺ نے خود چاہا۔'' بقول شاعر:

وہ کمالِ حسنِ حضورؐ ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں — یہی پھول خار سے دور ہے، یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

شعر میں ''براہیمی، ہاشمی'' اور ''لقب، نسب، حسب'' کے الفاظ میں ایک خاص صوتی آہنگ اور موسیقیت ہے۔ مصرع ثانی میں ''تجھ سا کوئی نہیں'' کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت نمونہ ہے۔

شعر نمبر 3

بزم کونین پہلے سجائی گئی، پھر تری ذات منظر پہ لائی گئی
سیدالاولیں، سیدالآخریں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حل لغت

بزم کونین (دنیا کی محفل)، سیدالاولیں (اولین کے سردار)، سیدالآخریں (آخرین کے سردار)

مفہوم

پہلے دنیا کی محفل سجائی گئی اس کے بعد آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا ظہور ہوا۔ آپ ﷺ اولین و آخرین کے امام ہیں، آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتمُ النّبیین ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر رسول خاتمُ النّبیین ﷺ کے ظہور کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو بنانے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا نور تخلیق فرمایا۔ لیکن دنیا میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا ظہور سب پیغمبروں کے آخر میں ہوا۔ جس وقت دنیا تاریخ کے دور میں داخل ہوگئی اور دنیا کی یہ محفل سج گئی تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا اس دنیا میں ظہور ہوا۔ جس طرح کسی جلسہ یا محفل میں معزز اور خاص ہستی سب سے آخر میں تشریف لاتی ہے کہ جب محفل جم جائے اور مجمع وسیع ہو جائے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی ذات بھی سب پیغمبروں اور رسولوں کے آخر میں تشریف لائی۔ شاعر کہتا ہے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ وجہ تخلیقِ کائنات ہیں، کائنات کی ہر چیز آپ ﷺ کی خاطر بنائی گئی۔ ہر شے کو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی کے دم سے ثبات ہے۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کو پیدا نہ فرماتا۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:

"میرے پاس جبرائیلؑ امین حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے محمد ﷺ! اگر آپ نہ ہوتے تو جنت و دوزخ نہ بنائی جاتیں"۔ (دیلمی)

اور بقول مولانا ظفر علی خاں:

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا — سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمھیؐ تو ہو

لیکن اس سب کے باوجود دنیا میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا ظہور سب رسولوں اور پیغمبروں کے آخر میں ہوا۔ بقول پروفیسر کرم حیدری:

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے، نقشِ روئے محمدؐ بنایا گیا — پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی، بزمِ کون و مکاں کو سجایا گیا

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اولین کے بھی امام ہیں اور آخرین کے بھی امام ہیں۔ یعنی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ پہلے لوگوں کے لیے بھی رشد و ہدایت کے امام اور رہبر ہیں اور اپنے بعد قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے بھی رشد و ہدایت کے امام و رہبر ہیں۔ ہر نبی اور رسول نے اپنی امت کو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی آمد کی بشارت دی اور آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا۔ ہر آسمانی

کتاب اور صحیفے میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو انسانیت کا مسیحا کہا گیا اور آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی آمد کی نوید سنائی گئی۔ معراج کی شب مسجد اقصیٰ میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے تمام انبیا و رسل کی امامت کرائی۔ اب قیامت تک کے انسانوں کے لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی رہبر و رہنما اور مسیحا ہیں۔ آپ ﷺ ہی انسانیت کی ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ آپ ﷺ ہی کی اطاعت و فرماں برداری میں انسانیت کی نجات ہے۔ بقول شاعر:

دونوں عالم میں تجھے مقصود گر آرام ہے — اس کا دامن تھام لے جس کا محمدؐ نام ہے

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بطور انسان اور بطور نبی و رسول ہر لحاظ سے بے مثال ہستی ہیں۔ آپ ﷺ ہر اعتبار سے کامل، اکمل اور مکمل انسان ہیں۔ آپ ﷺ انسان تو ہیں مگر عظیم الشان ہیں۔ نبی اور رسول تو ہیں مگر امام الانبیا اور خاتم الرُّسل بھی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ بشر تو ہیں مگر خیر البشر ہیں۔ الغرض آپ خاتمُ النّبیین ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں "سجائی گئی" اور "لائی گئی" کے الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ جس سے شعر میں ترنم اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ مصرع ثانی میں "سیدالاولیں" اور "سیدالآخریں" کے متضاد الفاظ سے ایک خاص حسن اور معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ صنعتِ تضاد ہے۔ اسی طرح "تجھ سا کوئی نہیں" کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ شعر میں زبردست روانی اور موسیقیت ہے۔ "رسولِ امیں" اور "خاتم المرسلیں" کے القابات سے شعر کی معنویت بڑھ گئی ہے۔

شعر نمبر 4

سِدرَۃُ المُنتہیٰ رہ گزر میں تری، "قاب قوسین" گرد سفر میں تری
تو ہے حق کے قریں، حق ہے تیرے قریں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حل لغت

سِدرَۃُ المُنتہیٰ (ساتویں آسمان پر ایک مقام کا نام) رہ گزر (راستہ) قاب قوسین (دو کمانوں یا دو ہاتھ کے برابر فاصلہ، مراد بہت نزدیک) گردِ سفر (سفر کا غبار، سفر کی دھول) حق کے قریں (خدا کے قریب)

مفہوم

سِدرَۃُ المُنتہیٰ آپ ﷺ کی گزرگاہ ہے۔ قاب قوسین آپ ﷺ کے راستے کا غبار ہے۔ آپ ﷺ خدا کے قریب اور خدا آپ ﷺ کے قریب ہے۔ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتمُ النّبیین ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی عظمت و بڑائی بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی رسائی عالمِ بالا تک ہے۔ یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی منزل نہیں بلکہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی گزرگاہ ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی منزل اس سے بھی آگے عرشِ بریں تک ہے۔ سِدرَۃُ المُنتہیٰ ساتویں آسمان پر ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کے مطابق وہاں ایک بیری کا درخت ہے۔ اس مقام سے آگے

عالمِ بالا ہے جہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ وہاں نورِ الٰہی کی تجلیات اس قدر ہیں کہ جبریل امین کے بھی پَر جلتے ہیں۔ چناں چہ شبِ معراج، جبریل امین سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر رک گئے اور فرمایا کہ اس سے آگے میرے پَر جلتے ہیں۔ بقول شاعر:

پہنچ کے سدرہ پہ روح الامین کہنے لگے — یہاں سے آگے کا رستہ حضور جانتے ہیں (سرور حسین نقشبندی)

چناں چہ آگے کی منزلیں آپ ﷺ نے خود طے کیں۔ قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ولقد راہ نزلۃ اخریٰ○ عندسدرۃ المنتہیٰ○

ترجمہ: **انھوں نے وہ جلوہ دوبارہ دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔** (سورہ نجم:13,14)

عالمِ بالا میں آپ خاتم النبیین ﷺ کہاں تک تشریف لے گئے یہ آپ خاتم النبیین ﷺ اور آپ خاتم النبیین ﷺ کا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر خدا نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو اپنے دیدار کی نعمت سے نوازا۔ خدا نے اپنے لطف و رحمت سے آپ خاتم النبیین ﷺ کو اپنے قریب کیا یہاں تک کہ دو کمانوں یا دو ہاتھ کے برابر فاصلہ رہ گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثم دنا فتدلیٰ○ فکان قاب قوسین او ادنیٰ○ (سورہ نجم:8,9)

ترجمہ: **وہ قریب ہوا اور زیادہ قریب ہوا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔**

قاب قوسین (دو کمانوں کے برابر فاصلہ) پر بات ختم ہو جاتی تو قرب متعین ہو جاتا لیکن خدا نے اَوْ اَدْنیٰ (یا اس سے بھی کم فاصلہ) فرمایا کہ قرب کی حد بھی مقرر نہ ہو۔ چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ قاب قوسین تو آپ خاتم النبیین ﷺ کے سفرِ معراج کے راستے کا غبار ہے آپ خاتم النبیین ﷺ کو اس سے بھی آگے خدا کا قرب نصیب ہوا۔ بقول شاعر لکھنوی:

وہ اس ادا سے گئے تا بہ منزلِ معراج — کہ ہر کمال کو سکتہ ہے اس کمال کے بعد

اور بقول سرور حسین نقشبندی:

حدودِ طائرِ سدرہ حضور جانتے ہیں — کہاں ہے عرشِ معلّیٰ حضور جانتے ہیں

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرع "تو ہے حق کے قریں، حق ہے تیرے قریں" کے الفاظ قربتِ الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی خدا آپ ﷺ کے قریب ہوا اور آپ ﷺ خدا کے قریب ہوئے۔ یہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی عظمت و شان ہے۔ یقیناً یہ بڑے فضل اور اعزاز کی بات ہے جو آپ خاتم النبیین ﷺ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ بقول شاعر:

خدا کے قرب میں جانا حضور جانتے ہیں — وصالِ رب کا ٹھکانہ حضور جانتے ہیں

(فریدی صدیقی مصباحی)

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بطور انسان اور بطور نبی و رسول ہر لحاظ سے بے مثال ہستی ہیں۔ آپ ﷺ ہر اعتبار سے کامل، اکمل اور مکمل انسان ہیں۔ آپ ﷺ انسان تو ہیں مگر عظیم الشان ہیں۔ نبی اور رسول تو ہیں مگر امام الانبیا اور خاتم الرسل بھی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ بشر تو ہیں مگر خیر البشر ہیں۔ الغرض آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں "رہ گزر میں تری" اور "گردِ سفر میں تری" کے الفاظ ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔ جس سے شعر میں ترنم اور موسیقیت پیدا ہو گئی ہے۔ مصرع ثانی میں "تو ہے حق کے قریں، حق تیرے قریں" کے الفاظ میں صنعتِ تکرار کے ساتھ ساتھ لفظوں کی ترتیب اُلٹنے سے ایک خاص لفظی اور معنوی حسن پیدا ہو گیا ہے۔ جس سے خدا اور رسول خاتم النبیین ﷺ کی قربت واضح ہوتی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ خدا کے اتنے قریب ہیں کہ آپ کے بغیر کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور خدا کو بھی آپ خاتم النبیین ﷺ کے بغیر کسی کا ایمان قبول نہیں۔

شعر نمبر 5

کہکشاں ضو ترے سرمدی تاج کی، زلفِ تاباں حسیں رات معراج کی
"لیلۃ القدر" تیری منور جبیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حل لغت

کہکشاں (آسمان پر ستاروں کا سفید راستہ)، ضو (روشنی)، سرمدی تاج (دائمی تاج)، زلفِ تاباں (چمک دار زلف)، معراج (رسول ﷺ کا مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کا سفر)، لیلۃ القدر (ماہِ رمضان کی ایک بابرکت رات)، منور جبیں (روشن پیشانی)

مفہوم

کہکشاں دراصل آپ خاتم النبیین ﷺ کے ابدی تاج کی روشنی ہے، آپ خاتم النبیین ﷺ کی زلف معراج کی حسین رات کا استعارہ ہے۔ لیلۃ القدر کی بابرکت رات آپ خاتم النبیین ﷺ کی روشن جبین ہے۔ اے نبی خاتم النبیین ﷺ آپ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتم النبیین ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کو مختلف تشبیہات کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ آسمان پر کہکشاؤں کی سفید روشنی دراصل آپ خاتم النبیین ﷺ کے تاجِ رسالت کی روشنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی رسالت تمام جہانوں اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ باقی جتنے بھی انبیا و رسُل تشریف لائے وہ سب خاص زمانے اور خاص علاقے کے لیے تھے۔ لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ کی رسالت دائمی اور عالمی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی نبوت و رسالت کی روشنی سے تمام جہان منور ہے۔ جس طرح کہکشاں میں تمام نظامِ شمسی سمایا ہوا ہے اسی طرح آپ خاتم النبیین ﷺ کی نبوت تمام دنیا کے لیے ہے۔ بقول شاعر:

نازاں ہے جس پہ حسن، وہ حسنِ رسول ہے — یہ کہکشاں تو آپؐ کے قدموں کی دھول ہے (کوثر نیازی)

اور بقول حفیظ تائب:

خوش بو ہے دو عالم میں تری اے گلِ چیدہ — کس مُنھ سے بیاں ہوں ترے اوصافِ حمیدہ
تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں — دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ

شاعر مزید کہتا ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی چمک دار زلف دراصل معراج کی حسین رات کا استعارہ (علامت) ہے۔ شبِ معراج خدا نے رسول خاتم النبیین ﷺ کو آسمانوں کی سیر کروائی۔ یہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ لیلۃ القدر دراصل آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی روشن جبین کا استعارہ ہے۔ لیلۃ القدر رمضان کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے۔ یہ ایک بابرکت رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں اور فرشتے روح الامین کے ہمراہ خدا کے حکم سے ہر معاملے میں فیصلے اور تقدیر کا قلم دان لے کر اُترتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اے نبی خاتمُ النّبیّٖن ﷺ آپ ﷺ کی روشن پیشانی دراصل لیلۃ القدر کی مانند بابرکت ہے۔ آپ ﷺ کی پیشانی کشادہ، روشن اور چمک دار تھی۔ جس پر ہمہ وقت خوشی واطمینان کی کیفیت آشکار رہتی تھی۔ جو بھی آپ ﷺ کی پیشانی پر نظر ڈالتا تو پیشانی کی چمک دمک اور تابانی سے مسرور ہو جاتا اور اس کا دل سکون اور اطمینان سے بھر جاتا۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی پیشانی پر کبھی اکتاہٹ اور بیزاری کی کیفیت نہیں دیکھی گئی۔ آپ ﷺ کی جبینِ اقدس سے نور کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ حضرت حسانؓ آپ ﷺ کی پیشانی کی تعریف میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: **"رات میں آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی پیشانی ظاہر ہوتی تو وہ تاریکی میں روشن چراغ کی مانند چمکتی"** (شرح الزرقانی)

بقول شاعر:

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا　　اس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام　　(احمد رضا خاں)

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اے نبی خاتمُ النّبیّٖن ﷺ آپ جیسا کوئی نہیں ہے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ بطور انسان اور بطور نبی و رسول ہر لحاظ سے بے مثال ہستی ہیں۔ آپ ﷺ ہر اعتبار سے کامل، اکمل اور مکمل انسان ہیں۔ آپ ﷺ انسان تو ہیں مگر عظیم الشان ہیں۔ نبی اور رسول تو ہیں مگر امام الانبیا اور خاتم الرُّسل بھی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ بشر تو ہیں مگر خیر البشر ہیں۔ الغرض آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

شعر میں خوب صورت تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے رسول خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی عظمت اور شان و شوکت کو واضح کیا گیا ہے۔ "سرمدی تاج" کا استعارہ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی نبوت و رسالت کی ابدیت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ آپ کی زلفِ چمک دار کو "معراج کی حسین رات" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسی طرح آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی منور جبین کے لیے "لیلۃ القدر" کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ مصرعِ اولیٰ میں تاج اور معراج، ہم قافیہ ہیں جس سے شعر میں روانی اور ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ "تجھ سا کوئی نہیں" کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔

شعر نمبر 6

مصطفیٰ مجتبیٰ، تیری مدح و ثنا، میرے بس میں نہیں، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں، لب کو یارا نہیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حل لغت

مصطفیٰ (چُنا ہوا، منتخب، منظورِ نظر، حضرت محمد ﷺ کا لقب)، مجتبیٰ (برگزیدہ، پسندیدہ، حضرت محمد ﷺ کا لقب)، مدح و ثنا (تعریف و توصیف)، بس میں نہیں (اختیار میں نہیں)، دسترس (رسائی، پہنچ)، لب (ہونٹ)، ہمت (طاقت) یارا (ہمت)

مفہوم

اے نبی خاتمُ النّبیّٖن ﷺ میں آپ کی تعریف و توصیف کا مکمل حق ادا نہیں کر سکتا۔ میرے دل کو ہمت نہیں ہوتی اور میرے ہونٹوں میں ایسی طاقت نہیں، کیوں کہ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ جیسی ہستی دنیا میں کوئی نہیں۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتمُ النّبیّٖن ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر کے پہلے مصرع میں شاعر نے نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے دو صفاتی ناموں کا ذکر کیا ہے۔ مصطفیٰ اور مجتبیٰ۔ جن کا مطلب ہے چُنا ہوا، منتخب، برگزیدہ اور مقبولِ نظر وغیرہ۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ اے نبی خاتمُ النّبیّٖن ﷺ آپ ﷺ کی حمد و ثنا اور تعریف و توصیف کا حق میں ادا نہیں کر سکتا۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے اوصاف اور آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی صفات کو کماحقہٗ بیان کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی ذات اور صفات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ خدا کے منتخب اور برگزیدہ رسول ہیں۔ خدا کے مقبولِ نظر ہیں۔ آپ ﷺ کی شان کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ کی ذات و صفات تک کسی انسان یا فرشتے کی رسائی نہیں۔ کسی کی مکمل تعریف بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ذات اور صفات کے متعلق مکمل علم ہو۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ ایسی ہستی ہیں جن کی شان ہر چیز سے بلند ہے۔ آپ ﷺ محبوبِ خدا ہیں، آپ خاتم الانبیا ہیں۔ آپ ﷺ عرب و عجم کے سردار ہیں۔ آپ ﷺ ازل و ابد کے حسین ہیں۔ آپ ﷺ اخلاق و کردار میں باکمال ہیں۔ آپ ﷺ حسن و خوبی میں بے مثال ہیں۔ آپ ﷺ وجہِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ کوئی کیسے آپ ﷺ کی شخصیت، آپ ﷺ کے سراپا اور آپ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا احاطہ کر سکتا ہے۔ یقیناً یہ کسی کے بس میں نہیں ہے۔ بقول شاعر:

بھلے ممکن ہو دنیا میں قدم زد آسماں کرنا　　مگر ممکن نہیں اوصافِ احمدؐ کو بیاں کرنا　　(یامین غوری)

آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ اتنے حسین و جمیل اور آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ مجھ جیسا ناچیز کیسے آپ ﷺ کا سراپا مکمل طور پر بیان کر سکتا ہے۔ ایسا کوئی نہیں ہے جسے آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی مانند کہہ سکوں۔ شاعر و ادیب کسی کا حسن و جمال اور سراپا بیان کرنے کے لیے عموماً تشبیہ اور استعارہ کا سہارا لیتے ہیں۔ کسی کی خوب صورتی بیان کرنے کے لیے پھول یا چاند کی مثال دی جاتی ہے۔ سخاوت اور رحم دلی بیان کرنے کے لیے سمندر، بادل اور دریا کی مثال دی جاتی ہے۔ یا کسی انسان کی شخصیت بیان کرنے کے لیے کسی دوسرے مشہور اور بڑے انسان کی مثال دی جاتی ہے۔ لیکن نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کا مقام و مرتبہ کائنات میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ چناں چہ شاعر اپنی بے بسی کا اظہار اور اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ ﷺ کی مدح و ثنا میرے بس میں نہیں ہے، صرف بس میں ہی نہیں بلکہ میری دسترس میں بھی نہیں ہے۔

ایک اور شعر میں سید نفیس الحسینی کہتے ہیں:

کوئی بتلائے کیسے سراپا لکھوں، کوئی ہے! وہ کہ میں جس کو تجھ سا کہوں
توبہ توبہ! نہیں کوئی تجھ سا نہیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی ہستی اتنی عظیم اور بلند ہے کہ میرے دل کو ہمت نہیں ہوتی، میرے لبوں کو حوصلہ نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ کے لیے کچھ کہوں۔ میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ الفاظ لبوں پر آ کر رک جاتے ہیں کہ معلوم نہیں یہ لفظ، یہ جملے آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی شایانِ شان بھی ہیں یا نہیں۔ میرا دل لرز اٹھتا ہے کہ میرے الفاظ سے کہیں آپ ﷺ کی بے ادبی نہ ہو جائے۔ میرے حقیر سے لفظ آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اتنی بلند ہستی کے سامنے میں حقیر سا انسان کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ سمندر کے سامنے قطرہ بے معنی، بے وقعت اور بے حیثیت ہوتا ہے۔ ایک قطرہ بھلا سمندر کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے؟ بقول یامین غوری:

کہاں میری ہستی؟ کہاں نعتِ احمدؐ؟ میں قطرہ ذرا سا حضورؐ اِک سمندر

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔ کائنات میں کوئی ایسا نہیں جسے آپ ﷺ جیسا کہوں یا جسے آپ ﷺ کی مثال کہوں۔ ایسا خیال بھی محال ہے۔ ہر مثال اور ہر تشبیہ آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی آپ ﷺ جیسا نہیں ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہر اعتبار سے کامل، اکمل اور مکمل ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بطور انسان اور بطور نبی و رسول ہر لحاظ سے بے مثال ہستی ہیں۔ آپ ﷺ انسان تو ہیں مگر عظیم الشان ہیں۔ نبی اور رسول تو ہیں مگر امام الانبیا اور خاتم الرُّسل بھی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ بشر تو ہیں مگر خیر البشر ہیں۔ الغرض آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔ بقول شاعر:

کوئی مثال نہیں تھی، کوئی مثال نہیں ترى مثال سے پہلے، تری مثال کے بعد (شاعر لکھنوی)

اور بقول مفتی لطف بدایونی:

رخِ مصطفیٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب اور ایسا آئینہ نہ کسی کی بزمِ خیال میں، نہ دکانِ آئینہ ساز میں

ایک اور شاعر کہتے ہیں:

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

شعر میں بلا کی روانی اور سلاست موجود ہے۔ ''مصطفیٰ مجتبیٰ''، ''مدح و ثنا'' اور ''بس میں نہیں، دسترس میں نہیں'' کے الفاظ میں صوتی آہنگ باکمال ہے۔ ''تجھ سا کوئی نہیں'' کی تکرار نے شعر کے حسن کو مزید بڑھا دیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔

شعر نمبر 7

چار یاروں کی شانِ جلی ہے بھلی، ہیں یہ صدیقؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و علیؓ
شاہدِ عدل ہیں یہ ترے جانشیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حل لغت

یار (دوست)، شانِ جلی (نمایاں شان)، بھلی (اچھی، خوب صورت)، شاہدِ عدل (عدل و انصاف کے گواہ، عدل و انصاف کے پیکر)، جانشیں (نائب، خلیفہ)

مفہوم

اے نبی خاتم النبیین ﷺ آپ کے چاروں دوستوں کی شان و شوکت نمایاں ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے یہ خلفائے راشدین عدل و انصاف کے پیکر ہیں۔ بلاشبہ آپ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتم النبیین ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے اصحاب خلفائے راشدین کی عظمت بیان کرتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے آپ خاتم النبیین ﷺ کے چاروں خلفائے راشدین کی شان پوری دنیا میں نمایاں اور نہایت بھلی ہے۔ ان کا نام اور ان کا کام پوری دنیا میں روشن ہے۔ یہ وہ ہیں جو پہلے پہل ایمان لانے والے ہیں۔ سفر و حضر میں آپ خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ رہے۔ انھوں نے دین کی خاطر سختیاں جھیلیں اور مشقتیں برداشت کیں۔ پیٹ پر پتھر باندھے۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔ اپنا سب کچھ آپ خاتم النبیین ﷺ پر اور دینِ خدا پر لُٹا دیا۔ شاعر نے آپ خاتم النبیین ﷺ کے چار

اصحاب حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کا ذکر کیا ہے۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ اولین ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ ابتدا سے آخر تک آپ نبی خاتم النبیین ﷺ کی صحبت میں رہے۔ ہجرت کے وقت نبی خاتم النبیین ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کو اپنے ہمراہ لے کر گئے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ خاتم النبیین ﷺ نے اپنا سارا مال و متاع نبی خاتم النبیین ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ جب آپ خاتم النبیین ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے؟ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ گھر والوں کے لیے خدا اور رسول ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ کا نکاح بھی رسول خاتم النبیین ﷺ سے کروایا۔ رسول خاتم النبیین ﷺ کے وصال کے بعد جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو آپؓ نے بہت ہی فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی۔ وفات کے وقت جو لباس پہنا ہوا تھا اسی میں آپؓ کو دفن کیا گیا۔ آپؓ کی قبر نبی خاتم النبیین ﷺ کی قبر مبارک کے ساتھ بنی۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ اسلام کے سب سے بہادر اور جری سپاہی تھے۔ ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو تقویت ملی۔ انھوں نے اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کا نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے نکاح کروایا۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے انصاف پسند اور عادل حکمران مشہور ہو گئے اور عدلِ فاروقی ضرب المثل بن گیا۔ آپؓ کے زمانے میں کثیر تعداد میں فتوحات ہوئیں۔ قیصر و کسریٰ کی وسیع سلطنتیں اسلامی ریاست میں داخل ہو گئیں۔ ایران، عراق، مصر، شام اور بیت المقدس آپؓ کے دورِ حکومت میں فتح ہوئے۔ 22 لاکھ مربع میل پر آپؓ کی حکمرانی قائم ہو گئی اور اسلام تمام دنیا میں پھیل گیا۔ مؤرخین نے یہاں تک کہا ''اگر اسلام کو ایک عمر اور مل جاتا تو آج دنیا میں کوئی اور مذہب نہ ہوتا۔'' آپؓ نے نظامِ حکومت میں بہت سی اصلاحات کیں۔ ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا، پولیس کا محکمہ قائم کیا، سرکاری افسروں اور گورنروں کے احتساب کے لیے سخت قوانین بنائے، باقاعدہ فوج اور فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ سڑکیں، سرائے اور چوکیاں بنوائیں۔ زراعت کی ترقی کے لیے نہریں کھدوائیں۔ بیت المال کو مستحکم کیا۔ الغرض ملکی انتظام میں آپؓ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وفات کے بعد آپؓ کی قبر بھی نبی خاتم النبیین ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قبر کے ساتھ بنی۔

خلیفہ سوم حضرت عثمانِ غنیؓ انتہائی نرم طبیعت اور باحیا شخصیت کے مالک تھے۔ عرب کے دولت مند لوگوں میں آپؓ کا شمار ہوتا تھا۔ نبی خاتم النبیین ﷺ کی دو صاحبزادیاں (پہلے رقیہ، پھر ان کی وفات کے بعد اُم کلثوم) آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں یکے بعد دیگرے آئی تھیں۔ اسی نسبت سے آپؓ کو ذُوالنُّورَین یعنی دو نور والا بھی کہا جاتا ہے۔ اپنی سخاوت اور دریا دلی کی وجہ سے غنیؓ مشہور ہوئے۔ مدینہ میں جب مہاجرین کو پانی کی اشد ضرورت تھی تب آپؓ نے پانی کا کنواں خرید کر لوگوں کے لیے وقف کر دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے آخری سالوں میں کچھ ناخوش گوار واقعات ہوئے اور باغیوں نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ بچپن ہی میں ایمان لے آئے تھے۔ ہجرت کے وقت نبی خاتم النبیین ﷺ اپنے بستر پر آپؓ ہی کو چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے۔ آپؓ نے تمام عمر نبی خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ گزاری۔ کسی بھی جنگ میں نبی خاتم النبیین ﷺ کو تنہا نہیں ہونے دیا۔ جنگوں میں آپؓ کا کردار سب سے نمایاں ہوتا تھا۔ آپؓ کو فاتح خیبر کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ نبی خاتم النبیین ﷺ کی سب سے پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی آپؓ سے ہوئی۔ آپؓ عبادت و ریاضت، سخاوت اور شجاعت میں مثالی شخصیت تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو اِن کے اصحاب ہیں وہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں بہت نرم دل ہیں۔ تم اُنھیں کثرت سے رکوع کرتے ہوئے اور سجود کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔ وہ صرف اللہ کی رضا اور فضل کے طالب ہیں۔ ان کی نشانی، اُن

کے چہروں پر سجدوں کے اثرات (بصورت نور) نمایاں ہیں۔ اُن کے یہ اوصاف تورات میں بھی مذکور ہیں۔ (سورہ فتح:29)

دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے یہ اصحاب آپؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ آپؐ کے یہ جانشین آپ ﷺ ہی کی طرح عدل و انصاف کے پیکر تھے۔ انھوں نے دنیا کو حکمرانی کے اصول دیے۔ اخلاق و کردار میں یہ مثالی حکمران تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کہتے ہیں:

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی ﷺ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

بلاشبہ آپ ﷺ کے یہ اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جو ہر مسلمان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے اسلام کے لیے اپنا تن من دھن قربان کر دیا تھا۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ کے سلام آئے۔ جنھیں دنیا ہی میں جنت کی بشارتیں ملیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (سورہ حدید:10)

ترجمہ: ان سب کے لیے اللہ (جنت کا) خوب صورت وعدہ فرما چکا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

ترجمہ: اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ سب اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کر رکھی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ (سورہ توبہ:100)

آخر میں شاعر کہتا ہے اے نبی خاتمُ النّبیین ﷺ آپ جیسا کوئی نہیں ہے۔ شعر میں شاعر نے کمال مہارت سے چاروں خلفائے راشدین کے نام موتی کی طرح پرو دیے ہیں۔ مصرع اولیٰ میں ''جلی، بھلی، اور علی'' کے الفاظ کے صوتی آہنگ سے شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ مصرع ثانی میں ''تجھ سا کوئی نہیں'' کی تکرار ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔

شعر نمبر 8

اے سراپا نفیسؔ انفسِ دو جہاں، سرورِ دلبراں، دلبرِ عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے میری جانِ حزیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

حلِ لغت

سراپا (سر سے پاؤں تک، مکمل طور پر)، نفیس (پاکیزہ)، انفسِ دو جہاں (دو جہانوں کے پاکیزہ ترین)، سرورِ دلبراں (محبوبوں کے سردار)، دلبرِ عاشقاں (عاشقوں کے محبوب)، جانِ حزیں (غمگین جان، مغموم دل)

مفہوم

اے دو جہانوں میں سب سے پاکیزہ ہستی، آپ خاتمُ النّبیین ﷺ عاشقوں کے محبوب اور محبوبوں کے سردار ہیں۔ میری غمگین جان آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

تشریح

سید نفیس شاہ حسینی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا۔ علم و ادب کی دنیا میں سید نفیس الحسینی کے نام مشہور ہوئے۔ خطاطی اور شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں رسول خاتمُ النّبیین ﷺ سے والہانہ عشق و محبت تھی جس کا اظہار ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

تشریح طلب شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ اے نبی خاتمُ النّبیین ﷺ آپ سراپا پاکیزہ ہستی ہیں۔ دو جہانوں میں سب سے پاکیزہ ذات آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ حسب و نسب میں سب سے بلند

اور اخلاق و کردار میں سب سے پاکیزہ۔ آپ قول و قرار میں پاکیزہ۔ آپ ﷺ جسمانی اور روحانی لحاظ سے پاکیزگی کے منبع ہیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا جسمِ اطہر ہر طرح کی آلائشوں سے پاک تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام طاہر بھی ہے جس سے نفاست و لطافت ظاہر ہوتی ہے۔

شاعر مزید کہتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ عاشقوں کے محبوب ہیں اور محبوبوں کے بھی سردار ہیں۔ دنیا میں جتنے بھی محبوب لوگ ہیں اُن میں سب سے زیادہ آپ ﷺ محبوب ہیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی محبت و اطاعت جزوِ ایمان ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی محبت و اطاعت کے بغیر کوئی عمل اور کوئی عقیدہ قابلِ قبول نہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے دل میں نبی خاتمُ النّبیین ﷺ کی محبت اور عزت تمام دنیا سے بڑھ کر نہ ہو۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

''کوئی بندہ اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک مَیں اُسے اُس کے اہل و عیال، مال اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔'' (صحیح مسلم:168)

اللہ کی اطاعت بھی تبھی قابلِ قبول ہو گی جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی اطاعت کی جائے گی۔ آپ کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہے۔ الغرض ہمارے ایمان کی حقیقت آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سے محبت اور آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی عظمت کے اعتراف میں پوشیدہ ہے۔ بقول شاعر:

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ اے نبی خاتمُ النّبیین ﷺ! میری غمگین زندگی آپ ﷺ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی میری زندگی کے دکھوں کا مداوا کر سکتے ہیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی مجھ بیمار کے مسیحا ہیں۔ شاعر نے یہاں یہ نہیں کہا کہ میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو ڈھونڈ رہا ہوں بلکہ شاعر کہتا ہے میری ''جانِ حزیں'' آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ گویا آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی وہ ہستی ہیں جس سے میرے مغموم دل کو سکون میسر آ سکتا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی کی ذات میری جانِ حزیں کی بقا و سلامتی کا ذریعہ ہے۔ زندگی کی خوشیاں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہی سے وابستہ ہیں۔ آپ ﷺ ہی کے دم قدم سے اس کی رونقیں اور رعنائیاں ہیں۔ جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں کہتے ہیں:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی مشکلات اور پریشانیاں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ رنج و الم میرے دل کو پژمردہ کر دیتے ہیں ایسے میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی زیارت کے لیے روضے پر حاضری اور آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی یاد ہی میرے دل کو تر و تازہ کر سکتی ہے اور مری روح کو سکون اور دل کو زندگی بخش سکتی ہے۔ چناں چہ میرے دل میں ہر لحہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے دیدار کی خواہش مچلتی رہتی ہے۔ میری شدید تمنا ہے کہ کسی طرح آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی زیارت نصیب ہو جائے یا آپ ﷺ کے روضے پر حاضری کی سعادت مل جائے۔ ایک عاشق کے لیے محبوب کے در پر حاضری اور اس کے دیدار سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے؟

بلاشبہ ایک سچے مسلمان کے لیے حضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی ذات گرامی ہی سب سے بڑھ کر عزیز ہوتی ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی زیارت کی خواہش اس کے دل میں ہمہ وقت مچلتی رہتی ہے اور آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی محبت ہی اس کے غموں کا مداوا، اس کا دلی سکون اور اس کا جینا اور مرنا ہوتا ہے۔

جس طرح بارش مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے، کمزور اور مرجھائے ہوئے درختوں کو غذا پہنچا کر سرسبز و تر و تازہ کرتی ہے، بالکل

اسی طرح آپ خاتم النبیین ﷺ کی زیارت سے میرا مرجھایا ہوا دل زندہ ہو جاتا ہے اور دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ روزِ آخرت گناہوں پر پکڑ اور جہنم کا خوف جب مجھے بے چین کرنے لگتا ہے تو آپ خاتم النبیین ﷺ کی شفاعت کی امید مجھے اطمینان دیتی ہے اور میرے دل کے لیے تسلی کا باعث بنتی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہی بے نواؤں اور بے کسوں کا ماویٰ و ملجا ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ دکھی انسانیت کے لیے رحمت و مسرت ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی نوازشیں اور مہربانیاں، امیر و غریب، شاہ و گدا، اعلیٰ و ادنیٰ، سب پر یکساں ہیں۔ بقول: مولانا ظفر علی خاں

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے ‏ ‏ ‏ اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمھیؐ تو ہو

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ آپ ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بطور انسان اور بطور نبی و رسول ہر لحاظ سے بے مثال ہستی ہیں۔ آپ ﷺ ہر اعتبار سے کامل، اکمل اور مکمل انسان ہیں۔ آپ ﷺ انسان تو ہیں مگر عظیم الشان ہیں۔ نبی اور رسول تو ہیں مگر امام الانبیا اور خاتم المرسل بھی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ بشر تو ہیں مگر خیر البشر ہیں۔ الغرض آپ خاتم النبیین ﷺ جیسا کوئی نہیں ہے۔

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ ''نفیس اور انفس'' اسی طرح ''دلبر اور دلبراں'' کے الفاظ صنعتِ اشتقاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ شاعر نے کمال مہارت سے اپنا تخلص ''نفیس'' بھی شعر میں اس طرح پرو دیا ہے کہ وہ بھی شعر کے مفہوم کا حصہ بن گیا ہے۔ ''تجھ سا کوئی نہیں'' کی تکرار نے شعر کے صوتی حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ شعر روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔

مشقی سوالات

سوال (1) مختصر جواب دیں۔

(الف) رسولِ امیں خاتم النبیین ﷺ اور خاتم الرسلیں ﷺ کس عظیم ہستی کو کہا جاتا ہے؟

جواب: رسولِ امیں اور خاتم الرسلیں حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کو کہا جاتا ہے۔ یہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے القابات ہیں۔ رسولِ امیں کا مطلب دیانت دار رسول ہے۔ آپ خدا کے سچے اور امانت دار رسول تھے۔ قول و قرار کو پورا کرتے تھے۔ لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھواتے تھے۔ تجارتی لین دین اور ذاتی معاملات میں آپ کی امانت داری بے مثال تھی۔ خاتم الرسلیں سے مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ خاتم النبیین ﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب آپ خاتم النبیین ﷺ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔ اس لیے آپ کو خاتم الرسلین کہا جاتا ہے۔

(ب) ''سدرۃ المنتہیٰ'' اور ''قابِ قوسین'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: سدرۃ المنتہیٰ: سِدْرَۃُ الْمُنْتَہیٰ ساتویں آسمان پر ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کے مطابق وہاں ایک بیری کا درخت ہے۔ اس مقام سے آگے عالمِ بالا ہے جہاں تک کسی کی بھی رسائی ممکن نہیں۔ وہاں نورِ الٰہی کی تجلیات اس قدر ہیں کہ جبریل امینؑ کے بھی پَر جلتے ہیں۔

قابِ قوسین: عربی کی ترکیب ہے جو قرآن مجید کی سورۃ النجم میں مذکور ہے۔ اس کے معنی ہیں دو کمانوں کے درمیان فاصلہ یعنی اللہ اور اللہ کے رسول محمد ﷺ کے درمیان کمال قربت جس کی کوئی حد نہیں۔

(ج) آپ خاتم النبیین ﷺ کے نسب کے حوالے سے شاعر نے کیا کہا ہے؟

جواب: حسب و نسب کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ ہیں۔ حسب ماں کی جانب سے خاندان کو کہتے ہیں جب کہ نسب باپ کی جانب سے خاندان کو کہتے ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ عالی حسب اور عالی نسب ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے شجرہ نسب میں عبداللہؓ سے آدم علیہ السلام تک آپ ﷺ کے سبھی والدین اعلیٰ اخلاق و اطوار کے مالک تھے۔ سخاوت، رحم دلی اور

خدمتِ خلق میں بے مثل تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی والدہ کا نام حضرت آمنہؓ بنت وہب تھا۔ جن کا تعلق قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنو زہرہ سے تھا۔ اس طرح والد اور والدہ دونوں جانب سے آپ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نسبتیں اعلیٰ ہیں۔

(د) شاعر نے رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کے کس سفر کے بارے میں کیا کہا ہے؟

جواب: شاعر نے رسول ﷺ کے سفرِ معراج کے بارے میں کہا ہے کہ آپ کی رسائی سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے ہے۔ معراج کے سفر میں سدرۃ المنتہیٰ کا مقام بھی پیچھے رہ گیا۔ عالمِ بالا میں آپ خاتم النبیین ﷺ خدا کے قرب میں چلے گئے۔ یہاں تک دو ہاتھ (قابِ قوسین) جتنا فاصلہ رہ گیا یا شاید اس سے بھی کم۔ آپ خاتم النبیین ﷺ خدا کے قریب ہوئے اور خدا آپ خاتم النبیین ﷺ کے قریب ہوا۔

(ہ) شاعر نے رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کی مدح و ثنا میں کون کون سے الفاظ بہ طور قافیہ استعمال کیے ہیں۔

جواب: شاعر نے رسولِ پاک خاتم النبیین ﷺ کی مدح و ثنا میں درج ذیل الفاظ بہ طور قافیہ استعمال کیے ہیں: خاتم الرسلیں، درِ ثمیں، سید الآخریں، قریں، منور جبیں

سوال (2) درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) یہ نعت ہیئت میں لکھی گئی ہے:

(الف) غزل کی ‏ ‏ (ب) مخمس کی ‏ ‏ (ج) مسدس کی ‏ ‏ (د) مثنوی کی

(ب) نعت کے اشعار میں صنعت نمایاں ہے:

(الف) صنعت تضمین ‏ ‏ (ب) صنعت مراعات النظیر ‏ ‏ (ج) صنعت تکرار ‏ ‏ (د) صنعت لف و نشر

(ج) ''سکہ رواں ہونا'' اردو قواعد کی رو سے ہے: (شاملِ نصاب نعت میں اس سوال سے متعلق شعر موجود نہیں ہے)

(الف) ضرب المثل ‏ ‏ (ب) روزمرہ ‏ ‏ (ج) محاورہ ‏ ‏ (د) کنایہ

(د) ''رسولِ امیں'' اردو قواعد کی رو سے ہے۔

(الف) مرکب عطفی ‏ ‏ (ب) مرکب اضافی ‏ ‏ (ج) مرکب توصیفی ‏ ‏ (د) مرکب عددی

(و) نعت کے چوتھے شعر میں صنعت استعمال ہوئی ہے۔

(الف) صنعت تجنیس ‏ ‏ (ب) صنعت تضاد ‏ ‏ (ج) صنعت تلمیح ‏ ‏ (د) صنعت حسن تعلیل

(ہ) یہ نعت شاعر کے مجموعہ شاعری سے لی گئی ہے:

(الف) ''گلہائے نعت'' سے ‏ ‏ (ب) ''صلو علیہ وآلہ'' سے ‏ ‏ (ج) ''برگِ گل'' سے ‏ ‏ (د) ''نفائس النبی ﷺ'' سے

سوال (3) اس نعت میں استعمال ہونے والی تراکیب کی نشان دہی کریں۔

جواب: رسولِ امیں ﷺ، خاتم الرسلیں ﷺ، خوش لقب، عالی نسب، والا حسب، دُودمانِ قریشی، دُرِ ثمیں، بزمِ کونین، سید الاولین، سید الآخریں، رہ گزر، قابِ قوسین، گرد سفر، زلفِ تاباں، منور جبیں، مدح و ثنا، شانِ جلی، صدیقؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و علیؓ، شاہدِ عدل، جانشیں، سراپا نفیسؔ، انفسِ دو جہاں، سرورِ دلبراں، دلبرِ عاشقاں، جانِ حزیں

سوال (4) نعتیہ متن کے اہم نکات کو سمجھتے ہوئے نعت کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے خلاصۂ نظم۔

تلمیح: جب کلام میں کسی تاریخی، قرآنی، مذہبی یا کسی سماجی واقعہ کو چند لفظوں میں اشارۃً یوں بیان کیا جائے کہ سارا واقعہ تازہ ہو جائے تو اس کو تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً: درج ذیل اشعار میں ابنِ مریم اور چاہِ یوسف کی تلمیحات استعمال ہوئی ہیں:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی ‏ ‏ ‏ (مرزا غالبؔ)

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت (الطاف حسین حالی)

سوال ⑤ زیرِ مطالعہ نعت میں استعمال ہونے والی تلمیحات کی نشان دہی کریں اور ان کی وضاحت کریں۔

جواب:

تلمیحات	وضاحت

سدرۃ المنتہیٰ: سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کے مطابق ایک بیری کا درخت ہے۔ اس مقام سے آگے عالمِ بالا ہے جہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ وہاں نورِ الٰہی کی تجلیات اس قدر ہیں کہ جبریل امین کے بھی پَر جلتے ہیں۔ سورہ نجم کی آیت 14 میں سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر ہے۔

قاب قوسین: قاب قوسین (دو کمانوں یا دو ہاتھوں کے برابر فاصلہ)، شبِ معراج رسول ﷺ خدا کے اتنے قریب ہوئے کہ صرف دو ہاتھ جتنا فاصلہ رہ گیا۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ پہلی وحی کے نزول کے وقت جبریل امین سے ملاقات کا ذکر ہے۔ سورہ نجم کی آیت 9 میں قاب قوسین کے الفاظ آئے ہیں۔

معراج: معراج کا سفر رسول ﷺ کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے۔ ایک رات جبریل امین خدا کے حکم سے آپ خاتم النبیین ﷺ کے پاس آئے اور آپ کو مسجدِ حرام، مسجد اقصیٰ اور وہاں سے آسمانوں کی سیر پر لے گئے۔ جہاں آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدا سے ملاقات ہوئی۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں اس کا ذکر آیا ہے۔

لیلۃ القدر: لیلۃ القدر رمضان کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے۔ یہ ایک بابرکت رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات تقدیروں کے فیصلے ہوتے ہیں اور فرشتے روح الامین کے ہمراہ خدا کے حکم سے ہر معاملے میں فیصلے اور تقدیر کا قلم دان لے کر اترتے ہیں۔ قرآن میں سورہ قدر میں اس رات کا ذکر ہے۔

سوال ⑥ شعری محاسن کی روشنی میں درج ذیل اشعار کی تشریح کریں:

مصطفیٰ مجتبیٰ، تیری مدح و ثنا، میرے بس میں نہیں، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں، لب کو یارا نہیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
اے سراپا نفیسؔ انفسِ دوجہاں، سرورِ دلبراں، دلبرِ عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے میری جانِ حزیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

جواب: دیکھیے تشریحات۔

سوال ⑦ سمعی و بصری ذرائع سے کسی معروف شاعر کی کوئی نعت پڑھیں اور اس پر تبصرہ کریں۔

۸۔ درج ذیل نعت کے اشعار درست تلفظ اور لب و لہجہ کے ساتھ پڑھیں اور ان کے معانی پر غور کرتے ہوئے اپنی زندگی کے لیے رہنمائی حاصل کریں:

تو مقصدِ تخلیق ہے تو حاصلِ ایماں
جو تجھ سے گریزاں وہ خدا سے ہے گریزاں
کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت
اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآں
اشکوں سے ترے، دین کی کھیتی ہوئی سیراب
فاقوں نے ترے، دہر کو بخشا سروساماں (ماہر القادری)

نظم بہ لحاظ ہیئت: (غزل، مخمس، مسدس)

غزل: غزل کے تمام اشعار آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلا شعر مطلع ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ باقی تمام اشعار کا مصرعِ ثانی مطلع سے ہم قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہو مقطع کہلاتا ہے۔ شامل نصاب نعت غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

مخمس: ایسی نظم ہوتی ہے جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔

مسدس: ایسی نظم جس کے ہر بند میں چھے مصرعے ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے درج ذیل نعتیہ اشعار مسدس کی ہیئت میں ہیں:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے (جوابِ شکوہ: بانگِ درا)

۹۔ شامل نصاب نعت میں بھی ایک شعر میں یارانِ نبی ﷺ کی توصیف بیان کی گئی ہے اس کی وضاحت کریں اور چاروں یارانِ نبی ﷺ کی خصوصی صفات بتائیں۔

جواب: دیکھیے شعر نمبر 7 کی تشریح۔

۱۰۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کے ساتھ واضح کریں:

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
عقیدہ	عَقِیْدَہ	لقب	لَقَبْ	حسب	حَسَبْ
دودمان	دُوْدمَان	درثمین	دُرِّ ثَمِیْن	منظر	مَنْظَر
قوسین	قَوْسَیْن	کہکشاں	کَہْکَشَاں		

سرگرمیاں برائے طلبہ:

۱۔ کالج میں اس نعت کو تحت اللفظ پڑھنے کے مقابلے میں حصہ لیں۔
۲۔ علامہ اقبالؒ کے نعتیہ کلام کو ترنم سے پڑھنے کے مقابلے کا کلاس میں اہتمام کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

۱۔ طلبہ کو اردو میں نعت گوئی اور نعت خوانی کی روایت کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔
۲۔ طلبہ کو نعت میں مذکور صفات النبی ﷺ کے ذریعے سے اپنے کردار و عمل اور اخلاق کو سنوارنے کی تلقین کریں۔
۳۔ شامل نصاب نعت کی بلند خوانی کریں اور وضاحت طلب پہلوؤں کی وضاحت کریں۔

حصہ نثر

(امتحانی نقطہ نظر سے)

عبارت کی تشریح:

عبارت کی تشریح کا سوال سالِ اوّل کے حصہ انشائی کے پرچہ میں تیسرا سوال ہے اور اس کی نوعیت کچھ یوں ہے۔

سوال 3 (i) سیاق وسباق کے حوالے سے کسی ایک اقتباس/عبارت کی تشریح کیجیے۔ سبق کا عنوان اور مصنف کا نام بھی لکھیے۔

(ii) حوالہ متن اور سیاق وسباق کے حوالے سے ایک جزو کی تشریح کریں۔

(iii) ذیل میں دی گئی کسی ایک عبارت کی متن اور سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

امتحانی پرچے میں دی گئی عبارات میں سے ایک کا انتخاب کر کے تشریح کرنا ہوتی ہے۔ چناں چہ آپ ایسی عبارت؛ انتخاب کریں جس کی تشریح آپ بہتر انداز میں کر سکتے ہوں۔ عبارت کا انتخاب کر کے اُسے یوں حل کریں۔

سوال نمبر 3

(الف)

عبارت کی تشریح

حوالہ متن:

سبق کا عنوان:

مصنف کا نام:

ماخذ:

صنف:

حوالہ:

حوالہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معانی (۱) پتا (۲) نشان (۳) اشارہ (۴) سند (۵) سپردگی (۶) تحویل وغیرہ ہیں۔

(بحوالہ فیروز اللغات صفحہ نمبر 610۔ جدید اُردو لغت 332)

متن:

متن عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معانی (۱) کتاب کی اصل عبارت (۲) کتاب، کپڑے یا سڑک کے بیچ کا حصہ۔ (۳) درمیان، وسط (۴) کتاب کی وہ عبارت جس کی تشریح کی جائے۔ (۵) درمیانہ حصہ۔

(بحوالہ فیروز اللغات صفحہ 1260، جدید اُردو لغت صفحہ 650، اظہر اللغات صفحہ 661)

حوالۂ متن لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام نثری اسباق اچھی طرح کم از کم دو تین بار پڑھے ہوئے ہوں، تا کہ عبارت پہچان سکیں کہ کس سبق سے آئی ہے۔ سبق کا عنوان بعینہٖ (مکمل طور پر) وہی ہو جو اصل کتاب میں ہے۔ یہاں تک کہ املا کی غلطی بھی نہ کریں۔ فہرست مندرجات سے چودہ اسباق کے عنوانات اور مصنفین کے نام ازبر کر لیں تا کہ یہ دو نمبر ضائع نہ ہوں۔ حوالہ متن کو جملوں میں لکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ مصنف کا نام ادھورا نہ لکھیں۔ مصنف کا نام نصابی کتاب کے مطابق لکھیں۔ املا بہر حال صحیح ہونا چاہیے۔ اچھی رفتار سے لکھنے والے طلبا دو چیزیں اضافی لکھ سکتے ہیں۔

(1) کتاب کا نام (2) صنف

کتاب کا نام ہر سبق کے آخر میں دیا ہوا ہے۔

سیاق وسباق:

(i) سیاق:

عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معانی (۱) ربط مضمون (۲) حساب، گنتی، حساب کے قاعدے (۳) طرز، چلانا وغیرہ ہیں۔

(فیروز اللغات صفحہ 871، اظہر اللغات صفحہ 410)

(ii) سباق:

عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معانی (۱) دوڑ میں آگے بڑھنا (۲) حساب میں مہارت (۳) سبقت وغیرہ ہیں۔

جدید اُردو لغت میں یوں لکھا ہوا ہے کہ:

(i) سیاق وسباق کا مطلب ہے بات یا عبارت کا آگا پیچھا جس سے پوری بات سمجھ میں آ جاتی ہے، ربط کلام

(ii) امتحان میں سیاق وسباق کے ساتھ تشریح کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دی گئی عبارت کی تشریح اس سے پہلے اور بعد کی عبارت کے ساتھ مربوط کر کے کی جائے۔

(بحوالہ جدید اُردو لغت صفحہ 463 مقتدرہ قومی زبان، ناشر اشرف ندیم)

سیاق وسباق دراصل ایک ترکیب ہے، اس لیے سیاق اور سباق کے عنوان تلے اسے الگ الگ لکھنا درست نہیں ہے۔ تاہم اس سے مُراد تشریح طلب عبارت سے پہلے اور بعد کا متن ہی ہے، جسے مختصر کر کے اس طرح جوڑ دیا جائے کہ عبارت کا ربط سبق سے قائم ہو جائے۔ تاہم یہ ایک طویل عبارت کی شکل میں لکھا جاتا ہے، جس میں سبق کے خلاصے کو قطعاً قبول نہیں کیا جاتا۔ سہولت کے لیے اسے زیرِ تشریح عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ۔۔۔ اور زیرِ تشریح عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ۔۔۔ کے طریقے سے لکھا جا سکتا ہے۔

تشریح:

عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معانی (۱) کھول کر بیان کرنا (۲) شرح کرنا، تفصیل، تفسیر، وضاحت (۳) کھولنا (۴) وضاحت۔ علم طب میں بدن کا کل حال بیان کرنا۔

(بحوالہ فیروز اللغات صفحہ 885۔ اظہر اللغات صفحہ 172۔ جدید اُردو لغت 226)

یہ حصہ بہت اہم ہے جسے وضاحت کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ اس حصے میں دی ہوئی عبارت کو آسان اور سہل الفاظ میں پیش کرنا ہے اور اس کی خوب تشریح اور وضاحت کرنی ہے۔ کوئی جملہ اور فقرہ اگر اجمالی طور پر بیان ہوا ہے تو اس کی وضاحت کر دیں۔ دورانِ تشریح ہم معنی اقوال، آیات، احادیث اور اشعار کی صورت میں ایک دو حوالے درج کیے جانے چاہییں۔ حوالہ اگر اُردو زبان کا نہ ہو تو حوالہ لکھنے کے بعد نیچے چھوٹی بریکٹ میں اس کا اُردو ترجمہ ضرور لکھنا چاہیے۔

عبارت میں اگر کسی تلمیح یا تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو اس کی پوری وضاحت کریں۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو اساتذہ دورانِ لیکچر اپنے طلبا کو اشعار، اقوال، آیات اور احادیث وغیرہ لکھواتے ہیں، طلبا ذوق وشوق سے لکھتے ہیں اور یاد بھی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کا ادبی ذوق بھی قدرے بہتر ہوتا ہے اور وہ تیاری بھی اچھے طریقے اور سنجیدگی سے کرتے ہیں۔

سبق کا خلاصہ:

اس سوال کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

مصنف کا نام

سبق کا خلاصہ

یہاں اصل کتاب کا نام اور سبق کی صنف بھی لکھی جا سکتی ہے۔

طلبا کے لیے ضروری ہدایات:

1۔ ترتیب سبق کا خیال رکھیں۔ پہلے کی بات بعد میں اور بعد کی بات پہلے نہ لکھیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سبق کا اچھی طرح مطالعہ کریں۔

2۔ سبق کا خلاصہ لکھتے وقت غیر اہم باتیں خلاصہ میں نہ آنے پائیں اور اہم چھوٹ نہ جائیں۔

3۔ سبق کا خلاصہ ایک تہائی ہونا چاہیے۔

4۔ خلاصہ مسلسل لکھنا چاہیے اور اس میں ضمنی سرخیاں نہ دیں۔

5۔ خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ مصنف کے الفاظ، انداز اور مکالموں کو بعینہٖ نہ لکھیں کیوں کہ سبق اب آپ بیان کر رہے ہیں۔

6۔ بیان کرنے کا انداز یعنی بیانیہ انداز اختیار کریں۔

7۔ سبق کو صرف کتاب میں بیان کیا گیا سمجھ کر خلاصہ لکھیں خود اضافہ نہ کریں۔

8۔ اپنی طرف سے حوالہ جات، تاثرات، رائے یا تنقید کو شامل نہ کریں۔

9۔ خلاصہ میں تشریح کا انداز اختیار نہ کریں بلکہ تمام اہم باتوں کو مختصر بیان کریں۔

10۔ خلاصۂ سبق میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ روانی اور اصل عبارت کا لطف بھی برقرار رہنا چاہیے۔

11۔ سبق کا خلاصہ عبارات (پیراگراف) بنا کر لکھیں۔ ایک عبارت سات سے دس سطور پر مشتمل ہونی چاہیے۔

سبق ۳: اخلاقِ نبوی ﷺ

مُصنف
علامہ شبلی نعمانیؒ
(1857-1914)

مصنف کا تعارف

اصل نام محمد شبلی تھا لیکن شبلی نعمانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی پھر اعظم گڑھ، غازی پور، سہارن پور اور لاہور میں تعلیم مکمل کی۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا لیکن اس پیشے میں ان کا جی نہ لگا۔ علی گڑھ گئے جہاں سر سید احمد خاں نے انھیں عربی اور فارسی کا استاد مقرر کر دیا۔ وہاں وہ سولہ برس تک پڑھاتے رہے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ علی گڑھ میں پروفیسر تھامس آرنلڈ سے فرانسیسی سیکھی اور انھیں عربی سکھائی۔ سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ سے حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں وہ چار سال تک ناظمِ تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے۔ وہاں سے پھر واپس لکھنؤ آ گئے اور دارالعلوم "ندوہ" سے وابستہ ہوئے۔ آخری دور میں اختلافات کے سبب ندوہ سے بھی علاحدہ ہو گئے اور اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جہاں سے اعلیٰ درجے کی کئی ایک کتابیں شائع کیں۔ اس ادارے سے آج بھی اُردو کی اعلیٰ درجے کی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

شبلی نعمانی ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔ مفکّر، مؤرّخ، ناقد، فقیہہ، مصلح، واعظ کے علاوہ شاعر اور صاحب ذوق شخصیت کے مالک تھے۔ اُردو ادب میں ان کی کتابوں کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی اہم کتابوں میں "المامون"، "سیرۃ النعمان"، "الفاروق"، "الغزالی"، "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" نمایاں ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں ان کی تمام تر توجہ "سیرت النبی ﷺ" پر مرکوز رہی جو کہ اُردو سیرت نگاری میں ان کا اہم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھنا شروع کی تھی مگر وہ اس کی دو جلدیں ہی مکمل کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور باقی ماندہ جلدیں اُنھیں کے فراہم کردہ مواد سے ان کے شاگردِ خاص سید سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔ زیرِ نظر اقتباس اسی کتاب (جلد دوم) سے لیا گیا ہے۔

شبلی کا اندازِ تحریر شگفتہ، رواں اور مدلّل ہے۔ ان کی تحریروں میں ادبی شوخی و حسن بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔ ان کے ہاں فارسی و عربی کے الفاظ اور تراکیب کثرت سے استعمال ہوتی ہیں مگر سادہ، عام فہم اور شستہ ہوتی ہیں اور عبارت کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔

ادبی خدمات

☆ سیرت و سوانح: المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سیرت النبی ﷺ، سوانح مولانا روم

☆ فلسفہ و کلام: علم الکلام، الکلام، الغزالی، مقالاتِ شبلی

☆ ادبیات: (تنقید) موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم (پانچ جلدیں)

☆ سفرنامہ: سفرنامہ مصر و روم و شام

☆ تاریخ: تاریخ اسلام، مضامینِ عالمگیر

اہم نکات:

☆ طلبہ کو مولانا شبلی نعمانی کی سیرت نگاری، اسلامی تاریخ اور ثقافت کے اہم پہلوؤں سے رُوشناس کرانا۔

☆ طلبہ کو تاریخی تحقیق کے اصول اور طریقہ ہائے کار کے بارے میں آگاہ کرنا۔

☆ طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا اور ان کے مذہبی، دینی شعور میں اضافہ کرنا۔

مشکل الفاظ کے معانی

(12) **اَخلاق**:(خُلق کی جمع، پسندیدہ عادتیں، اچھی خصلتیں، طور طریقے، وہ سلوک جو مروت پر مبنی ہو۔)، **مُداوَمَت**:(ہمیشگی، دوام ثبات، قیام کسی عمل پر قائم رہنا، پابندی سے کرنا، ہمیشہ کا معمول)، **مُداوَمتِ عمل**:(کسی عمل پر قائم رہنا، کسی کام کو متواتر اور پابندی سے کرنا)، **مقدم**:(پہلا، افضل، برتر، لازم، ضروری)، **پہلو**:(سمت، جانب، کروٹ، رُخ، نکتہ)، **اختیار کرنا**:(مُنتخب کرنا، عمل میں لانا، معمول بنانا، پسند کرنا)، **اس قدر**:(اتنا زیادہ، اس درجہ، یہاں تک)، **استقلال**:(ثابت قدمی، ضبط وتحمل سے اپنے مؤقف پر جمے رہنا، ڈٹے رہنا)، **فطرتِ ثانیہ**:(پختہ عادت)، **سوا**:(علاوہ، بجز)، **مخلوق**:(پیدا کیا ہُوا، خلق کی ہوئی یا بنائی ہُوئی شے، دنیا کے لوگ)، **فطرتاً**:(فطرت کی رُو سے، قدرتی طور پر، جبلی طور پر)، **دقیق**:(پیچیدہ، مشکل، دشوار، معاملے کی گہرائی تک پہنچنے والا)، **نکتہ**:(عملی یا فلسفیانہ بات، باریک بات، عقل کی بات، راز، بھید)، **اخلاقِ حسنہ**:(عمدہ اخلاق، عمدہ عادتیں)، **شدت سے**:(سختی سے، سخت پابندی سے، کثرت سے)، **دائمی**:(ہمیشہ کا، مستقل، دوامی)، **غیر متبدّل**:(جس میں تبدیلی واقع نہ ہو، جس میں تغیر نہ ہُوا ہو۔)، **عمل کرنا**:(ماننا، تعمیل کرنا، کاربند ہونا)، **مجبور**:(بے بس، لاچار، جسے خود کرنے کا اختیار نہ ہو۔)، **یقین**:(اعتبار، اعتماد، بھروسا، اطمینان)، **سرزد ہونا**:(واقع ہونا، ظاہر ہونا، صادر ہونا، عمل پذیر ہونا)، **افعال**:(کام جو کسی انسان یا حیوان سے سرزد ہوں، انسان کے اعمال)، **صادر ہونا**:(جاری ہونا، واقع ہونا، پیش ہونا) **آفتاب**:(سورج)، **استقامت**:(استقلال، ثابت قدمی، قدم جمائے کھڑے رہنا)، **اصول**:(دستور، طریقہ، قاعدہ، ضابطہ)، **پابندی**:(استقلال، استحکام، روک تھام، بندش)، **شدت سے**:(سختی سے، جبر وزور سے، سخت پابندی سے)، **سُنت**:(دستور، طریقہ، حضور اکرم ﷺ کا قول وفعل یا طریقہ)، **شریعت**:(قانونِ الٰہی)، **فعل**:(کام، عمل)، **قوی**:(توانا، طاقت ور، مضبوط، مستحکم)، **مانع**:(منع کرنے والا، روکنے والا، رکاوٹ ڈالنے والا، ممانعت، روک)، **ترک کرنا**:(چھوڑ دینا، دست بردار ہونا، کنارہ کش ہونا)، **جس قدر**:(جتنا، جس حد تک)، **سُنن**:(طریقے، واقعات، سنت کی جمع)، **درحقیقت**:(حقیقت میں، اصل میں، صحیح معنوں میں)، **نا قابلِ انکار**:(جس سے انکار ممکن نہ ہو، جس کو جھٹلایا نہ جا سکے۔)، **مثال**:(مثل، مانند، نظیر، نمونہ)، **حُسنِ خلق**:(خوش خلقی، ملن ساری، تواضع)، **معمول**:(عادت)، **مصافحہ**:(ملاقات کے وقت ہاتھ سے ہاتھ ملانے کا عمل)، **رُخ**:(چہرہ، توجہ)، **مجلس**:(بیٹھنے کی جگہ، محفل، بزم، انجمن)، **زانو**:(گھٹنا، ران)، **ہم نشین**:(ایک ساتھ بیٹھنے والا، دوست احباب، ساتھی، ہم صحبت)، **چاکر**:(نوکر، خادم، ملازم، خدمت گار)، **اقدس**:(بہت زیادہ پاک، متبرک، حد درجہ معتبر)، **متبرک**:(برکت والا، مقدس، پاک، قابلِ تعظیم)، **جاڑا**:(سردی، خنکی، ٹھنڈ، سردی کا موسم)، **تاہم**:(اس کے باوجود، پھر بھی)، **صحبت**:(ہمراہی، ساتھ، دوستی، مجلس، مل بیٹھنا)، **ناگوار**:(ناپسند، ناخوش گوار، بُرا، نامناسب)، **برداشت**:(صبر، تحمل)

(13) **تذکرہ**:(ذکر، یاد کرنا، گفت گو، بات چیت)، **دستور**:(طرز، آئین، قانون، قاعدہ)، **زعفران**:(ایک قسم کا نہایت خوش بودار زرد رنگ کا پھول)، **رِدا**(چادر)، **تعمیم**:(عمومیت، سب کو شامل کرنا)، **ابہام**:(غیر واضح)، **مخصوص**:(خاص، نامزد کیا گیا، خصوصی)، **ذِلّت**:(رسوائی، بے عزتی، بدنامی)، **احساسِ غیرت**:(احساسِ عزت، عزتِ نفس کا احساس)، **وصف**:(خوبی، صلاحیت، قابلیت)، **نمایاں**:(ظاہر، واضح، عیاں، صاف صاف نظر آنے والا)، **ایثار**:(قربانی دینا، دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینا)، **بے انتہا**:(بے حد، بے اندازہ)، **عزیز**:(پیارا، دوست، ساتھی)، **فرطِ محبت**:(محبت کا غلبہ، دوستی واخلاص کی کثرت، محبت اور پیار کی زیادتی)، **پیشانی**:(ماتھا، جبیں)، **بوسہ دینا**:(چومنا، پیار کرنا)، **عُسرت**:(تنگی، تنگ دستی، دشواری، مفلسی)، **تنگ دستی**:(مفلسی، ناداری، غریبی، افلاس)، **خادمہ**:(ملازمہ، نوکرانی)، **پیسنا**:(ریزہ ریزہ کرنا، سفوف بنا دینا)، **مَشک**:(پانی بھرنے اور لے جانے کے لیے کسی مویشی کی کھال کا سِلا ہوا تھیلا)، **گھِسنا**:(رگڑ لگنا، رگڑ آنا، پسینا)، **حیا**:(شرم، لحاظ، غیرت)، **عرضِ حال**:(صورتِ حال کا اظہار، واقعہ کا بیان، اظہارِ مدعا)، **جنابِ امیر**:(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب)، **فلاں**:(وہ شخص یا چیز جو ذہن میں ہو لیکن اُس کا نام لینا کسی وجہ سے مقصود اور مناسب نہ ہو)، **غزوہ**:(جنگ، وہ معرکہ جس میں نبی کریم ﷺ نے شرکت کی

ہو۔)، **کنیز**:(خدمت گار عورت، باندی، لونڈی)، **اصحابِ صُفّہ**:(صفہ پر رہنے والے صحابہ کرامؓ)، **بندوبست**:(انتظام، نظم وضبط)، **تواضع**:(خاطر مدارات، آؤ بھگت، مہمان نوازی، عاجزی، انکساری)، **کام کاج**:(کاروبار، کام دھندا، اشغال)، **پیوند**:(پھٹے ہوئے کپڑے وغیرہ پر لگایا ہُوا جوڑ، تھگلی)، **گانٹھنا**:(مرمت کرنا، سینا)، **عار**:(شرم، جھجک، عیب)، **غلام**:(خادم، نوکر، خدمت گزار، زرخرید نوکر)، **مسکین**:(غریب، مفلس)، **پرہیز**:(احتیاط، بچاؤ، منع کی ہوئی چیزوں سے بچنا)، **تعظیم**:(بڑا جاننا، عزت، حُرمت، وقعت)، **عجم**:(عرب کے سوا کسی دوسرے ملک کے لوگ، غیر عرب)، **عیادت**:(بیمار پرسی، بیمار کے پاس جا کر اس کی مزاج پرسی کرنا)، **مفلس**:(محتاج، بے زر، غریب، جس کے پاس پیسہ اور مال نہ ہو۔)، **صحابی**:(وہ شخص جس نے بحالتِ ایمان نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی ہو اور اسلام پر وفات پائی ہو۔)، **امتیازی**:(خصوصی، ممتاز، خاص وصف رکھنے والا)، **حیثیت**:(بساط، آبرو، شان)، **مجمع**:(بہت سے لوگوں کا ہجوم، بھیڑ)، **نبوت**:(پیغمبری یا پیغام رسانی، نبی کا فرض یا منصب جو وہبی ہوتا ہے)، **رعب**:(دبدبہ، شان وشوکت، ہیبت، خوف)، **طاری**:(چھایا ہوا، پھیلا ہوا، غالب)، **کانپنا**:(خوف کھانا، لرزنا، تھرتھرانا)، **سوکھا**:(خشک)، **نہایت**:(بے انتہا، بے حد، بہت زیادہ، بکثرت)، **شفقت**:(مہربانی، نوازش، بڑوں کی جانب سے چھوٹوں پر مہربانی یا کرم کا جذبہ)، **راہ**:(راستہ)

(14) **خالد بن سعید بن العاصؓ**:(ایک صحابی کا نام)، **کُرتا**:(وہ قمیص جس میں کف نہ ہو)، **حسنہ**:(بھلائی، اچھے، اچھی، نیک)، **حبش**:(ایک ملک کا نام)، **مناسبت**:(باہمی تعلق، باہم نسبت، لگاؤ)، **تلفّظ**:(حروف یا الفاظ کا ادا کرنا، لفظ کا منہ سے ادا کرنا، لہجہ، طرزِ ادا)، **محدود**:(حد کیا گیا، گھیرا ہُوا، احاطہ کیا ہوا۔)، **مشرک**:(شرک کرنے والا)، **لُطف فرمانا**:(مہربانی کرنا، کرم کرنا، عنایت کرنا)، **جھپٹ**:(اچانک یا جلدی کا حملہ، لڑائی، جھگڑا، جھڑپ)، **آزردہ**:(ناراض، خفا، رنجیدہ، ناخوش)، **فطرت**:(قدرت، طبیعت جو پیدائشی ہو اور خارجی اثر سے پیدا نہ ہوئی ہو)، **فصل**:(موسم، پیداوار، کھیتی)، **میوہ**:(پھل، ثمر جیسے انگور، انار، سیب، کشمش، بادام وغیرہ)، **حاضرین**:(حاضر کی جمع، کسی جلسے یا مجلس میں موجود اشخاص یا اہلِ محفل)، **عنایت**:(مہربانی، شفقت، لطف، کرم، احسان)، **لطفِ طبع**:(مزاج کی لطافت، طبیعت کی پاکیزگی)، **ظرافت**:(خوش مزاجی، مزاح، دل لگی)، **حضرت انسؓ**:(ایک صحابی کا نام)، **پُکارنا**:(آواز دینا، بلند آواز سے بلانا)، **نکتہ**:(گہری بات، کام کی بات، عقل کی بات)، **اطاعت شِعار**:(حکم ماننے والا، تابع فرمان، فرماں بردار)، **ارشاد**:(حکم، فرمان، ہدایت، نصیحت)، **کان لگائے رہنا**:(سُننے کے لیے متوجہ ہونا، غور سے سننا)، **کم سِن**:(چھوٹی عمر کا)، **ممولا**:(چڑیا کے برابر کا ایک پرندہ)، **پالنا**:(پرورش کرنا، دیکھ بھال کرنا)، **اتفاق سے**:(اچانک، غیر متوقع طور پر، شاذ و نادر)، **رنج**:(غم، دکھ، حزن وملال کی کیفیت)، **غم زدہ**:(رنجیدہ، پریشان حال، دُکھیا)، **عرض کرنا**:(درخواست کرنا، التجا کرنا، کہنا)، **بہشت**:(جنت، باغ، جنت الفردوس)، **نصیب ہونا**:(میسر ہونا، حاصل ہونا، ملنا، مقدر ہونا)، **صدمہ ہونا**:(رنج پہنچنا، غم ہونا، حادثہ یا سانحہ پیش آنا)، **بدوی**:(دیہاتی عرب)، **زاہرؓ**:(ایک صحابی کا نام)، **ہدیہ**:(تحفہ)، **اتفاقاً**:(اچانک، اتفاقیہ طور پر)

(15) **سَرْوَر**:(سردار، بادشاہ)، **دام**:(قیمت، مول، نرخ)، **شکایت**:(شکوہ، گلہ)، **شکم**:(پیٹ، بطن)، **گرانی**:(بھاری پن)، **سہ بارہ**: تیسری بار، تیسری (مرتبہ)، **شفا**:(صحت، تن درستی، بیماری سے صحت)، **مادۂ فاسد**:(سڑا ہوا مواد، جسم کے اندر کا خراب مادہ)، **تنقیہ**:(صاف کرنا، پاک کرنا، آنتوں کو صاف کرنا، جلاب لینا)، **باریاب**:(رسائی پانے والا، حاضر، کامیاب، بامُراد)، **اثنا**:(وقفہ، درمیان، بیچ، دوران میں)، **کنگن**:(کلائی کا ایک زیور)، **خلافِ معمول**:(معمول اور عادت سے ہٹ کر)، **چاک کرنا**:(کاٹنا، پھاڑنا، چیرنا)، **صاحب زادہ**:(لڑکا، بیٹا، شاہی خاندان کی اولادِ نرینہ کا تعظیمی خطاب)، **حضرت فاطمہؓ**:(دیکھیے حصہ توضیحات)(حضور ﷺ کی بیٹی کا نام)، **نشست گاہ**:(بیٹھک، دیوان خانہ، بیٹھنے کی جگہ)، **حسنین کریمینؓ**:(حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ)، **گل دستہ**:(مختلف پھولوں کا گچھا، منتخب اور عمدہ چیزوں کا مجموعہ)، **خطبہ**:(خطاب، تقریر)، **اتفاق سے**:(اچانک، غیر متوقع طور پر)، **کم سنی**:(کم عمری، چھوٹی عمر، بچپن)، **لڑکھڑانا**:(ڈگمگانا، پاؤں کانپنا، قدم اکھڑ جانا)، **ضبط کرنا**:(برداشت کرنا، صبر کرنا، تحمل)، **منبر**:(وہ کرسی جس پر بیٹھ کر خطیب خطبہ دیتا ہے)، **دوش**:(کندھا، مونڈھا)، **بالآخر**:(آخر کار، آخر میں)

سبق (16) داماد: (بیٹی کا شوہر)، بدر: (ایک مقام کا نام)، فدیہ: (معاوضہ، کفارہ (دیکھیے حصہ توضیحات)، جہیز: (دلہن کو دیا گیا سامان)، بے تاب: (بے چین، جس میں صبر نہ ہو، بے صبر)، بسر و چشم: (سر آنکھوں پر، خوشی سے، رضامندی کے ساتھ)، نواسی: (بیٹی کی بیٹی)، حالتِ نزع: (موت کے وقت کی حالت، جانکنی)، حضرت سعدؓ: (ایک صحابی کا نام)، آغوش: (گود، بازوؤں کا حلقہ، پہلو)، رحم: (رحمت، مہربانی)، حضرت ابراہیمؓ: (حضور اکرم ﷺ کے ایک بیٹے کا نام)، وفات: (موت، انتقال)، آبدیدہ ہونا: (آنکھوں میں آنسو آنا، آنسو بہانا، اشک بار ہونا)

توضیحات

اَخلاق: خُلق کی جمع، پسندیدہ عادتیں، اچھی خصلتیں، طور طریقے، وہ سلوک جو مروت پر مبنی ہو۔

مُداوَمت: ہمیشگی، دوام، ثبات، قیام کسی عمل پر قائم رہنا، پابندی سے کرنا، ہمیشہ کا معمول

مُداوَمتِ عمل: کسی عمل پر قائم رہنا، کسی کام کو پابندی سے کرنا، کسی کام کو متواتر اور مستقل مزاجی سے کرنا

فطرتِ ثانیہ: دوسری فطرت، عادت یا روش وغیرہ جو پختہ ہو کر طبیعت کا جز بن جائے، عادت جو مزاج کا انداز پیدا کر لے۔

شریعت: وہ قانون جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے واسطے مقرر فرمایا، قانونِ الٰہی۔ شریعت سے مراد وہ طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی زبانی بطور دین مقرر فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ خاتم النبیین ﷺ سے قبل انبیائے کرام کی زبانی احکامات مقرر فرمائے تھے۔

معمول: عمل کیا گیا، دستور، قاعدہ، رواج، ایسا فعل یا عمل جو عام طور پر سبھی مواقع پر استعمال میں لایا جائے۔ وہ بات جو روزمرہ کی جائے۔

تعمیم: تعمیم کا لغوی معنی ہے شمولیت یعنی سب کو شامل کرنا۔ عمومیت، عام کرنا، سب کو شامل کرنا، عام ہونا

ابہام: ابہام کے لغوی معنی ہیں پوشیدہ کہنا، کھل کر بیان نہ کرنا، واضح نہ ہونا۔ کسی لفظ، محاورے، جملے، اشارے وغیرہ کو ایسے استعمال کرنا کہ اس سے ایک واضح معنی و مطلب کی بجائے کئی مفہوم پیدا ہوں اور کہنے والے کا اصل مدعا واضح اور دوٹوک انداز میں سامنے نہ آئے۔

غزوہ: ''غزوہ'' اس مہم یا جنگ کو کہتے ہیں، جس میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔

اصحابِ صُفّہ: مسجد نبوی کے ایک کنارے پر ایک چبوترا تھا جس پر کھجور کی پتیوں سے چھت بنا دی گئی تھی۔ اسی چبوترے کا نام صفہ تھا۔ جو صحابہ کرامؓ گھر بار نہیں رکھتے تھے وہ اسی چبوترے پر سوتے، بیٹھتے تھے اور یہی لوگ اصحابِ صفہ کہلاتے ہیں۔

صحابی: وہ شخص جس نے بحالتِ ایمان نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے ملاقات کی ہو اور اسلام پر وفات پائی ہو۔

خالد بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ: خالد بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ (وفات: 13ھ) ایک صحابیٔ رسول تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسلام قبول کرنے کے بعد کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حبشہ کی دوسری ہجرت میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت کی۔ خیبر کی فتح کے بعد آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ ہجرت کی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتح مکہ، غزوہ تبوک، غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں حصہ لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جنگ فحل میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت پائی۔

حبش: حبش یا حبشہ (ایتھوپیا) سوڈان کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ماضی میں یہ بحیرہ احمر کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا لیکن آج کل اریٹیریا، جبوتی اور صومالیہ اسے بحیرہ احمر اور خلیج عدن سے جدا کرتے ہیں۔

مشرک: شرک کرنے والا، جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی عبادت کے لائق سمجھے یا ان کی عبادت کرے یا اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی اور کو شریک جانے اسے مشرک کہتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مالک صحابیٔ رسول تھے۔ آپ کی والدہ کا نام اُمِ سُلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت ملحان ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے ابوحمزہ رکھی اور آپ کا مشہور لقب ''خادم النبی'' ہے۔ اس لقب پر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بے حد فخر تھا۔ دس برس کی عمر میں یہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور دس برس تک سفر و وطن، جنگ و صلح ہر جگہ ہر حال میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کی خدمت کرتے رہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر دم خدمتِ اقدس میں حاضر باش رہتے تھے۔

ممولا: چڑیا کے برابر ایک پرندے کا نام جس کے پیٹ پر کالی دھاریاں ہوتی ہیں۔ دُم اوپر سے سیاہ اور نیچے سے سفید ہوتی ہے، جسے وہ زمین پر مارتا رہتا ہے اور پھدک کر چلتا ہے۔ عربی میں اسے غُیّر کہتے ہیں۔

بدوی: غیر مہذب اور جنگلی عرب، یہ لوگ خانہ بدوش ہیں اور صحراؤں اور ریگستانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا پیشہ اونٹ، گھوڑے اور بھیڑ بکریاں پالنا ہے۔ دیہات میں رہنے والے عرب۔

زاہرؓ: حضرت زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ ایک بدوی یعنی دیہات کے رہنے والے صحابی تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیہات کے عمدہ پھل وغیرہ پیارے آقا خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں بطورِ تحفہ لایا کرتے تھے اور جب رخصت ہوتے تو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ شہر کی چیزیں ان کو دے دیا کرتے تھے۔ سرکارِ مدینہ خاتم النبیین ﷺ کو ان سے محبت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ زاہر ہمارا دیہاتی بھائی ہے اور ہم اس کے شہری بھائی ہیں۔ جب کہ ایک روایت میں اس طرح بھی آیا ہے کہ ہر شہری کا کوئی نہ کوئی دیہاتی بھائی ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دیہاتی بھائی زاہر بن حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

ہدیہ: تحفہ، نذرانہ، وہ چیز جو کسی کو تعظیم یا اکرام یا محبت کے جذبے کے تحت دی جائے۔

گرانی: بھاری پن، وزنی ہونا، پیٹ میں غذا ہضم نہ ہونے سے طبیعت میں بھاری پن ہونا، بدہضمی، بوجھ

حضرت فاطمۃ الزہراؓ: حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحب زادی کا نام، جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ مطہرہ اور امام حسنؓ و حسینؓ کی والدہ ماجدہ ہیں۔

حسنینِ کریمینؓ: حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے دو بیٹے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کے نواسے۔

خطبہ: وعظ، تقریر، وعظ و نصیحت جو نمازِ جمعہ سے پہلے اور نمازِ عیدین کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے سنائی جاتی ہے۔

منبر: لکڑی یا اینٹوں وغیرہ کی وہ سیڑھی جیسی کرسی جس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر امام یا واعظ خطبہ پڑھتا ہے۔

بدر: مدینہ منورہ سے تقریباً اسی 80 میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام ہے۔ جہاں زمانۂ جاہلیت میں سالانہ میلہ لگتا تھا۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ جس کے مالک کا نام ''بدر'' تھا، اسی کے نام پر اس جگہ کا نام ''بدر'' رکھ دیا گیا۔ اسی مقام پر جنگِ بدر کا وہ عظیم معرکہ ہوا جس میں کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان سخت خون ریز لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کو عظیم الشان فتح نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جنگِ بدر کا نام ''یوم الفرقان'' رکھا۔ اسلام کے 313 جان بازوں نے کفارِ مکہ کے ایک ہزار کے لشکر کو مات دی حالاں کہ مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے تھے یعنی فوج میں سوار سپاہیوں کی تعداد 2 تھی۔ شمشیریں اور تلواریں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

فدیہ: کسی جنگ میں قید کیے گئے افراد کو آزاد کرانے کے لیے جو رقم یا کوئی اور چیز ادا کی جاتی ہے اسے فدیہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شرعی عذر کے بغیر روزہ چھوڑنے پر جو رقم ادا کی جاتی ہے یا مسکینوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، اسے بھی فدیہ کہتے ہیں۔

جہیز: اسباب، سامان، وہ ساز و سامان، زیور، کپڑا، فرنیچر وغیرہ جو لڑکی کو شادی کے وقت اپنے ماں باپ سے ملتا ہے۔

حضرت سعدؓ: سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاتح ایران کا تعلق قریش کے قبیلہ بنو زہرہ سے تھا جو محمد خاتم النبیین ﷺ کا ننھیالی خاندان ہے اس لیے آپ رشتے میں حضور نبی اکرم خاتم النبیین ﷺ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ حمزہؓ بن عبدالمطلب کی والدہ آپؓ کی سگی پھوپھی اور حضور اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ کی چچازاد بہن تھیں۔ ہجرت مدینہ سے 30 برس پہلے پیدا ہوئے۔ نزولِ وحی کے ساتویں روز ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ترغیب دلانے پر مشرف بااسلام ہوئے۔ عمر بھر حضور خاتم النبیین ﷺ کے محافظِ خصوصی کے فرائض انجام دیے۔ آپ کی کنیت ابواسحاق ہے۔ یہ ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جن کو نبی اکرم خاتم النبیین ﷺ نے جنت کی بشارت دی۔ حضور نبی اکرم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ تمام معرکوں میں حاضر رہے۔

رحم: مہربانی، شفقت، ہمدردی، کسی کے دکھ پر دل میں رقت اور ہمدردی پیدا ہونے کی کیفیت

حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ابراہیم بن محمد حضور پاک خاتم النبیین ﷺ اور ماریہ قبطیہؓ کے بیٹے تھے۔ آپ سن 8ھ میں پیدا ہوئے اور کم و بیش ڈیڑھ سال زندہ رہے۔ اُن کا نام حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا تھا۔ عرب کی روایت کے مطابق بچپن میں آپ کو پرورش و نگہداشت کے لیے اُم سیف نامی دائی کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کی نمازِ جنازہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے خود پڑھائی اور انھیں مدینہ منورہ کے جنت البقیع قبرستان میں دفن کیا گیا۔

سبق کا خلاصہ

اخلاق کا اہم پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے عمل پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے پسندیدہ اخلاقی پہلو پر اس طرح کاربند رہے کہ لوگ یقین کر لیں کہ یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں استقامت اور مداومت کے اصول پر قائم رہے۔ سنت انھی افعال کا نام ہے جن پر آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیشہ عمل فرمایا اور بغیر کسی قوی وجہ کے ترک نہ کیا۔

حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے، مصافحہ اور گفت گو میں بھی دوسروں کی رعایت فرماتے تھے۔ دوسروں کی بات غور سے سنتے، مجلس میں عاجزی سے بیٹھتے۔ سردی میں بھی خدمت میں لائے گئے پانی میں برکت کے لیے ہاتھ ڈالنے سے انکار نہ کرتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ لوگوں کی ناگوار باتیں برداشت کرتے تھے۔ ایک بار زعفران لگا کر آنے والے شخص کو براہِ راست کچھ کہنے کی بجائے اس کے جانے کے بعد لوگوں کے ذریعے وہ رنگ دھو ڈالنے کو کہا۔ مسجدِ نبوی میں جگہ کم ہوتی تھی اس لیے بعد میں آنے والوں کے لیے آپ خاتم النبیین ﷺ اپنی چادر بچھا کر جگہ فراہم کرتے۔ کسی کی ناپسندیدہ بات پر اسے براہِ راست ٹوکنے کی بجائے فرماتے کہ لوگ ایسا کہتے یا ایسا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ شخصِ مخصوص کو ذلت سے بچانے کے لیے ہوتا تھا۔

آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق کا نمایاں پہلو ایثار تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو اپنی اولاد، خاص طور پر حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے بے انتہا محبت تھی۔ انھیں دیکھ کر آپ خاتم النبیین ﷺ محبت سے کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ حضرت فاطمہ کے پاس کوئی خادمہ نہ تھی اس لیے سارے مشقت طلب کام آپؓ خود کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرتِ علیؓ کے ذریعے انھوں نے آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے ایک کنیز کی درخواست کی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا جب تک اصحابِ صفہ کا بندوبست نہ ہو جائے، کسی اور طرف توجہ نہیں دی جا سکتی۔

حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ گھر کے کام کاج خود کرتے تھے۔ کپڑوں کو پیوند لگاتے، جھاڑو دیتے، سودا لاتے، جوتا گانٹھتے اور غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ لوگوں کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہونے کی تاکید کرتے،

غریبوں اور بیماروں کی عیادت کرتے۔ صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس طرح بیٹھتے کہ کوئی امتیاز نظر نہ آتا۔ مجمع میں جہاں جگہ ملتی، بیٹھ جاتے۔ ایک شخص نبوت کے رعب سے کانپنے لگا تو اسے تسلی دی کہ میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھاتی تھی۔

آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں پر شفقت فرماتے اور انھیں خود سلام کرتے، سفر سے واپسی پر راستے میں ملنے والے بچوں کو سواری پر بٹھا لیتے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چھوٹی لڑکی کی حَسَنہ کی بجائے حبشی زبان میں سَنہ کہہ کر تعریف کی۔ ایک غزوہ میں مشرکین کے چند بچے مارے گئے تو آپ خاتم النبیین ﷺ بہت آزردہ ہوئے اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔ فصل کا نیا میوہ محفل میں سب سے چھوٹے بچے کو پہلے دیتے۔ آپ ﷺ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے۔

آپ خاتم النبیین ﷺ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ کی اطاعت شعاری کی وجہ سے انھیں ''دو کان والے'' کہہ کر پکارا۔ ان کے چھوٹے بھائی ابوعمیر کا پالتو مولا مر گیا تو وہ رنجیدہ ہو گئے۔ انھیں تسلی دینے کے لیے فرمایا ''تمھارے مولے نے یہ کیا کیا؟'' ایک شخص نے سواری کی درخواست کی تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے کہا تمھیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ اس نے کہا میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟ ایک بڑھیا دعا کی درخواست لے کر آئی کہ اسے جنت نصیب ہو۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اسے بتا دو کہ بوڑھی عورتیں جوان ہو کر جنت میں جائیں گی۔

زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نامی ایک بدوی صحابی، ایک مرتبہ شہر میں اپنی چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے پیچھے جا کر انھیں گود میں دبا لیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے مذاقاً فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟

ایک شخص نے اپنے بھائی کے پیٹ میں گرانی کی شکایت کی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے شہد پلانے کا کہا۔ تین بار شہد پلایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ چوتھی بار وہ شخص شکایت لے کر آیا تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا۔ **''خدا سچا ہے، شہد میں شفا ہے لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔''** اب کی بار پلایا تو شفا ہو گئی۔

رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بہت محبت تھی۔ سفر پر روانگی کے وقت سب سے آخر میں اور واپسی پر سب سے پہلے آپ خاتم النبیین ﷺ انھی سے ملاقات فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حسنین کریمینؓ کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکا لیے۔ ایک غزوہ سے واپسی پر آپ خاتم النبیین ﷺ خلافِ معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے۔ حضرت فاطمہ نے فوراً چاندی کے کنگن اتروا دیے اور پردے بھی ہٹا دیے۔ آپ ﷺ نے چاندی کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لانے کا حکم دیا۔

حضرت فاطمہؓ جب آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں آتیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ حسنین کریمینؓ کو محبت سے ''میرے گل دستے'' فرماتے۔ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے امام حسینؓ کو لڑکھڑاتے آتے دیکھا تو منبر سے اتر کر انھیں گود میں اٹھا لیا۔ فرمایا **''حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔''** ایک بار کسی نے حسنین کریمینؓ میں سے کسی کو دوشِ مبارک پر دیکھ کر کہا۔ ''کیا سواری ہاتھ آئی ہے۔'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''سوار بھی کیسا ہے۔ ایک دفعہ حضرت حسینؓ کو سینے سے لپٹا کر فرمایا ''حسین میرا ہے، میں اس کا ہوں۔'' ان کو گود میں لے کر فرماتے **''اے اللہ! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔''**

بدر کے قیدیوں میں حضرت زینبؓ کے شوہر بھی تھے۔ ان کا فدیہ ادا کرنے کے لیے حضرت زینبؓ نے اپنا وہ ہار بھیج دیا جو حضرت خدیجہؓ نے ان کو جہیز میں دیا تھا۔ آنحضرت خاتم النبیین ﷺ ہار دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور صحابہؓ کی رائے اور مرضی سے ہار واپس بھجوا دیا۔

آپ خاتم النبیین ﷺ کی نواسی حالتِ نزع میں آپ خاتم النبیین ﷺ کی گود میں تھیں، آپ

خاتم النبیین ﷺ کے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعدؓ کے استفسار پر فرمایا کہ یہ بندوں کے دلوں میں ڈالا ہوا رحم ہے۔ اپنے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر بھی فرمایا: ''آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غم زدہ ہے لیکن زبان سے وہی کہیں گے جو خدا کو پسند ہے۔''

مرکزی خیال

اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس عمل کو پسند کرے اس پر مستقل مزاجی سے کار بند رہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی زندگی سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ ایثار، تواضع، بچوں پر شفقت، لطفِ طبع اور اولاد سے محبت آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے چند نمایاں پہلو ہیں۔ سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی۔ چناں چہ ہر سنت آپ خاتم النبیین ﷺ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی مثال ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

(جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

اخلاق کا سب سے ضروری پہلو مداومتِ عمل ہے۔ سیرتِ طیبہ میں تمام سنن آپ خاتم النبیین ﷺ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی مثالیں ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ لوگوں سے میل جول میں ان کے مزاج اور عزتِ نفس کا لحاظ رکھتے تھے۔ دوسروں کو سمجھانے کا انداز بھی مصلحت سے بھرپور ہوتا تھا۔ گھر کے کام کاج آپ خاتم النبیین ﷺ خود کر لیتے اور مجلس میں دوسروں سے ممتاز مقام پر نہ بیٹھتے تھے۔ فصل کا نیا میوہ سب سے پہلے مجلس کے کم عمر ترین بچے کو عنایت فرماتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے۔ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں اپنے گل دستے کہتے تھے۔ رحم دلی کا یہ عالم تھا کہ اپنی نواسی کو حالتِ نزع میں دیکھ کر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اپنے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ کی وفات پر فرمایا کہ رنج و الم کے باوجود ہم ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے جو خدا کو ناپسند ہو۔

عبارت نمبر 1

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوق صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرتاً اس پر مجبور ہے۔ اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاقِ حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی اس شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل، پھول سے خوش بو، کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔

حوالۂ متن

سبق کا عنوان:	اخلاقِ نبوی ﷺ
مصنف کا نام:	علامہ شبلی نعمانیؒ
ماخذ:	سیرت النبیؐ جلد دوم
صنف:	سیرت نگاری

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے جس میں مداومتِ عمل کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے حسنِ خلق، ایثار، تواضع، بچوں پر شفقت، لطفِ طبع اور اولاد سے محبت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں مداومتِ عمل کے اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ دوسروں سے ملاقات اور بات چیت میں آپ خاتم النبیین ﷺ بہت وضع داری اور مروت کا خیال رکھتے تھے۔ لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور عمومیت کا انداز اپناتے ہوئے لوگوں کی بُری باتوں کی اصلاح فرماتے تھے۔ گھر کے کام کاج جیسے کپڑوں کو پیوند لگانا، جھاڑو دینا، بکریوں کا دودھ دوہنا، جوتے گانٹھنا اور بازار سے سودا سلف لانا وغیرہ آپ خاتم النبیین ﷺ خود کر لیتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کرتے اور مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ دوسروں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور ان کے صاحب زادوں سے بہت محبت تھی۔ فرماتے تھے حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور بے ساختگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ استقامتِ حال سے مُراد ہے کہ انسان اپنے اخلاقی اصولوں پر ثابت قدم رہے اور مداومتِ عمل سے مُراد ہے کہ انسان ان اصولوں پر مسلسل عمل کرتا رہے اور ان کو ترک نہ کرے۔ استقامتِ حال اور مداومتِ عمل اخلاق کی نہایت اہم اور بنیادی صفات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس نیک عمل یا اخلاقی خوبی کو اختیار کرے، اس پر ہمیشہ کاربند رہے اور اس پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہے۔ انسان اس اخلاقی خوبی پر اس درجہ ثابت قدم اور مستقل مزاج رہے کہ وہ عمل یا اخلاقی خوبی اس کی فطرت کا حصہ بن جائے اور وہ عمل اس کی شخصیت میں اس قدر رچ بس جائے کہ وہ خوبی خود بخود ظاہر ہونا شروع ہو جائے۔ لوگ اس کے بارے میں یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے برعکس کوئی اور کام ہو ہی نہیں سکتا۔ بقول شاعر:

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے　　قدم قدم پہ وہ اِک شمعِ راہ پیدا کر　　(جگر مرادآبادی)

اخلاق کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انسان جو اچھا کام یا اخلاقی پہلو اختیار کرے، اس پر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ یہاں تک کہ وہ عمل اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ فطرت ثانیہ انسان کی وہ عادت ہوتی ہے جو قدرتی نہ ہو بلکہ مسلسل تربیت سے اس کی شخصیت کا حصہ بن جائے۔ انسان کو اپنے اخلاقی اصول پر بھی اس طرح کاربند رہنا چاہیے کہ وہ اس کی شخصیت کا حصہ بن جائے اور اسے کسی صورت جدا نہ کیا جا سکے۔ حضرت علیؓ کا فرمانِ مبارک ہے:

قَلِيلٌ تَدُومُ عَلَيهِ أَرْجَى مِنْ كَثِيرٍ مَمْلُولٍ مِنهُ.

ترجمہ: ''وہ تھوڑا عمل جو پابندی سے بجالایا جائے، اُس کثیر عمل سے زیادہ مفید ہے جس سے دل اُکتا جائے۔''

دنیا کی دوسری مخلوقات جیسے جانور، درخت، پہاڑ، چرند، پرند وغیرہ صرف ایک ہی طرح کے کام کر سکتی ہیں۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق ایک ہی کام کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ شرف صرف انسان کو حاصل ہے کہ وہ مختلف قسم کے کام ایک ہی وقت میں کر سکتا ہے۔ انسان اور دوسری مخلوقات میں یہی فرق ہے۔ مثال کے طور پر ایک درخت ہمیشہ پھل ہی دے گا۔ سورج ہمیشہ روشنی دینے پر مجبور ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے عمل کا خود انتخاب کر سکتا ہے۔ یہ اختیار انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتا اور برتر

بناتا ہے۔ فرشتے بھی صرف وہی کام کرنے پر مجبور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ لگائے ہیں۔ وہ اپنے لیے کسی عمل کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ یہ اختیار صرف انسان کو حاصل ہے کہ وہ اچھے عمل کے ذریعے باقی تمام مخلوقات سے بہتر بن سکتا ہے۔ بقول الطاف حسین حالی

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

اخلاق کا ایک گہرا نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اچھے اخلاق کا جو پہلو اختیار کرے اس پر پوری لگن کے ساتھ قائم رہے۔ وہ اپنے اخلاقی اصولوں پر ہر حال میں عمل پیرا رہے۔ وہ عمل اس کی فطرت کا مستقل حصہ بن جائے اور چاہنے کے باوجود بھی اسے چھوڑ نہ سکے۔ یہاں تک کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ کوئی اور عمل سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس کے افعال اس کی پہچان بن جائیں۔ مثال کے طور نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ ہمیشہ سچ بولتے اور امانت داری فرماتے اور اس پر اس شدت سے عمل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بدترین دشمنوں کو بھی یقین تھا کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سچ اور امانت داری کے علاوہ دوسرا طرز عمل اختیار کر ہی نہیں سکتے۔ جس طرح سورج کا نام آتے ہی روشنی کا تصور اُبھرتا ہے کیوں کہ سورج کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ روشنی دیتا ہے۔ درخت کی پہچان ہے کہ ہمیشہ پھل دیتا ہے اور پھول کے نام کے ساتھ خوش بو کا تصور وابستہ ہے کیوں کہ پھول کی پہچان اس کی خوش بو ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان سے سرزد ہونے والے افعال اس کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اخلاق و عمل کے اسی پہلو کو استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہا جاتا ہے۔ یعنی حسنِ عمل کا کوئی ایک پہلو کسی شخص سے اس طرح وابستہ نظر آئے کہ اس شخصیت کا نام اس خوبی کے تصور سے الگ نہ کیا جا سکے، اسے اصطلاحاً ''مداومتِ عمل'' کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے مصنف نے استقامتِ حال بھی کہا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ خاتمُ النّبیین ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ دعا پڑھا کرو:

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِي وَسَدِّدْنِي (صحیح مسلم:6911)

ترجمہ: اے اللہ مجھے ہدایت عطا فرما اور (ہر معاملے میں) مجھے درستی پر قائم رکھ

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس میں عقائد اور عبادات کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق میں استقامت اور مداومت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ کسی عمل یا اخلاقی پہلو پر قائم رہنا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ایک بہت پسندیدہ طرزِ عمل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہتے ہیں، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

(سورۃ الاحقاف:13)

استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی اہمیت اس حدیثِ مبارکہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جس میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ

''اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ عمل ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں، چاہے وہ تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔'' (رواہ البخاری و مسلم)

عبارت نمبر 2

حضرت محمد رسول اللہ خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اُصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے شروع فرمایا اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ سنت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے۔ سنت وہ فعل ہے، جس پر حضرت محمد رسول اللہ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا۔ اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے آغاز سے لی گئی ہے۔ اس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ اخلاق کا سب سے مقدم پہلو یہ ہے کہ آدمی

جس کام کو اختیار کرے اس پر ثابت قدمی سے قائم رہے، اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ حضورِ اکرم خاتمُ النّبیین ﷺ بھی اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ حضورِ اکرم خاتمُ النّبیین ﷺ کسی سے ملتے وقت ہمیشہ خود سلام اور مصافحہ فرماتے اور دوسروں کی بات پوری توجہ سے سنتے تھے۔ لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور ان کی اصلاح کے لیے ایسا طریقہ اختیار فرماتے جس سے ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ بچوں پر نہایت شفقت فرماتے اور انھیں خود سلام کرتے۔ کافروں اور مشرکوں کے بچوں پر بھی بہت لطف فرماتے تھے۔ موسم کا نیا پھل سب سے پہلے محفل کے کم عمر ترین بچے کو عنایت فرماتے تھے۔ طبیعت میں لطافت تھی اس لیے دوسروں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ طبیعت میں نرم دلی بھی بہت زیادہ تھی۔ شدید غم اور دکھ کی کیفیت میں بھی منھ سے وہی بات نکالتے جس کو خدا پسند کرتا ہے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

اسلام صرف عقائد اور عبادات کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ لوگوں کو حسنِ اخلاق کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاقِ حسنہ کا جو پہلو اختیار کرے اس پر سختی سے کاربند رہے۔ انسان حسنِ خُلق کے اس پہلو کی اس شدت سے پابندی کرے کہ لوگ یقین کر لیں کہ اس انسان سے اس کے علاوہ کوئی اور بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہا جاتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں استقامت اور مداومتِ عمل کے اصول کی پابندی فرماتے تھے۔

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کے ہر کام میں استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کا اصول نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے جو کام جس وقت شروع کیا، اس پر پوری مضبوطی اور تسلسل کے ساتھ قائم رہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر ہماری شریعت میں ''سنت'' کا تصور پیدا ہوا ہے۔ سنت کا مطلب وہ عمل یا طریقہ ہے جو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ہمیشہ اپنایا اور بغیر کسی مضبوط وجہ کے اسے ترک نہیں کیا۔ یعنی سنت صرف ایک عمل نہیں ہے بلکہ یہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی زندگی کا ایک مستقل اور مسلسل طریقۂ کار ہے۔ اس لیے تمام سنتیں درحقیقت آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی شان دار مثالیں ہیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب:21)

ترجمہ: ''بے شک نبی پاک ﷺ کی ہستی میں تمھارے لیے احسن نمونہ موجود ہے۔''

استقامت کا مطلب ہے کسی کام کو کرنے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا۔ مداومت کا مطلب ہے کسی عمل کو مسلسل جاری رکھنا۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نے اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس اصول کی پابندی فرمائی ہے۔ چاہے وہ عبادات ہوں، معاملات ہوں یا معاشرتی تعلقات، ہر جگہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ایک مستقل اور متوازن طریقۂ کار اپنایا۔

مثال کے طور پر نماز کی ادائیگی میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ہمیشہ مداومتِ عمل کا اصول اپنایا اور اسے کبھی ترک نہیں کیا۔ اسی طرح روزہ، جہاد، حج جیسی عبادات میں بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے اسی طریقہ کار کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اسی

طرح اخلاقی معاملات جیسے سچ بولنا، امانت داری، رحم دلی، عدل وانصاف، تواضع، ایثار اور ہمدردی وغیرہ میں بھی ہمیشہ یہی معیار برقرار رکھا۔ مثال کے طور پر صداقت اور امانت داری پر آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نے مداومت فرمائی۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے جانی دشمن بھی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کو صادق اور امین تسلیم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کی وجہ سے آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کرنی پڑی، اُن کی امانتیں بھی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ سچ بولیں گے اور امانت داری کا مظاہرہ کریں گے۔ ہجرت کے وقت بھی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے پاس امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نے حضرت علیؓ کے ذمہ لگایا کہ یہ امانتیں جن کی ہیں انھیں دے کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی ہے۔

چناں چہ سنت صرف ایک رسم یا روایت نہیں بلکہ یہ رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کی زندگی کا ایک مستقل اور مسلسل طریقۂ کار ہے جس کی پیروی ضروری ہے۔ آنحضور خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں بھی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کے اصول کو اپنانا چاہیے۔ اسلام میں عمل کی بہت اہمیت ہے۔ وہ عمل جو مسلسل جاری رہے، زیادہ مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی ایسا عمل زیادہ پسند ہے۔ آنحضور خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ

"اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ عمل ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں، چاہے وہ تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔" (رواہ البخاری ومسلم)

دراصل عملِ پیہم یعنی مسلسل عمل کا اثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ ایمان ویقین کے ساتھ عملِ پیہم ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اسی سے قوموں کی تقدیر بدلتی ہے اور قومیں عروج حاصل کرتی ہیں۔ بقول اقبالؒ:

یقیں محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

عبارت نمبر 3

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے۔ کوئی شخص جھک کر آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے۔ مصافحے میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے تھے۔

اکثر نوکر، چاکر، لونڈی، غلام خدمتِ اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ اس میں ہاتھ ڈالیں تاکہ متبرک ہوجائے۔ جاڑوں کا دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کبھی انکار نہ فرماتے۔

سیاق وسباق

یہ اقتباس سبق کے ابتدائی حصے سے لیا گیا ہے۔ تشریح طلب عبارت سے قبل بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اسے استقامت حال یا مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ آنحضور خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضور خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ آنحضور خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے تھے۔ ایثار، تواضع، بچوں پر شفقت، لطفِ طبع اور اولاد سے محبت جیسے اعلیٰ اخلاق آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کی سیرت کے نمایاں پہلو تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کسی کی دل آزاری نہ فرماتے۔ مسجدِ نبوی میں جگہ کم ہوتی تھی۔ کوئی بعد میں آتا تو

آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ اس کے لیے اپنی چادر بچھا کر جگہ دیتے تھے۔ کسی کی بات بُری معلوم ہوتی تو اس کا نام لے کر براہِ راست نہ ٹوکتے کہ اسے ذلت محسوس نہ ہو بلکہ نصیحت کا عمومی انداز اختیار فرماتے اور اس کی اصلاح کردیتے تھے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش وخروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف نبی کریم خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے اخلاق وسیرت کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے مطابق نبی کریم خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نہایت اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ انتہائی نرم مزاج، خوش گفتار اور نیک سیرت تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ ہمیشہ ہر کسی سے نرمی اور شفقت سے پیش آتے اور کبھی کسی سے سختی نہیں کی۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ ابتدا ہی سے اچھی سوچ کے مالک تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کا بچپن بھی اُجلا تھا اور جوانی بھی بے داغ تھی۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نے کبھی کسی ایسے کھیل میں حصہ نہ لیا جو اہلِ نظر کی نگاہوں میں بُرا ہو۔ کبھی زبان سے بے ہودہ بات نہیں نکالی۔ کسی کو بددعا نہیں دی، کسی پر لعنت نہیں کی اور نہ کبھی کسی کا نام بگاڑا۔ اگر کوئی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کو ناز یبا بات کہہ دیتا تو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ خاموش ہوجاتے۔ کسی سے بدلہ نہ لیتے اور نہ کسی سے غصہ فرماتے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَۃِ، اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: **"پہلوان وہ نہیں ہے جو کشتی لڑنے میں غالب ہوجائے بلکہ اصلی پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے۔"**

آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ بطور محمد بن عبداللہ بھی فکر وخیال کے لحاظ سے دنیا کے سب سے بہترین انسان ہیں اور بطور محمد رسول اللہ بھی سب سے افضل رسول ہیں۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کو دیکھنے والوں نے کہا، آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ سے قبل نہ ہم نے ایسا دیکھا اور نہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے بعد کوئی دیکھا۔ بقول شاد عظیم آبادی:

ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا — اسی قدر ہوئی حیرت جس قدر سمجھا

آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کبھی کسی کی دل آزاری یا دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ ہمیشہ لوگوں کی عزت واحترام کرتے تھے اور ان کے ساتھ ہمیشہ محبت وشفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے ملنے جلنے کا معمول یہ تھا کہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کسی سے ملتے تو پہلے خود سلام کرتے اور مصافحہ بھی خود فرماتے تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ لوگوں کی باتوں کو پوری توجہ اور اہمیت دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص جھک کر آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے کان میں کوئی بات کہنا چاہتا تو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ اس کی طرف سے اس وقت تک چہرہ مبارک نہ ہٹاتے جب تک کہ وہ خود منہ نہ ہٹالیتا۔ ہاتھ ملانے میں بھی آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کی یہی عادت مبارک تھی کہ کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کا ہاتھ مبارک نہ چھوڑتا، آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ اس سے اپنا ہاتھ مبارک نہ چھڑاتے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ ہمیشہ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ برابری کا سلوک فرماتے تھے۔ جب آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ مجلس میں بیٹھتے تو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کے زانو مبارک کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے تھے اور نہ مجلس میں آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کبھی پاؤں پھیلا کر بیٹھتے۔ یہ حسنِ عمل آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ کی عاجزی اور تواضع کا مظہر تھا۔

الغرض آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ صدق وصفا کے پیکر تھے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن ﷺ نے دنیا کو اخلاق اور

کردار کی رفعتیں عطا کیں اور نگاہ و دل کی پاکیزگی بھی عطا کی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ہمیشہ لوگوں پر مہربانی فرماتے اور ان کے کام آتے۔ یہ تمام خوبیاں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی اخلاقی بلندی اور انسانیت کے لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی بے پناہ محبت اور شفقت کی عکاسی کرتی ہیں۔

کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت　　اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآں　　(ماہر القادری)

مصنف کہتے ہیں کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی بعثت سے قبل نوکروں اور غلاموں سے ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ان دکھی دلوں کی دل جوئی کی اور مصیبتوں کے مارے طبقے کی دل نوازی کی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی بہترین مثالیں قائم کیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم اور خدمت گزار، اکثر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پانی لے کر آتے تھے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اس میں اپنا مبارک ہاتھ ڈال دیں تاکہ پانی بابرکت ہو جائے۔ حالاں کہ صبح کے وقت سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالنا بے حد دشوار ہوتا تھا لیکن آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے خدمت گزاروں کی دل جوئی کے لیے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ مبارک ڈال دیتے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کبھی انکار نہ فرماتے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم اور خدمت گزار آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بھی ان سے نہایت شفقت و محبت کا سلوک کرتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے چاہنے والوں کی دل جوئی کے لیے ہر حالت میں ان کا خیال رکھتے تھے۔

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے عظیم اخلاق اور حسنِ سلوک کا نتیجہ تھا کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔ جو عقیدت و نسبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سے تھی، دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ محبتِ رسول ایمان کا حصہ ہے، اس محبت کے بغیر ایمان ناقص ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم محبتِ رسول کی بلندیوں پر فائز تھے۔ وہ معمولی سے اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بقول احمد رضا خاں بریلویؒ:

حسنِ یوسف پر کٹیں مصر میں انگشتِ زناں　　سر کٹاتے ہیں تیرے نام پہ مردانِ عرب

عبارت نمبر 4

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے۔ کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اُس کے سامنے اُس کا تذکرہ نہ فرماتے۔ ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے کچھ نہ فرمایا جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ اُن سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے ابتدائی حصے سے لی گئی ہے۔ اس میں مصنف آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ تشریح طلب عبارت سے قبل بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا معمول تھا کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سلام میں پہل فرماتے، کسی سے ہاتھ ملاتے تو خود ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ایثار، تواضع، بچوں پر شفقت، لطفِ طبع اور اولاد سے محبت جیسے اعلیٰ اخلاق آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے نمایاں پہلو ہیں۔ مسجد نبوی میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے آپ

خاتمُ النّبیین ﷺ دوسروں کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے تھے۔ کسی کی بُری بات پر اسے براہِ راست ٹوک کر شرمندہ نہیں کرتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا سے بے انتہا محبت تھی۔ بہت دکھ اور غم کی حالت میں بھی جب آنکھیں آنسو بہا رہی ہوتی تھیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے منہ سے وہی باتیں نکلتی تھیں جن کو خدا پسند کرتا ہے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق بتا رہے ہیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی طبیعت میں انتہا درجے کا تحمل اور برداشت تھی۔ انسان کے اخلاق کی پہچان اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ کسی ناگوار بات یا خلافِ مزاج واقعہ پر کس طرح کے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے یا مشتعل ہو جاتا ہے۔ انسان کے اخلاق کا انحصار اس کے جذبات کے اعتدال یا توازن اور باقاعدگی پر ہوتا ہے۔ حضور اکرم خاتمُ النّبیین ﷺ کی شخصیت کی خوبی یہ تھی کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے سامنے اگر کوئی ناگوار بات ہوتی یا کسی سے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے مزاج کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اسے تحمل سے برداشت کرتے اور کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہ فرماتے۔

مصنف مزید بیان کرتے ہیں کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے مزاج کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو کسی کی کوئی بات بری لگتی اور آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اس کی اصلاح کرنا چاہتے یا لوگوں کو اس پر متنبہ کرنا چاہتے تو مجمع عام میں کسی کا نام لے کر اس کی خامی بیان نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا انداز نہایت حکیمانہ ہوتا تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اس انداز میں بیان فرماتے کہ لوگوں تک بات بھی پہنچ جائے، کسی کا دل بھی نہ دُکھے اور کسی کو ذلت بھی محسوس نہ ہو۔

ایک دفعہ ایک شخص مجلس میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرب کے رواج کے مطابق اپنے کپڑوں پر زعفران لگا رکھی تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو اس شخص کا یہ عمل پسند نہ آیا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے اس کے سامنے اپنی ناپسندیدگی اور ناگواری کا اظہار نہ فرمایا اور نہ ہی اپنے رویے سے ناپسندیدگی ظاہر ہونے دی۔ ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ مردوں کی خوش بو میں رنگ نہ ہو اور عورتوں کی خوش بو تیز نہ ہو۔ دراصل زعفران نہایت خوش بودار زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ ان صاحب نے اپنے کپڑوں پر زعفران لگا رکھی تھی۔ جس کا رنگ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے کپڑوں پر لگی ہوئی زعفران کو ناپسند فرمایا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

"مردوں کی خوش بو وہ ہے جس کی مہک پھیل رہی ہو اور رنگ چھپا ہُوا ہو اور عورتوں کی خوش بو وہ ہے جس کا رنگ ظاہر ہو لیکن مہک اس کی چھپی ہوئی ہو۔" (سنن ترمذی: حدیث 2787)

جب وہ صاحب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے مجلس میں موجود لوگوں کو فرمایا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔ چوں کہ مردوں کے لیے رنگ والی خوش بو جائز نہیں تھی اس لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے منع فرما دیا۔ بقول شاعر:

خطا کار بندوں پہ لطفِ مسلسل　　شفاعت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

عبارت نمبر 5

مسجدِ نبوی خاتمُ النّبیین ﷺ میں جگہ بہت کم ہوتی تھی جو لوگ پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے تھے، اُن کے بعد جگہ باقی

نہیں رہتی تھی۔ ایسے موقعے پر اگر کوئی آ جاتا تو اُس کے لیے آپ خاتم النبیین ﷺ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔

کسی کی کوئی بات بُری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اُس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ لوگ ایسا کہتے ہیں بعض لوگوں کی یہ عادت ہے۔ یہ طریقۂ ابہام اس لیے اختیار فرماتے تھے کہ شخصِ مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آ جائے۔

سیاق وسباق

یہ عبارت سبق کے ابتدائی حصے سے لی گئی ہے۔ اس میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے حسنِ خلق کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے عمل کرے۔ اسی کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا معمول تھا کہ سلام میں پہل کرتے، مجلس میں دوسروں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے، لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت کرتے اور سلیقے سے ان کی اصلاح بھی کر دیتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ایثار، تواضع، بچوں پر شفقت، لطفِ طبع اور اولاد سے محبت جیسے اوصاف آپ خاتم النبیین ﷺ کی سیرت کے نمایاں پہلو تھے۔ ایثار کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاطمہؓ جن سے بے حد محبت تھی کو کنیز کی ضرورت تھی، لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ نے پہلے اصحابِ صفہ کی ضرورت کا خیال رکھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ مسکینوں اور غریبوں کے ساتھ جا کر بیٹھ جاتے۔ کفار اور مشرکین کے بچوں پر لطف و کرم فرماتے تھے۔ حضرت امام حسینؓ سے بہت محبت تھی۔ فرماتے تھے: ''حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔''

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں دنیوی ٹھاٹ باٹ اور نمود و نمائش نہیں ہوتی تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے رعبِ نبوت اور جلال و ہیبت کا یہ عالم تھا کہ مجلس میں بیٹھا ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پیغمبر خاتم النبیین ﷺ کی موجودگی میں اونچی آواز سے بات کرنے کو خلافِ ادب تصور کرتے تھے۔ اس لیے آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں ان مقدس نفوس کے بیٹھنے کی منظر کشی یوں کی گئی ہے کہ یہ حضرات آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں یوں بے حس و حرکت تشریف فرما ہوتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ:

''صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم غلبۂ رعب اور باعثِ ادب، دربارِ رسالت میں بنا حرکت اس طرح تشریف فرما ہوتے کہ پرندے سروں پر بیٹھ جاتے۔''

حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی، دروازے پر کوئی دربان بھی نہیں تھا، تاکہ ہر شخص کی دربارِ نبی خاتم النبیین ﷺ تک رسائی ممکن ہو اور سہولت سے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر نبوت سے فیض یاب ہو سکے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بہت زیادہ تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں جگہ بہت کم ہوتی تھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ خاتم النبیین ﷺ سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور جو عقیدت

نسبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو آپ خاتم النبیین ﷺ سے تھی، دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ وہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس سے فیض یاب ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں جوق در جوق شریک ہوتے تھے۔ مجلس میں حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کے عظیم اخلاق کا منظر اور زیادہ حیرت انگیز بن جاتا، جب رحمتِ دو عالم خاتم النبیین ﷺ نبی آخر الزماں کی حیثیت سے رونق افروز ہوتے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جاں نثار و فرماں بردار غلاموں کی طرح آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی مبارک مجلس میں جو لوگ پہلے آ کر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بعد آنے والوں کے لیے جگہ باقی نہیں رہتی تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ فراخ دل تھے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی آ جاتا تو آپ خاتم النبیین ﷺ اس کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دیتے تھے۔ یوں آپ خاتم النبیین ﷺ اپنی مجلس میں شریک ہونے والے شخص کی عزت و تکریم کرتے کہ اس کے لیے اپنے کندھے مبارک سے چادر اتار کر بچھا دیتے، تاکہ وہ مٹی کے فرش پر نہ بیٹھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اپنے چاہنے والوں کی دل جوئی کے لیے ہر حالت میں ان کا خیال رکھتے تھے۔ بقول اسحاق جلال پوری:

آپ ﷺ نے سب کی رہنمائی کی ساری مخلوق سے بھلائی کی

ایک دفعہ آپ خاتم النبیین ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے اور آپ خاتم النبیین ﷺ مجلس میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں گوشت تقسیم فرما رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک عورت آئی اور آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے جب اس عورت کو دیکھا تو اسے بہت عزت و احترام سے نوازا۔ اس کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس کی باتیں پوری توجہ اور دھیان سے سنیں اور نہایت عزت و احترام سے انھیں رُخصت کیا۔ اس واقعہ کو روایت کرنے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے لوگوں سے اس عورت کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون تھیں؟ تو مجلس میں موجود لوگوں نے بتایا کہ یہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہؓ تھیں۔

انسان کے اخلاق کی پہچان اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ کسی کی ناگوار بات یا خلافِ مزاج واقعہ پر کس طرح کے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے یا مشتعل ہو جاتا ہے۔ انسان کے اعلیٰ اخلاق کا انحصار اس کے جذبات کے اعتدال یا توازن اور باقاعدگی پر ہوتا ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی شخصیت کی خوبی یہ تھی کہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے سامنے اگر کوئی ناگوار بات ہوتی یا کسی سے آپ خاتم النبیین ﷺ کے مزاج کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی تو آپ خاتم النبیین ﷺ اسے تحمل سے برداشت کرتے اور کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہ فرماتے۔ بقول شاعر:

ہے فلاحِ زیست کا سامان اسوہ آپ ﷺ کا کامیابی کا یہی اِک راستہ ہے بالیقین

مصنف مزید بیان کرتے ہیں کہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے مزاج کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جب آپ خاتم النبیین ﷺ کو کسی کی کوئی بات بری لگتی اور آپ خاتم النبیین ﷺ اس کی اصلاح بھی کرنا چاہتے یا لوگوں کو اس پر خبردار کرنا چاہتے تو مجمع عام میں کسی کا نام لے کر اس کی برائی بیان نہ فرماتے تھے۔ بلکہ آپ خاتم النبیین ﷺ کا انداز نہایت حکیمانہ ہوتا تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ صیغۂ تعمیم میں بات فرماتے تھے یعنی آپ خاتم النبیین ﷺ اس انداز میں بات بیان فرماتے کہ لوگوں تک بات بھی پہنچ جائے اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اور نہ ہی کسی کو ذلت محسوس ہو۔ مثلاً: آپ خاتم النبیین ﷺ فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا، یا لوگ ایسا کرتے ہیں، انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے وغیرہ۔ اس طرح جس میں وہ عیب موجود ہوتا، اس تک بھی بات پہنچ جاتی اور دیگر لوگ بھی اس سے باخبر ہو جاتے۔ اس سے کسی مخصوص شخص کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہوتی۔ گویا آپ خاتم النبیین ﷺ لوگوں کی نفسیات کے مطابق بات کرتے تھے۔ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ سب کے

سامنے اس کے عیب بیان کیے جائیں یا اس پر تنقید کی جائے۔ نصیحت کتنی ہی کارگر اور ضروری کیوں نہ ہو اگر اس میں مخاطب کی عزت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو وہ بے اثر ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے   کون سی بات کہاں، کیسے کہی جاتی ہے   (وسیم بریلوی)

عبارت نمبر 6

آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا ہو وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپ خاتم النبیین ﷺ کو بے انتہا محبت تھی اور ان میں حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں، فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تاہم حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عسرت اور تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں۔ ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں، خود تو پاسِ حیا سے عرضِ حال نہ کر سکیں، جناب امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا، ابھی اصحابِ صفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اس اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا معمول تھا کہ دوسروں کو سلام میں پہل کرتے اور مصافحہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پہلے نہ چھڑاتے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی تواضع، بچوں پر شفقت، لطفِ طبع اور اولاد سے محبت جیسے اعلیٰ اخلاق کے بارے میں بتاتے ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ گھر کے کام کاج اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ موسم کا نیا پھل سب سے پہلے محفل میں موجود سب سے کم عمر بچے کو عنایت فرماتے تھے۔ دوسروں سے مزاح کی باتیں بھی کرتے تھے۔ اولاد سے نہایت محبت تھی۔ سفر پر جانے سے پہلے اور واپسی پر حضرت فاطمہؓ سے ضرور ملاقات فرماتے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

اسلام میں عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اس کو استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اس اصول کی پابندی کرتے تھے۔ اسی لیے آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق سب سے اعلیٰ اور بے مثال تھے۔ قرآن مجید نے بھی آپ خاتم النبیین ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی تعریف فرمائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ   (سورۃ القلم آیت نمبر:4)

ترجمہ: اور بے شک آپ کے اخلاق بہت عظیم ہیں۔

آپ خاتم النبیین ﷺ کے حسنِ اخلاق میں ایثار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سیرتِ طیبہ کا جو وصف سب سے نمایاں ہے

ایثار ہی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے اس وصف یعنی ایثار کا اثر ہر موقع پر نظر آتا ہے۔ ایثار کا مطلب ہے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا۔ یعنی اپنی ضروریات اور خواہشات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی بھلائی کے لیے کوشش کرنا۔ قرآنِ مجید میں ایثار کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ   (سورۃ الحشر آیت نمبر:9)

ترجمہ: "اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، چاہے انھیں خود ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔

آنحضور خاتم النبیین ﷺ کو اولاد سے بے انتہا محبت تھی۔ اولاد میں حضرت فاطمہؓ سے خاص طور پر محبت تھی۔ اس محبت کا اندازہ اس فرمانِ رسول خاتم النبیین ﷺ سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

فَاطِمَۃُ بَضْعَۃٌ مِّنِّی ، فَمَنْ اَغْضَبَہَا اَغْضَبَنِی   (رواہ البخاری)

ترجمہ: "فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جو اسے ناراض کرے گا وہ مجھے ناراض کرے گا۔"

حضرت فاطمہؓ جب خدمتِ اقدس میں آتیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ محبت سے ان کا استقبال کرتے اور کھڑے ہو جاتے۔ ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی چادر مبارک بچھا کر انھیں اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ حضرت فاطمہؓ کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس کوئی خادمہ نہ تھی جو گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گھر کے سارے کام خود کرنے پڑتے تھے۔ روٹی پکانے کے لیے خود چکی پیس کر آٹا بناتیں۔ کنویں سے پانی کی مشک بھر کر لاتیں۔ مشک کا وزن اٹھا کر جسم مبارک پر نشان بن گئے تھے۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں بھی گھس گئی تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کے کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی تھی۔ سارے کام کاج کے لیے آپؓ کو ایک خادمہ کی ضرورت تھی۔ لیکن کبھی آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے عرضِ حال نہ کر سکیں۔

چناں چہ حضرت فاطمہؓ ایک دن آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ خاتم النبیین ﷺ کو اپنی ہتھیلیاں دکھائیں جو چکی پیس کر گھس چکی تھیں۔ آپؓ آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے کنیز مانگنا چاہتی تھیں لیکن پاسِ حیا سے کچھ کہہ نہ سکیں۔ ان کی طرف سے حضرت علیؓ نے سارا حال بتا کر آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے درخواست کی کہ غزوہ بنی المصطلق میں جو کنیزیں آئی ہیں، ان میں سے ایک کنیز انھیں بھی دے دیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے سارا حال دیکھ اور سُن کر ارشاد فرمایا:

"ابھی اصحابِ صفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔"

اصحابِ صفہ وہ غریب اور مسکین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جو مسجدِ نبوی کے ایک چبوترے (صُفّہ) پر رہتے تھے۔ یہ صحابہ کرام اپنی تمام تر توجہ دین کی خدمت، علم حاصل کرنے اور جہاد میں شرکت پر مرکوز رکھتے تھے۔ ان کا کوئی گھر بار نہ تھا۔ یہ فقر و فاقہ کی زندگی گزارتے تھے۔ دیگر صحابہ کرامؓ ان کی مدد کرتے تھے۔ ان کی کفالت آنحضور خاتم النبیین ﷺ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے ذمے تھی۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کو پورا کرنے پر آپ خاتم النبیین ﷺ خاص توجہ دیتے تھے۔ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لیکن 70 سے 400 اصحاب تک بتائی جاتی ہے۔

اس واقعے سے آنحضور خاتم النبیین ﷺ کا ایثار ظاہر ہوتا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اپنی عزیز ترین بیٹی حضرت فاطمہؓ کی ضرورت کو اصحابِ صفہ کی ضرورت پر قربان کر دیا اور اصحابِ صفہ کو ترجیح دی۔ یہ واقعہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی عظمتِ اخلاق کا عظیم مظہر ہے۔ اس واقعے سے سبق ملتا ہے کہ ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ ایثار کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

عبارت نمبر 7

گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جُوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، گدھے کی سواری سے آپ ﷺ کو عار نہ تھی، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔ ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہلِ عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو۔ غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے۔ مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے۔ صحابہؓ کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ ﷺ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں فرشتہ نہیں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

سیاق وسباق

یہ عبارت سبق کے قریباً وسط سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ سلام میں پہل کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک نمایاں پہلو ایثار ہے، آپ ﷺ اپنی اور اپنے خاندان کی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ بچوں پر شفقت، لطف، طبع اور اولاد سے محبت جیسے اعلیٰ اخلاق آپ ﷺ کی سیرت کے نمایاں پہلو تھے۔ آپ ﷺ بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ راستے میں بچے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے۔ مشرکین کے بچوں پر بھی بہت لطف وکرم فرماتے تھے۔ ایک غزوہ میں مشرکین کے چند بچے مارے گئے۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو بہت آزردہ ہوئے۔ موسم کا نیا پھل آتا تو محفل میں موجود سب سے کم عمر بچے کو پہلے عنایت فرماتے۔ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش وخروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں نبی کریم ﷺ کی تواضع اور سادگی کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی سادگی اور عاجزی کی بہترین مثال تھی۔ آپ ﷺ اپنے گھر کے کام کاج خود کرتے تھے۔ کپڑے پھٹ جاتے تو ان کو خود پیوند لگا کر استعمال کے قابل بنا لیتے تھے۔ آپ ﷺ کو صفائی بہت پسند تھی۔ اس لیے آپ ﷺ اپنے گھر کو بھی صاف ستھرا رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ اپنے گھر میں جھاڑو بھی خود دیتے تھے۔ اپنی بکریوں کی دیکھ بھال کرتے اور دودھ دوہنے کا کام بھی آپ ﷺ خود کر لیتے تھے۔ گھر کا سودا سلف بھی بازار سے لے آتے۔ یہاں تک کہ جوتی پھٹ جاتی تو اسے بھی خود گانٹھ لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ دنیوی شان وشوکت سے بے نیاز تھے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

اے مرے شاہِ شرق وغرب! نانِ جویں غذا تیری — اے میرے بوریا نشین! سارا جہاں گدا تیرا

آپ ﷺ کو نہ کسی بڑے مرتبے کی طلب تھی اور نہ ہی کسی خدمت گار کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

آپ ﷺ نے گھر کے کام کاج خود کرنے کو کبھی اپنے وقار کے خلاف نہیں سمجھا بلکہ ہر کام محنت اور عاجزی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ سواری کے انتخاب میں بھی آپ ﷺ نے کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا۔ عربوں میں گھوڑے کی سواری کو اچھا سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس سواری پر فخر محسوس کرتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو اگر گدھے پر سواری کرنی پڑتی تو بلا جھجک اس پر بیٹھ جاتے تھے۔ آپ ﷺ کے مزاج میں سادگی اور عاجزی تھی۔ غلاموں، مسکینوں اور ناداروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا آپ ﷺ کے مزاج کا حصہ تھا۔ ان کے ساتھ وقت گزارنے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے میں آپ ﷺ کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں، اللہ نے ان کو تمھارا ماتحت بنایا ہے، جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو، اسے چاہیے کہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے۔" (رواہ البخاری ومسلم)

اسی طرح مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے عائشہؓ مسکینوں سے محبت رکھو اور ان کے قریب رہو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمھیں اپنے قریب رکھے گا۔"
(جامع الترمذی، مشکوٰۃ المصابیح)

نبی کریم ﷺ خود تو اضع کا پیکر تھے اور انکساری اور مساوات کے اصولوں کو عام کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے۔ لوگ آپ ﷺ کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو روک دیا اور فرمایا کہ اہلِ عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

"کوئی شخص رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے ساتھیوں کے لیے محبوب نہ تھا لیکن جب لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے تو آپ ﷺ کے احترام میں کھڑے نہ ہوتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اسے ناپسند فرماتے ہیں۔"

نبی کریم ﷺ دوسروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ اس میں کسی امیر اور غریب کی تمیز نہ تھی۔ کوئی غریب سے غریب آدمی بیمار ہو جاتا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کرتے اور اسے تسلی دیتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کے بارے میں آپ ﷺ کی کئی احادیثِ مبارکہ بھی ہیں جن میں اس عمل کی فضیلت اور اس کے آداب بتائے گئے ہیں۔ آپ ﷺ نہ صرف خود بیماروں کی عیادت فرماتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔ حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ:

"کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ جو دن کے وقت شروع میں کسی مسلمان کی عیادت کرے مگر اس کے لیے ستر ہزار فرشتے شام تک مغفرت مانگتے رہتے ہیں۔"

آنحضور ﷺ کو اپنے کسی صحابی کی بیماری کی خبر ملتی تو آپ ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے اور اس کی صحت یابی کی دعا فرماتے تھے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:

"میں بیمار تھا تو نبی کریم ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے اور آپ ﷺ پیدل چل کر آئے اور میرے قریب بیٹھے پھر فرمایا: گھبراؤ مت، ان شاء اللہ یہ بیماری تمھارے لیے پاکی (کفارہ) ہوگی۔"

آپ ﷺ غریبوں اور فقیروں کے گھروں میں بھی جاتے اور ان کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ آپ ﷺ کی مجلس میں ہر شخص بلا جھجک بیٹھ سکتا تھا۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس طرح

بیٹھتے تھے کہ کوئی شخص امتیازی حیثیت کی بنا پر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو پہچان نہ سکتا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ ملتی، وہیں بیٹھ جاتے اور دوسروں سے ممتاز ہو کر بیٹھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سے ملاقات کے لیے آیا، مگر نبوت کے جلال اور رعب کی وجہ سے کانپنے لگا۔ دراصل نبی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق ہوتا ہے۔ اللہ تو اللہ کے ساتھ تعلق اور قربت کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک خاص جلال اور رعب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی صداقت کی ایک دلیل ہوتی ہے۔ آنحضرت خاتمُ النّبیین ﷺ کی شخصیت کا نور اور جلال لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کرتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام، اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک یہودی عالم تھے۔ وہ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کا چہرہ دیکھتے ہی کہہ اٹھے:

"یہ چہرہ کسی جھوٹے شخص کا نہیں ہو سکتا۔"

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے اس شخص کو خوف زدہ دیکھا تو شفقت سے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ایک عام انسان ہوں۔ میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔ اس جملے سے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی سادگی، تواضع اور انکساری ظاہر ہوتی ہے۔

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور اخلاقِ حسنہ سے سبق ملتا ہے کہ بڑائی سادگی میں ہے، عظمت عاجزی میں ہے اور حقیقی مقام و مرتبہ دوسروں کے ساتھ محبت اور برابری کے ساتھ پیش آنے میں ہے۔

عبارت نمبر 8

بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے۔ راستے میں بچے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے۔

ایک دن حضرت خالد بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمتِ اقدس میں آئے۔ ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی اور سرخ رنگ کا کُرتا بدن پر تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا، سَنہ سَنہ۔ حبشی زبان میں حسنہ کو سَنہ کہتے ہیں۔ چوں کہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی اس لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے اس مناسبت سے حبشی تلفُّظ میں حسنہ کے بجائے سَنہ کہا۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے قریباً وسط سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اس اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے حسنِ اخلاق میں استقامت پائی جاتی تھی۔ آپ ﷺ مجلس میں لوگوں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے اور جگہ نہ ہونے کی صورت میں دوسروں کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دیتے تھے۔ اسی طرح آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے اخلاق و عادات میں سب سے نمایاں وصف ایثار ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک اور نمایاں پہلو تواضع ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ گھر کا کام کاج خود کرتے تھے۔ مفلسوں اور فقیروں کے ساتھ بیٹھنے میں بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو عار نہ تھی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ لوگوں سے ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے لیکن اس مذاق میں بھی جھوٹ نہیں ہوتا تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو اولاد سے نہایت محبت تھی۔ سفر پر جانے سے پہلے اور واپس آ کر حضرت فاطمہؓ سے ضرور ملتے تھے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بہت محبت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹاتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا "حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔"

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی بچوں پر شفقت و محبت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی ذات سراپا رحمت تھی۔ بچوں پر شفقت و محبت اس رحمت کی ایک مثال ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بچوں کو نہایت محبت اور نرمی سے نوازتے تھے۔ ان کے ساتھ شفقت بھرا برتاؤ فرماتے اور ان کی معصومیت کا خیال رکھتے تھے۔

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نے بچوں کے ساتھ نرمی، محبت اور شفقت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا ، فَلَيْسَ مِنَّا

"جو ہمارے چھوٹوں پر رحم (شفقت) نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں۔" (صحیح بخاری)

نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کا معمول تھا کہ جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کسی سفر سے واپس تشریف لاتے اور راستے میں بچے ملتے تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں نظر انداز نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی طرف متوجہ ہوتے اور ان پر شفقت فرماتے تھے۔ جو بچہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے قریب آتا، آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اسے محبت بھری مسکراہٹ سے نوازتے۔ اگر سواری پر جگہ ہوتی تو اسے اپنے ساتھ سواری پر آگے یا پیچھے بٹھا لیتے تاکہ بچے کے دل میں خوشی پیدا ہو۔

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی طبیعت میں ایسی سادگی اور محبت تھی کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ خود بچوں کو سلام کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں لیکن نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں برتری یا تکبر کا شائبہ تک نہیں تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بچوں کو خود سلام کرتے تاکہ ان کو خوشی ملے اور ان کی تربیت ہو۔ انھیں اپنی اہمیت کا احساس ہو اور انھیں بھی بڑوں کی عزت و احترام کرنے کی تعلیم ملے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی بچوں پر شفقت کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ حضرت خالد بن سعیدؓ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کے ایک صحابی تھے۔ ایک دن وہ اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس معصوم بچی نے سرخ رنگ کا کُرتا پہنا ہوا تھا۔ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ نے شفقت بھری نظر اس معصوم بچی پر ڈالی اور اس کے کُرتے کی تعریف کی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: "سَنہ، سَنہ" یہ الفاظ حبشی زبان کے تھے۔ حبشی زبان میں "حسنہ" یعنی خوب صورت کو "سنہ" کے طور پر ادا کیا جاتا تھا۔ چوں کہ وہ بچی حبشہ میں پیدا ہوئی تھی اور حبشی زبان سے بھی کچھ مانوس تھی اس لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے حبشی لب و لہجے میں اس کی تعریف کی۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کا اعلان کیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب:21)

ترجمہ: "بے شک نبی پاک ﷺ کی ہستی میں تمھارے لیے احسن نمونہ موجود ہے۔"

کامیاب زندگی گزارنے کا طریقہ صرف نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی تعلیمات کی پیروی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بچوں پر آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی شفقت و محبت کے واقعات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بچوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی برتنی چاہیے۔ ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی تربیت کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہر انسان کو اس کے پس منظر، زبان اور ثقافت کے مطابق محبت، اپنائیت اور عزت دینی

چاہیے۔ ہم دوسروں کی زبان، ثقافت اور روایات کو اہمیت دے کر ان کے دل جیت سکتے ہیں۔ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہمارے لیے عملی نمونہ ہے۔ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ سے محبت وعقیدت کا تقاضا ہے کہ ہم بڑوں کی عزت کریں اور چھوٹوں کو پیار دیں۔ اسی میں ہماری عظمت ہے اور اسی سے ہم دوسروں کے دل جیت سکتے ہیں۔

عبارت نمبر 9

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لُطف فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے۔ ایک صاحب نے کہا: ''یارسول اللہ خاتمُ النّبیین ﷺ! وہ مشرکین کے بچے تھے۔'' آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔''

سیاق وسباق

یہ عبارت سبق کے قریباً وسط سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت میں مصنف آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی بچوں سے محبت کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہا جاتا ہے۔ حضور اکرم خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے حسنِ اخلاق میں بھی مداومتِ عمل کا پہلو نظر آتا ہے۔ ایثار، تواضع اور بچوں پر شفقت آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کے نمایاں پہلو تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ راستے میں بچے ملتے تو انھیں خود سلام کرتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کا معمول تھا کہ موسم کا نیا پھل آتا تو محفل میں موجود سب سے کم عمر بچے کو عنایت فرماتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بچوں کو چومتے اور انھیں پیار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بچوں کو پیار کر رہے تھے۔ ایک بدوی نے دیکھا تو کہا ''میرے دس بچے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا'' آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا: **''اللہ تعالیٰ اگر تمھارے دل سے محبت چھین لے تو میں کیا کروں؟''**

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش وخروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی بچوں پر شفقت ورحمت کا بیان ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ بے مثال رحمت، شفقت اور عدل وانصاف کرنے والے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی رحمت وشفقت صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی بلکہ تمام انسانوں کے لیے تھی۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الانبیاء:107)

ترجمہ: ہم نے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی ساری زندگی رحمت وشفقت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ انسان ہوں یا جانور، دوست ہو یا دشمن، مسلمان ہو یا غیر مسلم، عورت ہو یا مرد، بالغ ہو یا بچہ، کوئی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی رحمت سے محروم نہ تھا۔

بقول الطاف حسین حالی:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی ہری ہوگئی ساری کھیتی خُدا کی

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں ملتے تو سلام کرتے، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے اور بعض اوقات اپنی سواری پر بٹھا لیتے۔ یہ محبت اور شفقت صرف مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ مشرکین اور کفار کے بچوں پر بھی بہت لطف فرماتے تھے۔ اس کی ایک مثال ایک غزوہ میں مشرکین کے بچوں کا زد میں آکر مارے جانا اور نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کا آزردہ ہونا ہے۔ یہ واقعہ غزوۂ حنین کا ہے۔ فتح مکہ کے بعد 8 ہجری میں غزوہ حنین پیش آیا۔ اس جنگ میں دو مشرک قبائل بنو ہوازن اور بنو ثقیف پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے میں آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی لے آئے تھے تاکہ سپاہی جوش وخروش سے لڑیں اور میدانِ جنگ سے بھاگنے کا نہ سوچیں۔ حنین کے مقام پر جیسے ہی مسلمان لشکر تنگ گھاٹیوں میں داخل ہوا، دشمن کے تیراندازوں نے اچانک گھات لگا کر حملہ کر دیا۔ اسلامی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی لیکن نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے مسلمان مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا اور انھیں جمع کر کے مشرکین پر پوری قوت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ مشرکین پسپا ہو گئے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مشرکین کے بہت سے افراد قتل ہوئے اور ان کا لشکر منتشر ہو گیا۔ چوں کہ مشرکین نے عورتوں اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا ہوا تھا اس لیے ان کے کچھ بچے بھی زد میں آکر مارے گئے۔ جب نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کو اس بات کا علم ہوا کہ مشرکین کے کچھ بچے بھی مارے گئے ہیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو بہت صدمہ ہوا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو رنجیدہ اور پریشان دیکھ کر ایک صحابی نے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو تسلی دینے کے لیے کہا کہ: ''یارسول اللہ خاتمُ النّبیین ﷺ! وہ مشرکین کے بچے تھے۔'' اس بات پر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا:

''مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔'' (مسند احمد، نسائی)

اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے معصوم ہوتے ہیں، اس لیے انھیں کسی بھی جنگ یا تصادم میں قتل کرنا جائز نہیں۔ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ نے جنگ میں بھی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ناسمجھ بچے معصوم ہوتے ہیں اور ان کا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے انھیں نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ (صحیح بخاری)

''ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

اس حدیثِ مبارکہ کے مطابق ہر بچہ اللہ کی توحید اور سچائی پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین، خاندان اور ماحول اس پر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس کے والدین یہودی ہیں تو بچے کو یہودی بنا دیتے ہیں، نصرانی ہیں تو بچے کو نصرانی بنا دیتے ہیں۔ یعنی بچے کی فطرت اور معصومیت کسی خاص مذہب یا قوم کی محتاج نہیں ہوتی۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ بچوں کی فطرت خدا کی طرف سے معصومیت اور پاکیزگی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ نے بچوں کے قتل سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

عبارت نمبر 10

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمتِ اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے۔ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا: ''آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں مگر اب تک مَیں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔'' آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اگر تمھارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟''

سیاق وسباق

یہ عبارت سبق کے وسط سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ اپنے تمام کاموں میں اس اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ یہ اصول آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے حسنِ خلق میں بھی نظر آتا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے اخلاق میں سب سے نمایاں وصف ایثار تھا۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ گھر کا کام کاج بھی خود کر لیتے تھے۔ غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کو عار نہ تھی۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ سفر سے واپس تشریف لاتے تو راستے میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کو سواری پر اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے لطفِ طبع کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ بچوں اور بڑوں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ ایک دفعہ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ نے انھیں ''اودوکان والے'' کہہ کر بلایا۔ اسی طرح ایک اونٹ طلب کرنے والے اور ایک بڑھیا جس نے جنت میں جانے کی دعا کی درخواست کی تھی، سے بھی مذاق فرمایا۔ غرض آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرمانے والے اور خوش طبع انسان تھے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش وخروش، شعلہ بیانی، روانی اور بے ساختگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی بچوں سے محبت اور شفقت کو بیان کیا گیا ہے۔

نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ راستے میں بچے مل جاتے تو ان کو خود سلام کرتے تھے۔ بعض اوقات سفر سے واپسی پر جو بچے راستے میں ملتے، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے یا پیچھے بٹھا لیتے تھے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے زیادہ کسی کو بچوں سے محبت کرنے والا نہیں پایا۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کو دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الانبیاء:107)

ترجمہ: اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی زندگی میں رحمت اور شفقت سے بھرپور نظر آتی ہے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی طبیعت میں سختی نہیں تھی بلکہ نرمی، محبت اور مہربانی بدرجۂ غایت موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی خدمت میں موسم کا نیا پھل لے کر آتا تو آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ محفل میں موجود سب سے کم عمر بچے کو پہلے دیتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے اس اندازِ شفقت سے بچوں کے دل میں آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی محبت اور عزت میں اضافہ ہوتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

''جب نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کے پاس کوئی نیا موسمی پھل آتا تو آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ اسے لے، اس پر دعا کرتے پھر سب سے کم عمر بچے کو عطا فرماتے۔''

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی مجلس میں ایک نیا پھل آیا۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ نے

اسے ہاتھ میں لیا، اس پر دعا فرمائی اور اپنے قریب بیٹھے ایک بچے کو عطا کر دیا۔ صحابہ کرامؓ یہ دیکھ کر مسکرا دیے۔ صحابہ کرامؓ بھی جانتے تھے کہ آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ بچوں سے کس قدر محبت فرماتے تھے۔

آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ معصوم بچوں کو پیار کرتے اور چومتے تھے۔ عربوں میں بعض لوگ بچوں کو اس طرح پیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ چناں چہ ایک مرتبہ نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ اپنے نواسوں میں سے کسی کو پیار کر رہے تھے۔ ایک عرب سردار اقرع بن حابس نے دیکھا تو حیرت سے کہنے لگا:

''آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔''

اقرع بن حابس کی یہ بات عربوں کی اس خاص ذہنیت کو ظاہر کرتی ہے جس میں بچوں کو پیار کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔

آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اگر تمھارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟''

اس کا مطلب ہے کہ بچوں کو پیار کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہے۔ نرم دلی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ جس دل سے اللہ تعالیٰ محبت کو چھین لے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بچوں سے پیار کرنا دراصل ایک فطری عمل ہے۔ جو لوگ بچوں کے ساتھ محبت نہیں کرتے وہ فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں سے محبت اور شفقت کرنا ایک فطری عمل ہے۔ بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اور ان کو عزت دینا ایک اخلاقی رویہ ہے۔ نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ خود حضرت حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو گود میں اٹھاتے، ان کے ساتھ کھیلتے اور ان کے ساتھ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ جب حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا۔ حضرت فاطمہؓ دونوں صاحب زادوں کو خدمت میں پیش کر دیتیں۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ ان سے باتیں کرتے۔ ان کو پیار کرتے، ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے۔ حضرت امام حسینؓ سرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔ کم سنی کی وجہ سے وہ ہر قدم پر لڑکھڑا رہے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ نے ان کو دیکھا تو خطبہ روک کر منبر سے نیچے اترے اور حضرت امام حسینؓ کو اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر فرمایا: یا اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اُس سے محبت رکھ جو اِس سے محبت رکھے۔ آنحضور خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا، وَیَعْرِفْ حَقَّ کَبِیْرِنَا ، فَلَیْسَ مِنَّا

''جو ہمارے چھوٹوں پر رحم (شفقت) نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (صحیح بخاری)

اسی طرح ایک اور جگہ آپ خاتمُ النّبیّٖن ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔''

اس کا مطلب ہے کہ خدا کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے دوسروں پر رحم کرنا چاہیے۔ بچے اپنی معصومیت اور پاکیزہ فطرت کی وجہ سے بڑوں کی محبت وشفقت کے زیادہ مستحق ہیں۔ بچوں پر شفقت دراصل خدا کی رحمت اور نبی کریم خاتمُ النّبیّٖن ﷺ کی سنت ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ بچوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور شفقت کا سلوک کریں تاکہ ان کے اندر اعتماد پیدا ہو اور ان کی شخصیت میں مثبت رویے پروان چڑھیں۔

عبارت نمبر 11

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے۔ ایک دفعہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکارا تو فرمایا ''اودوکان والے'' اس میں

ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آپ خاتم النبیین ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بھائی کا نام ابوعمر تھا، وہ کم سن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا کہ اتفاق سے وہ مر گیا۔ ابوعمر کو بہت رنج ہوا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ان کو غم زدہ دیکھا تو فرمایا: **"ابوعمر! تمھارے ممولے نے یہ کیا کیا؟"**

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے قریباً وسط سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ اسے استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہتے ہیں۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے حسنِ اخلاق میں بھی مداومتِ عمل کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہمیشہ دوسروں کو سلام اور مصافحہ کرنے میں پہل کرتے تھے۔ سخت سردی کے دنوں میں بھی اکثر نوکر چاکر یا غلام خدمتِ اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کبھی انکار نہ فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں پر بھی نہایت شفقت فرماتے تھے۔ ایک غزوہ میں مشرکین کے چند بچے جھپٹ میں آ کر مارے گئے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو خبر ہوئی تو بہت آزردہ ہوئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لطفِ طبع کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ایک شخص نے آپ خاتم النبیین ﷺ سے سواری کے لیے اونٹ مانگا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا میں تمھیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور بے ساختگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لطفِ طبع اور حسنِ اخلاق کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس عبارت سے آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی صحابہ کرامؓ کے ساتھ شفقت و محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کبھی کبھی صحابہ کرامؓ کے ساتھ ظرافت کی باتیں بھی فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا مزاح شائستہ، باوقار اور سبق آموز ہوتا تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کبھی ایسا مزاح نہیں فرماتے تھے جو جھوٹ پر مبنی ہو یا جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا حضرت انسؓ کو **"یــاذا الاُذُنَیــن"** (اے دو کانوں والے) کہنا آپ خاتم النبیین ﷺ کی حسِ مزاح اور حضرت انسؓ سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت انسؓ کا شمار ان خوش نصیب صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جو بچپن میں ہی نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں آ گئے تھے۔ ان کی والدہ حضرت اُمِ سُلیمؓ نے انھیں خود رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت کے لیے پیش کیا تھا۔ وہ تقریباً دس سال نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں رہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"میں نے رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی دس سال خدمت کی، اس دوران میں آپ خاتم النبیین ﷺ نے کبھی مجھے اُف تک نہ کہا اور نہ ہی کسی کام پر یہ فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔"

یہی وجہ تھی کہ حضرت انسؓ کے دل میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی محبت بہت گہری تھی۔ وہ ہر وقت آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت کے لیے مستعد رہتے۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے ارشادات

غور سے سنتے اور عمل کرتے تھے۔ ان کی اطاعت شعاری، توجہ اور مستعدی کی وجہ سے آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے انھیں یَاذَالْاُذُنَین (او دو کانوں والے) کہہ کر پکارا۔

تشریح طلب عبارت میں آپ خاتم النبیین ﷺ کی ظرافت اور لطفِ طبع کا ایک واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابوعمیر (کتاب میں ابوعمر دیا گیا ہے) تھا۔ ابوعمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک پرندہ جسے ممولا یا نغیر کہا جاتا ہے، پال رکھا تھا۔ انھیں اس پرندے سے بہت محبت تھی۔ اتفاق سے وہ پرندہ مر گیا۔ چوں کہ انھیں اپنے پالتو پرندے سے بہت لگاؤ تھا، اس لیے وہ بہت غمزدہ ہو گئے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے انھیں اداس اور غمگین دیکھا تو ان کے غم کو محسوس کیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ان کے دل کو تسلی دینے کے لیے محبت بھرے لہجے میں فرمایا:

یَا اَبَا عُمَیْرٍ ! مَافَعَلَ النُّغَیْرُ؟

ترجمہ: اے ابوعمیر! تمھارے ممولے نے یہ کیا کیا؟ (صحیح بخاری)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ چھوٹے بچوں کے جذبات کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہمیشہ ان کے احساسات کا خیال رکھتے اور ان کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ رکھتے تھے۔

آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ہر پہلو اخلاق، محبت اور شفقت سے بھرپور تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے مزاح میں سچائی اور خیر خواہی کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی ہر بات حکمت اور حُسن و خوبی سے بھری ہوتی تھی۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (سورۃ البقرۃ:83)

ترجمہ: اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی ہر بات اور ہر عمل اس آیت کی عملی تفسیر تھا۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کا فرمان ہے:

"لوگوں میں سب سے محبوب وہ ہے، جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے اور سب سے اچھا عمل کسی مسلمان کے دل میں خوشی داخل کرنا ہے۔"

ہنسی مذاق کی باتیں دوسروں کے دلوں کو خوش کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لیے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ دوسروں سے کبھی کبھی ظرافت کی باتیں بھی فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ان کی تربیت فرماتے اور ان کے جذبات و احساسات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا طریقۂ تربیت نہایت حکیمانہ ہوتا تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں کے ساتھ کھیلتے، ان سے محبت سے بات کرتے اور ان کے جذبات کی قدر کرتے تھے۔

ہمیں چاہیے کہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات پر عمل کریں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی سیرت کو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔ کیوں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب:21)

"یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی زندگی (میں) بہترین نمونہ ہے۔"

عبارت نمبر 12

ایک شخص نے عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو۔ ارشاد ہوا کہ میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ انھوں نے کہا: **"یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟"** آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا

ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟ ایک بڑھیا خدمتِ اقدس میں آئی کہ حضور خاتم النبیین ﷺ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھے بہشت نصیب ہو۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں بہشت میں نہیں جائیں گی۔ اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ بوڑھی عورتیں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے قریب درمیان سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں اس اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاقِ حسنہ میں بھی مداومتِ عمل کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ مجلس میں لوگوں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے تھے۔ لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت کرتے۔ کسی کی بُری بات پر اسے براہِ راست ٹوک کر شرمندہ نہیں کرتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ موسم کا نیا پھل سب سے پہلے بچوں کو کھلاتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ ایک بدوی صحابی ایک مرتبہ بازار میں کچھ چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا اور فرمایا **"کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟"** ان صحابی نے کہا **"یارسول اللہ! مجھ جیسے غلام کو جو خریدے گا، نقصان اٹھائے گا۔"** اسی طرح ایک صحابی نے اپنے بھائی کے پیٹ کی خرابی کا بتایا تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے اسے شہد پلانے کا کہا۔ تین بار شہد پلانے کے باوجود جب اس کا پیٹ ٹھیک نہ ہوا تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: **"خدا سچا ہے، شہد میں شفا ہے لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ اسے شہد پلاؤ۔"**

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی ظرافت اور لطفِ طبع کا بیان ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے لوگوں کو روحانیت، اخلاقیات اور عملی زندگی کی رہنمائی فراہم کی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کا مقصد لوگوں کی انفرادی، معاشرتی اور اخروی زندگی کی کامیابی ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ لوگوں کو ہر وقت سنجیدہ اور خشک انداز میں ہی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ آپ خاتم النبیین ﷺ لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی لطیف انداز میں کی جانے والی باتیں لوگوں کو ہنسانے کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی سکون اور روحانی تربیت کا ذریعہ بھی بنتی تھیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے کوئی سواری عنایت فرما دیں۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ جو دوسخا کا پیکر تھے۔ لوگ اپنی حاجات لے کر آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ خاتم النبیین ﷺ ان حاجات کو پورا فرما دیتے تھے۔ اسی طرح ایک شخص آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے سواری کے لیے کوئی جانور طلب کرنے کے لیے آیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا میں تمھیں اونٹنی کا ایک بچہ دوں گا۔ اس پر وہ پریشان ہوا اور عرض کی کہ یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ دراصل اس شخص کو سواری کے لیے کوئی جانور چاہیے تھا۔ اونٹنی کا بچہ سواری کے کام نہیں آ سکتا۔ اسے پال کر پہلے بڑا کرنا پڑتا ہے۔ جوان ہو کر وہ سواری کے قابل بنتا ہے۔ اس لیے اس نے حیران ہو کر عرض کی کہ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔ آپ

خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟ اس میں مزاح کا پہلو یہ تھا کہ اس شخص کا ذہن فوراً اونٹ کی بجائے اونٹنی کے چھوٹے بچے کی طرف گیا۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے جب وضاحت فرمائی کہ ہر اونٹ، اونٹنی کا بچہ ہوتا ہے، اس سے اسے تسلی ہوئی اور خوشی کا احساس بھی ہوا کہ اسے اونٹ ہی ملنے والا تھا۔ مزاح کا مقصد بھی دوسروں کو خوشی اور فرحت دینا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے جواب میں لطیف مزاح کے ساتھ یہ حکمت بھی نظر آتی ہے کہ اونٹنی کا بچہ ایک چھوٹی اور کم زور چیز ہو سکتی ہے مگر ناکارہ اور غیر اہم شے ہرگز نہیں ہو سکتی۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ۔۔۔ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں (علامہ اقبالؒ)

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے مزاح کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ ان میں بڑے، بچے، بوڑھے، مرد، عورت، کم زور، طاقت ور، امیر، غریب، غلام اور آزاد سب شامل تھے۔ ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت آپ خاتم النبیین ﷺ کی مجلس میں آئی۔ اس نے آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے درخواست کی کہ آپ خاتم النبیین ﷺ اس کے لیے جنت کی دعا کریں۔ ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ وہ جنت میں جائے۔ جس کے لیے آنحضور خاتم النبیین ﷺ خود جنت کی دعا کریں، وہ جنت سے کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ اس لیے اس بڑھیا نے درخواست کی کہ حضور خاتم النبیین ﷺ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھے بہشت نصیب ہو۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے جواب دیا کہ بوڑھی عورتیں بہشت میں نہیں جائیں گی۔ یہ جواب سُن کر اس عورت کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ غمگین ہو گئی اور روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کسی کو دکھی اور غمگین نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اس بڑھیا کو دکھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ بوڑھی عورتیں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔ یہ سُن کر وہ عورت خوش ہو گئی۔

اس کا مطلب ہے کہ جنت میں جو بھی لوگ داخل ہوں گے وہ جسمانی طور پر بہترین حالت میں ہوں گے۔ ان پر کسی بیماری یا عمر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جنت میں وہ بھرپور جوانی کے ساتھ داخل ہوں گے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق جنت میں جانے کے لیے ایمان اور نیک عمل ضروری ہیں۔ جنت میں داخلے کے لیے انسان کا جسمانی حالت میں بہترین ہونا ضروری نہیں۔ جو ایمان والے نیک عمل کر کے جنت میں جائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے جوان اور صحت مند کر دے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (سورۃ البقرۃ:83)

ترجمہ: اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے ساتھ اچھی بات کرنی چاہیے۔ ان کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ (صحیح بخاری و مسلم)

ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

آنحضور خاتم النبیین ﷺ ہنسی مذاق میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو یا وہ بات جھوٹ پر مبنی ہو۔ ہمیں بھی آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر عمل کرتے ہوئے ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ سے بچنا چاہیے اور دوسروں کے ساتھ اچھی بات کرنی چاہیے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

"تباہی ہے ایسے شخص کے لیے جو دوسروں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولے۔" (ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد)

عبارت نمبر 13

ایک بدوی صحابی تھے جن کا نام زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ وہ دیہات کی چیزیں آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ شہر میں آئے۔ گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے۔ اتفاقاً آپ خاتم النبیین ﷺ ادھر سے گزرے۔ حضرت زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا۔ انھوں نے کہا: ''کون ہے؟ چھوڑ دو۔'' مڑ کر دیکھا تو سرورِ عالم خاتم النبیین ﷺ تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟'' بولے: ''یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا۔'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''لیکن خدا کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں۔''

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے قریباً وسط سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے اپنے تمام کاموں میں اس اصول کی پابندی فرمائی ہے۔ چناں چہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاقِ حَسنہ میں بھی استقامتِ حال نظر آتی ہے۔ ایثار، تواضع اور بچوں پر شفقت آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق کے نمایاں پہلو تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کبھی کبھی ظرافت کی باتیں بھی فرماتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لطفِ طبع کا ایک اور واقعہ بتایا گیا ہے۔ ایک شخص نے اپنے بھائی کے پیٹ کی خرابی کا ذکر کیا تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے اسے شہد پلانے کا حکم دیا۔ تین بار شہد پلانے کے باوجود اس کا پیٹ ٹھیک نہ ہوا تو چوتھی بار آپ خاتم النبیین ﷺ نے لطیف انداز میں فرمایا: ''خدا سچا ہے، شہد میں شفا ہے لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔'' اب کی بار شہد پلایا تو پیٹ ٹھیک ہوگیا۔ ان واقعات سے آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لطفِ طبع کا اظہار ہوتا ہے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لطفِ طبع کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ظرافت اور ہنسی مذاق کے بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ ان واقعات میں مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ انسانیت سے محبت کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔

حضرت زاہرؓ ایک صحابی تھے۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے۔ انھیں آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے بہت عقیدت تھی۔ وہ دیہات کی چیزیں جیسے پھل اور سبزیاں وغیرہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ بھی انھیں تحفے دیا کرتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو بھی ان سے محبت تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ زاہرؓ ہمارا دیہاتی بھائی ہے اور ہم اس کے شہری بھائی ہیں۔ ایک دن حضرت زاہرؓ شہر میں آئے اور جو چیزیں دیہات سے لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کرنے لگے۔ ایک دکان پر وہ دکان دار کے ساتھ محوِ گفت گو تھے۔ اتفاق سے آنحضور خاتم النبیین ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے انھیں پہچان لیا اور ان کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا۔ انھوں نے فوراً چونک کر کہا: ''کون ہے؟ چھوڑ دو!'' جب انھوں نے مڑ کر دیکھا تو یہ حقیقت سامنے آئی

کہ خود سرورِ عالم ﷺ تھے۔ چوں کہ وہ چیزیں بیچ رہے تھے اس لیے مذاقاً آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟'' حضرت زاہرؓ نے جواب دیا:

''یارسول اللہ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا۔''

اس پر آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے جواب دیا:

''لیکن خدا کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں۔''

اس واقعہ سے حضورِ اکرم خاتم النبیین ﷺ کی ظرافت نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی اپنے صحابی حضرت زاہرؓ سے محبت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''اللہ کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں۔'' ایک بہت بڑی حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی نظر میں انسان کی قیمت اس کے دل کی پاکیزگی اور اس کے عمل کی وجہ سے ہے۔ انسان کی حقیقت اس کی ظاہری شکل و صورت یا مال و دولت سے نہیں جانی جاتی بلکہ اس کے کردار اور نیت سے جانی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

ترجمہ: **بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ تقویٰ والا ہے۔**

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک عزت و عظمت کا معیار دنیا کا مال و دولت ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے دولت کے ہونے یا نہ ہونے سے انسان اللہ کی نظر میں نہ کسی مقام کا حامل ہوتا اور نہ ہی کسی مقام و مرتبے سے محروم ہوتا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم بھی یہ بتاتا ہے کہ: عَن ابی ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ:

اِنَّ اللّٰہ لایَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِكُم واَمْوَالِكم، وَلٰكِن يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوبِكُم وَ اَعْمَالِكُم.

''اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور اعمال (عملوں) کو دیکھتا ہے۔'' (صحیح مسلم:2564)

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی ظرافت میں بھی اعلیٰ اخلاقی سبق اور دینی تربیت کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ یہاں بھی قرآنی تعلیم کہ اللہ کے نزدیک عظمت کا معیار صرف تقویٰ ہے، کی وضاحت کی گئی ہے۔

حضرت زاہرؓ کو آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے عقیدت تھی۔ ان کا دل آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی محبت سے معمور تھا۔ اگرچہ وہ دیہات کے رہنے والے اور دنیوی مال و دولت سے محروم تھے لیکن دل کے تونگر تھے۔ ان کے پاس اسلام کی دولت اور حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی محبت موجود تھی۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ سے محبت کی وجہ سے ہی اللہ کی نظر میں ان کے دام زیادہ تھے۔ یہ حضرت زاہرؓ کے لیے بھی عزت اور خوشی کی بات تھی کہ اللہ کے رسول انھیں ان کی قدر و قیمت بتا رہے تھے۔

آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے لیکن کوئی بات جھوٹ پر مبنی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی ایسی بات ہوتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی مذاق کی باتوں میں بھی تعلیم و تربیت کے کئی پہلو شامل ہوتے تھے۔

عبارت نمبر 14

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے۔ فرمایا: ''شہد پلاؤ۔'' وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی۔ سہ بارہ آئے، پھر وہی جواب ملا۔ چوتھی بار آئے تو فرمایا: ''خدا سچا ہے، شہد میں شفا ہے لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔'' اب کی بار پلایا تو شفا ہوگئی۔ معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا تنقیہ ہوگیا تو گرانی جاتی رہی۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے قریباً درمیان سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے، مستقل مزاجی سے اس پر عمل کرتا رہے۔ اس اصول کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے۔ مصافحہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پہلے نہیں چھڑاتے تھے۔ انکسار، تواضع اور بچوں پر شفقت آپ خاتم النبیین ﷺ کے حسنِ اخلاق کے نمایاں پہلو ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ انھیں سلام کرتے اور سواری پر اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ دوسروں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرلیا کرتے تھے۔ ایک بڑھیا نے جنت میں جانے کے لیے دعا کی درخواست کی تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔ وہ رونے لگی تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے تسلی دی کہ بوڑھی عورتیں جوان ہو کر جنت میں جائیں گی۔ اس پر وہ عورت خوش ہوگئی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ اپنی اولاد سے بے حد محبت کرتے تھے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ میرے گل دستے ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں، خدا اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لطفِ طبع کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ لوگوں سے ظرافت کی باتیں بھی کیا کرتے تھے اور لطیف انداز میں حکمت و بصیرت کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اس واقعہ سے بھی حکمت، صبر اور معاملہ فہمی کا درس ملتا ہے۔

ایک صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: **"یارسول اللہ! میرے بھائی کے پیٹ میں درد ہے۔"** نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: **"اسے شہد پلاؤ۔"** وہ شخص گیا اور اپنے بھائی کو شہد پلایا۔ مگر وہ ٹھیک نہ ہوا۔ وہ دوبارہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی **"یارسول اللہ! میں نے شہد پلایا لیکن اسے افاقہ نہیں ہوا۔"** آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: **"اسے پھر شہد پلاؤ۔"** وہ گیا اور دوبارہ شہد پلایا اور کچھ دیر بعد پھر آیا اور وہی شکایت کی کہ ابھی آرام نہیں آیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی۔ وہ شخص تیسری مرتبہ شہد پلا کر پھر آیا اور عرض کی کہ بار بار شہد پلانے کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

صَدَقَ اللّٰهُ وَ كَذَبَ بَطْنُ اَخِيْكَ

ترجمہ: **اللہ نے سچ کہا اور تمھارے بھائی کے پیٹ نے جھوٹ کہا۔**

آپ خاتم النبیین ﷺ نے اسے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی۔ جب اس شخص نے چوتھی مرتبہ شہد پلایا تو اس کے بھائی کو مکمل شفا مل گئی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا یہ فرمانا کہ "اللہ سچا ہے" یہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شہد میں شفا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ. (سورۃ النحل:69)

ترجمہ: **اس کے پیٹ سے ایک مشروب نکلتا ہے، مختلف رنگوں کا، جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔**

اس میں شہد کی مکھی کا ذکر ہے جو شہد بناتی ہے اور اس شہد میں لوگوں کی کئی بیماریوں کا علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ شہد میں لوگوں کے لیے شفا ہے، اس لیے اس میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور اس کا حرف حرف سچ پر مبنی ہے۔ شہد میں شفا ہے لیکن طبی تحقیق کے مطابق بعض بیماریوں کے علاج میں وقت لگتا ہے۔ بعض اوقات دوا کی مقدار بڑھانی پڑتی ہے تاکہ وہ مؤثر ہو سکے۔ اس صورتِ حال میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ اس شخص کے بھائی کے پیٹ میں فاسد مادہ کثرت سے موجود تھا۔ تین بار پلانے کے باوجود شہد کی مقدار کم تھی۔ چناں چہ چوتھی مرتبہ پلانے سے شہد کی مقدار پوری ہوگئی اور اس کا اثر بھی ظاہر ہوگیا کہ اس کے بھائی کا پیٹ صاف ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج اتارا ہے۔ مختلف چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے مختلف بیماریوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ ان چیزوں کے درست استعمال سے ہی شفا مل سکتی ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَاِذَا اُصِيْبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرَاَ بِاِذْنِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ (رواہ مسلم)

ترجمہ: **ہر بیماری کی ایک دوا ہے اور جب وہ دوا بیماری سے موافقت کر جائے تو اللہ کے حکم سے شفا ہو جاتی ہے۔**

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک پیٹ میں بیماری کی شدت کے مطابق دوا (شہد) نہیں گئی، پیٹ سے فاسد مادے خارج نہیں ہوئے اور بیماری برقرار رہی۔ جب بیماری کو ختم کرنے کے مطابق دوا پیٹ میں گئی تو پیٹ صاف ہو گیا اور مکمل علاج سے صحت بحال ہوگئی۔

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ علاج میں صبر، تحمل، حکمت اور معالج پر مکمل بھروسا رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج دیا ہے۔ شفا اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن علاج میں استقامت، صبر اور یقین بھی ضروری ہے۔ بیماری میں مایوس نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُنْزِلْ دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً.

ترجمہ: **اللہ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر اس کے ساتھ اس کا علاج بھی نازل فرمایا ہے۔**

اس واقعہ سے ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ لوگوں کی صرف روحانی بیماریوں کا علاج ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی جسمانی بیماریوں کا علاج بھی تجویز فرماتے تھے۔

عبارت نمبر 15

اولاد سے نہایت محبت تھی۔ معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریابِ خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا ہی ہوتیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے۔ اسی اثنا میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا نے دونوں صاحبزادوں (حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے۔ آنحضرت خاتم النبیین ﷺ واپس تشریف لائے تو خلافِ معمول حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے گھر نہیں گئے۔ وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اُتار لیے۔ صاحبزادے روتے ہوئے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لادو۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے آخری حصے سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ اس اصول کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہمیشہ دوسروں کو سلام میں پہل کرتے اور مصافحہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانے میں پہل

نہیں کرتے تھے۔ ایثار، تواضع، لطفِ طبع اور بچوں پر شفقت آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے اخلاق کے نمایاں پہلو تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ دوسروں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرلیا کرتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت فاطمہ جب خدمتِ اقدس میں تشریف لاتیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کھڑے ہوجاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ اسی طرح آپ خاتمُ النّبیین ﷺ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹاتے تھے۔ اولاد سے محبت کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر کو چھڑانے کے لیے اپنے گلے کا ہار بھیجا۔ ان کے شوہر غزوہ بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور فدیہ کی رقم ادا نہیں کرسکتے تھے۔ حضرت زینبؓ کا بھیجا گیا ہار وہی تھا جو انھیں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تحفے میں دیا تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے اس ہار کو دیکھا تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ صحابہ کرامؓ کی رائے اور مرضی سے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے وہ ہار حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو واپس کردیا۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی اپنی اولاد سے محبت کا ذکر ہے۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی اپنی اولاد سے محبت اور شفقت بے مثال تھی۔ خاص طور پر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا تعلق بہت گہرا تھا۔ جب بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کسی سفر پر روانہ ہوتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس جاتے اور جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے اُن ہی سے ملاقات فرماتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے دل میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا کیا مقام تھا۔

ایک غزوہ کے موقع پر جب آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ صحابہ کرامؓ کو لے کر جہاد کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے دونوں صاحب زادوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے۔ اس کے علاوہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے گھر کے دروازے پر خوب صورت اور قیمتی پردے لٹکا دیے تھے۔ جب نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو حسب معمول حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے دروازے پر پردے لٹکے دیکھے تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو پسند نہ آئے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ زہد اور سادگی کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ چاہتے تھے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی اولاد غیر ضروری آرائش سے دور رہے۔ اس لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ گھر میں داخل نہیں ہوئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بچوں سے ملے بغیر واپس آگئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جب معلوم ہوا کہ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ دروازے سے لوٹ گئے ہیں تو وہ فوراً سمجھ گئیں۔ وہ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی تھیں اس لیے انھوں نے وہ پردے اتار دیے اور نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں بھیج دیے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے وہ پردے بازار بھیج دیے اور حکم دیا کہ انھیں بیچ کر رقم غریبوں میں تقسیم کردی جائے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جب معلوم ہوا کہ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ نے چاندی کے کنگن ناپسند کیے ہیں تو انھوں نے صاحب زادوں کے ہاتھوں سے وہ کنگن بھی اتار کر آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں پیش کردیے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ان کو بیچ کر رقم غریبوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ وہ کنگن صاحب زادوں کو پسند تھے۔ چناں چہ

جب ان کے ہاتھوں سے وہ کنگن اتارے گئے تو وہ روتے ہوئے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کو حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہت محبت تھی۔ جب ان کو روتے دیکھا تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ان کے لیے ہاتھی دانت کے کنگن لانے کا حکم دیا۔

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی زندگی بہت سادہ اور نمود و نمائش سے دور تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے کبھی مال و دولت کی خواہش کی اور نہ اسے پسند کیا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو فقر پسند تھا۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

اے مرے شاہِ شرق و غرب! ناں جویں غذا تیری　　اے میرے بوریا نشین! سارا جہاں گدا تیرا

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو سادگی پسند تھی اس لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے ہمیشہ اپنی اولاد کو بھی دنیوی زینت اور تکلفات سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ دنیا کے مال و دولت کو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اچھی اور قابلِ فخر چیز نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ دنیا اور متاعِ دنیا کے بارے میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ، مَلْعُوْنٌ مَافِیْھَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ، وَعَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ

ترجمہ: ”دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے اور ان چیزوں کے جو اس سے جڑی ہوئی ہیں اور عالم یا علم کے۔“

مفہوم یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں جو اللہ کے ذکر سے غافل کردیں ملعون ہیں اسی طرح وہ علم اچھا ہے جو بندوں کو اللہ کے قریب کردے۔

اس کا مطلب ہے دنیا کے مال و متاع کی کوئی اہمیت نہیں۔ دنیا میں کوئی بابرکت اور کام آنے والی چیز ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور علم ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ کے ذکر کی اہمیت اس طرح بیان ہوئی ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

ترجمہ: ”خبردار، اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔“

یعنی اللہ کا ذکر سکونِ قلب کا ذریعہ ہے اور جس کے دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو، اس کے پاس سب سے بڑی دولت ہے۔ اسی طرح علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے علم میں اضافے کی دعا سکھائی ہے:

رب زدنی علما

ترجمہ: اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ لوگوں کو علم اور اللہ کے ذکر سے جوڑتے تھے۔ اپنی اولاد کے لیے بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے دنیوی زینت اور آرائش کے بجائے علم، فقر اور سادگی کو پسند فرمایا ہے۔ تشریح طلب عبارت میں بیان کیے گئے واقعہ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ہم اپنے دل کو دنیا کی محبت کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منور کریں۔

مہارت نمبر 16

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کھڑے ہوجاتے، ان کی پیشانی کو چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔ حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ یہ میرے گل دستے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا۔ وہ صاحب زادوں کو لاتیں، آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ان کو چومتے اور سینہ سے لپٹاتے۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے آخری حصے سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر سختی سے عمل پیرا رہے اور اسے کبھی ترک نہ کرے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے

اخلاقِ حسنہ میں بھی استقامتِ حال کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ حسنِ خُلق ،ایثار ، تواضع ، بچوں پر شفقت اور لطفِ طبع وغیرہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی مثالیں ہیں۔ آپ ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے اور ان کو سلام میں پہل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم خاتمُ النّبیین ﷺ کسی غزوہ میں گئے ہوئے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے ۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ واپس تشریف لائے تو خلافِ معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف نہیں لے گئے۔ وہ سمجھ گئیں، فوراً پردے ہٹا دیے اور کنگن بھی اتار دیے۔ صاحب زادے روتے ہوئے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے وہ کنگن بازار میں بیچ کر ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن منگوانے کا حکم دیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو حضرت امام حسینؓ سے بہت محبت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اکثر امام حسینؓ کو گود میں لیتے اور فرماتے کہ خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے صاحب زادوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کا بیان ہے۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کو اپنی اولاد سے بہت محبت تھی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بیٹوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ جب کسی سفر پر روانہ ہوتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ملتے۔ اسی طرح جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے جس سے ملاقات کرتے وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی تھیں۔

دورِ جاہلیت میں بیٹیوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عرب کے بعض لوگ بیٹیوں کو باعثِ شرم سمجھتے ہوئے زندہ دفن کر دیتے تھے۔ وہ بیٹیوں کو عزت اور محبت دینے کے قائل نہ تھے۔ بیٹیوں کے بارے میں ان کی ذہنیت کو قرآنِ مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

ترجمہ: **"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم زدہ ہو جاتا ہے۔"**

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نے بیٹیوں کو عزت دی اور ان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دیا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے۔ یہ بیٹی کو عزت دینے کا ایک طریقہ تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا استقبال کرتے اور محبت سے ان کی پیشانی کو چومتے اور ان کو پیار سے اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا:

فاطمة سيدة النساء اهل الجنة

ترجمہ: **فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔**

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا:

"بے شک فاطمہؓ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جس نے اسے تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جو چیز اسے پریشان کرے وہ مجھے پریشان کرتی ہے۔"

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کو صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے نہیں بلکہ ان کے صاحب زادوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی بہت محبت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں "میرے گل دستے" کہتے تھے۔ جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں صاحب زادوں کو خدمت میں حاضر کر دیتیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں پیار کرتے، ان کو چومتے اور انھیں اپنے سینے سے لپٹا لیتے تھے۔ حسنین کریمینؓ کے بارے میں آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"حسن اور حسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔"

ایک دفعہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اتفاق سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں داخل ہوئے۔ انھوں نے سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کم سنی کی وجہ سے اچھی طرح چل نہیں پا رہے تھے۔ نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ نے جب دیکھا کہ وہ لڑکھڑاتے آ رہے ہیں تو فوراً خطبہ روک دیا اور منبر سے اتر کر انھیں اٹھا لیا۔ اپنے سینے سے لپٹا کر پیار کیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔

حسنین کریمینؓ سے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو بہت محبت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں پیار کرتے اور ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ ان کو خوش کرنے کے لیے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں اپنے دوشِ مبارک پر سواری بھی کراتے تھے۔ ایک دفعہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ایک صاحب زادے کو دوشِ مبارک پر سوار کیے ہوئے تھے۔ ایک صحابیؓ نے دیکھا تو کہا "کیا سواری ہاتھ آئی ہے!" آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا: "سوار بھی تو دیکھو کیسا ہے!" یعنی سوار بھی بہت عظمت والا ہے اور جنت کے جوانوں کا سردار ہے۔ حضرت امام حسینؓ کے بارے میں فرمایا:

"حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ خدا اس سے محبت رکھے جو حسینؓ سے محبت رکھتا ہے۔"

ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ کھیل رہے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کہیں دعوت میں جا رہے تھے۔ حضرت امام حسینؓ کو کھیلتے دیکھا تو ان کو پکڑ کر پیار کیا اور اپنے سینہ سے لپٹا کر فرمایا: **"حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔"**

حضرت حسینؓ کو گود میں لے کر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ فرماتے تھے:

"اے اللہ! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔"

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اس پہلو سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اولاد سے محبت کرنی چاہیے اور اُس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ بیٹیوں کو اللہ کی رحمت سمجھنا چاہیے اور ان کو عزت دینی چاہیے۔ اولاد کی تربیت محبت اور شفقت کے ساتھ کرنی چاہیے تاکہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔

عبارت نمبر 17

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے۔ اتفاق سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرخ کپڑے پہنے ہوئے آئے، کم سنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ ضبط نہ کر سکے۔ منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر فرمایا: "خدا نے سچ کہا ہے: **إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتنه** فرمایا کرتے تھے: حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ خدا اس سے محبت رکھے جو حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک دفعہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوشِ مبارک پر سوار تھے۔ کسی نے کہا: "کیا سواری ہاتھ آئی ہے!" آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا: "سوار بھی کیسا ہے؟"

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے آخری حصے سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاقِ حسنہ میں استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کا پہلو نمایاں ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ ہمیشہ دوسروں کو سلام میں پہل کرتے، لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت کرتے اور سلیقے سے ان کی اصلاح کر دیتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ دوسروں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرلیا کرتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اپنی اولاد سے بہت محبت کرتے تھے۔ کسی سفر پر جاتے تو حضرت فاطمہؓ سے سب سے آخر میں ملتے۔ اسی طرح سفر سے واپس آکر بھی سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ سے ملتے تھے۔ وہ خدمتِ اقدس میں تشریف لاتیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور انھیں اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹاتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ آپ خاتم النبیین ﷺ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھیل رہے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ان کو پکڑ کر پیار سے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور فرمایا: "حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ اکثر ان کو گود میں لیتے اور فرماتے کہ خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی اپنے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کا ذکر ہے۔ انسان کو اپنی اولاد سے محبت ہونا ایک فطری امر ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کو بھی اپنی اولاد سے بے انتہا محبت تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے صاحب زادوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خاص طور پر بہت لگاؤ تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ جب کسی سفر پر روانہ ہوتے تو روانگی سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ضرور ملتے تھے۔ اسی طرح سفر سے واپس آکر بھی سب سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ملتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اتنی محبت تھی کہ جب وہ آپ خاتم النبیین ﷺ سے ملنے آتیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے اور ان کی پیشانی چومتے پھر ان کو اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ اسی طرح آپ خاتم النبیین ﷺ کو اپنے نواسوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی محبت تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لاؤ۔ وہ دونوں صاحب زادوں کو آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں پیش کرتیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ انھیں پیار کرتے، ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹا لیتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ پیار سے انھیں "میرے گل دستے" فرمایا کرتے تھے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

"یہ دونوں (حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔"

آپ خاتم النبیین ﷺ نے حضرت امام حسن اور امام حسینؓ کے بارے میں فرمایا کہ:

"حسن اور حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔"

تشریح طلب عبارت میں بتایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرما رہے

تھے۔ اتنے میں حضرت امام حسینؓ (بعض روایات میں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں) کو آتے دیکھا۔ وہ اس وقت بہت چھوٹے بچے تھے۔ انھوں نے سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کم سنی کی وجہ سے چلنے کے دوران میں وہ کبھی گرتے اور کبھی اٹھتے۔ وہ اسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے منبر کی طرف آ رہے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو آپ خاتم النبیین ﷺ کا دل بھر آیا۔ محبت سے مغلوب ہو گئے اور خطبہ روک کر فوراً منبر سے نیچے اترے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے انھیں اٹھا لیا، پیار کیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر ان کو اپنے سامنے بٹھا کر دوبارہ منبر پر چڑھے اور فرمایا:

"اللہ نے سچ کہا ہے کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہیں۔"

اس میں سورۃ الانفال آیت 28 کا حوالہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا اَموالکم و اولادکم فتنۃ

ترجمہ: بے شک تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہیں۔

آیت کا مفہوم ہے کہ اولاد اور مال کی محبت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت سے مقدم نہیں ہے۔ اس لیے اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کو ہر چیز سے مقدم جانو۔ اللہ نے اولاد اور مال جیسی نعمتوں کو آزمائش قرار دیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے دونوں صاحب زادوں کو منبر سے اتر کر پیار کیا اور ان کو اپنے سامنے بٹھا کر دوبارہ خطبہ شروع کیا اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہے۔ میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا کہ وہ چل رہے ہیں اور گر رہے ہیں تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا، یہاں تک کہ میں نے اپنی بات روک دی اور انھیں اٹھا لیا۔"

اس عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی اپنی اولاد سے محبت کا ایک اور واقعہ بیان ہوا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اپنے نواسوں کو اپنے دوشِ مبارک پر سواری کراتے تھے۔ کبھی آپ خاتم النبیین ﷺ ان کو اپنی پشت مبارک پر سوار کر کے انھیں کھلاتے تھے۔ اسی طرح ایک دن آپ خاتم النبیین ﷺ صاحب زادوں میں سے کسی کو اپنے دوشِ مبارک پر سوار کر کے ان کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ صحابہ میں سے کسی نے یہ منظر دیکھا تو محبت اور حیرت سے کہا:

"اے بچے! تمھیں کیا خوب سواری ملی ہے!" یہ سُن کر نبی کریم خاتم النبیین ﷺ مسکرائے اور فرمایا: **"اور سوار بھی کتنا خوب ہے!"**

آنحضور خاتم النبیین ﷺ کو حضرت امام حسینؓ سے بے حد محبت تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ فرماتے تھے:

"حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ خدا اس سے محبت رکھے جو حسینؓ سے محبت رکھتا ہے۔"

آپ خاتم النبیین ﷺ اکثر حضرت امام حسینؓ کو اپنی گود میں لیتے اور فرماتے تھے:

"خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔"

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے دل کے قرار اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نہ صرف خود ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے بلکہ اپنی امت کو بھی ان سے محبت و عقیدت کی تلقین کرتے تھے۔ حسنین کریمینؓ کی یہ فضیلت ہے کہ جو بھی ان سے محبت کرے گا وہ دراصل اللہ اور رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی محبت بھی پا لے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ بیت سے محبت محض ایک جذباتی تعلق نہیں بلکہ دین کا ایک لازمی جزو ہے۔

عبارت نمبر 18

ایک دفعہ آپ خاتم النبیین ﷺ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ راہ میں کھیل رہے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلائے۔ وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے۔ بالآخر آپ

خاتمُ النّبیین ﷺ نے اُن کو پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینے سے لپٹا لیا پھر فرمایا: ''حسینؓ میرا ہے میں اس کا ہوں۔'' اکثر امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گود میں لیتے اور فرماتے کہ خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے آخری حصے سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ اپنے ہر عمل میں استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کے اصول کی پابندی فرماتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے حسنِ خلق، ایثار، تواضع، لطفِ طبع، بچوں پر شفقت اور اولاد سے محبت میں بھی یہ اصول نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ جب آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں آتیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور انھیں اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ میرے گل دستے ہیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ جب ان کے گھر جاتے تو ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹاتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بھی اولاد سے محبت کے کچھ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ کے شوہر جنگ بدر میں قید ہو کر آئے۔ وہ فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو تحفے میں دیا تھا۔ آنحضرت خاتمُ النّبیین ﷺ ہار دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پھر صحابہ کرام کی مرضی اور رائے سے وہ ہار حضرت زینبؓ کو بھیج دیا۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی حضرت امام حسینؓ سے محبت کا بیان ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی ذات سراپا رحمت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی محبت کا مرکز آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے اہلِ بیت اطہار تھے۔ ان میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خاص مقام تھا۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ انھیں بے حد چاہتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے امت کو بھی حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کی ترغیب دی ہے۔

سیرتِ طیبہ میں آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی حضرت امام حسینؓ سے محبت کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بار آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نماز میں مشغول تھے اور سجدے کی حالت میں تھے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ چھوٹے بچے تھے۔ وہ آئے اور آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی کمر پر سوار ہو گئے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے سجدہ طویل کر لیا یہاں تک کہ وہ خود کر سے اتر گئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد میں آتے دیکھا۔ وہ کم سنی کی وجہ سے لڑکھڑاتے جاتے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے خطبہ روک دیا اور منبر سے اتر کر ان کو اٹھا لیا۔

تشریح طلب عبارت میں بھی حضور اکرم خاتمُ النّبیین ﷺ کی حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک مرتبہ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کسی دعوت میں تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ راستے میں کھیل رہے تھے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے دیکھا تو شفقت سے اپنے ہاتھ پھیلا دیے تاکہ وہ آ کر گلے لگیں۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہنستے ہوئے پاس آتے اور پھر دور نکل جاتے۔ کچھ دیر وہ اسی طرح ہنستے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتے رہے۔ پھر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے انھیں پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور دوسرا سر پر رکھ کر انھیں اپنے

سینے سے لگا لیا۔ پھر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ نے فرمایا:

''حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرا ہے اور میں حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہوں۔''

اس سے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گہری محبت نظر آتی ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ اکثر انھیں گود میں لیتے اور فرماتے تھے:

''اے اللہ! میں حسین سے محبت کرتا ہوں، تو بھی حسین سے محبت کر اور جو حسین سے محبت کرے، اس سے بھی محبت فرما۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت میں شامل ہونا ہے۔ جو شخص حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کرتا ہے وہ دراصل حق سے محبت کرتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیت کی محبت کو اجرِ رسالت قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''کہہ دو، میں تم سے اس (تبلیغِ رسالت) پر کوئی اجر نہیں مانگتا، سوائے اپنے قریبی رشتہ داروں کی محبت کے۔''
(سورۃ الشوریٰ:23)

آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت درحقیقت دینِ اسلام کے ساتھ محبت اور وابستگی ہے۔ آنحضور خاتمُ النّبیین ﷺ خود حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بے حد محبت کرتے تھے اس لیے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کرنا نبی کریم خاتمُ النّبیین ﷺ کی سنت کی پیروی ہے۔ ان کے کردار کی عظمت ایسی ہے کہ ان سے محبت انسان کو اللہ تعالیٰ کی قربت عطا کرتی ہے۔

عبارت نمبر 19

آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے داماد، حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ کے شوہر جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا۔ یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جہیز میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو دیا تھا۔ آنحضرت خاتمُ النّبیین ﷺ نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ اگر تمھاری مرضی ہو تو ہار زینبؓ کو بھیج دوں۔ سب نے بسر و چشم منظور کیا۔

سیاق و سباق

یہ عبارت سبق کے آخر سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا سب سے ضروری اور اہم پہلو یہ ہے کہ آدمی جس کام کو اختیار کرے اس پر سختی سے کاربند رہے۔ اس اصول کو استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کہا جاتا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کے حسنِ خُلق، ایثار، تواضع، لطفِ طبع، بچوں پر شفقت اور اولاد سے محبت میں بھی مداومتِ عمل کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کو اپنی اولاد سے بہت محبت تھی۔ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ حضرت فاطمہؓ اور ان کے صاحب زادوں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بہت چاہتے تھے۔ کسی سفر پر جانے سے پہلے آپ خاتمُ النّبیین ﷺ سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملتے اور سفر سے واپسی پر سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ سے ملتے تھے۔ جب حضرت فاطمہؓ آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور انھیں اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ میرے گل دستے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ اپنی نواسی کو حالتِ نزع میں دیکھ کر آپ خاتمُ النّبیین ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اپنے فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر بھی آپ خاتمُ النّبیین ﷺ آبدیدہ ہو گئے تھے۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان

کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی اپنی اولاد سے محبت کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ حضرت زینبؓ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی مکہ میں حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے ابوالعاص بن ربیع کے ساتھ ہوئی تھی۔

حضرت زینبؓ نے آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے اعلان نبوت کے فوراً بعد اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ان کے شوہر جلدی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ابوالعاص قریش کے ایک معزز اور قابلِ اعتماد تاجر تھے۔ اگرچہ وہ مکہ میں مشرکین کے ساتھ رہے لیکن نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے سخت مخالفین میں شامل نہیں تھے۔

سن دو ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس غزوہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور مشرکین مکہ کے بہت سے لوگ مسلمانوں کی قید میں آ گئے۔ حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ صحابہ کرامؓ کی مشاورت سے ہوا تھا۔ فدیہ لے کر چھوڑنے کا مشورہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا تھا۔

چناں چہ غزوۂ بدر کے دیگر قیدیوں کی طرح ابوالعاص کی رہائی کے لیے بھی فدیہ کی رقم طے کی گئی۔ چوں کہ وہ اس وقت مدینہ میں قید تھے اس لیے ان کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے مکہ میں حضرت زینبؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ فدیہ ادا کرنے کا انتظام کریں۔

حضرت زینبؓ کے پاس قیمتی چیزوں میں ایک ہار تھا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ نے انھیں شادی کے موقع پر تحفے کے طور پر دیا تھا۔ حضرت زینبؓ نے وہی ہار اپنے شوہر کی رہائی کے لیے بھیج دیا۔ جب وہ ہار نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے سامنے آیا تو آپ خاتم النبیین ﷺ اسے دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور آپ خاتم النبیین ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

"اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کا ہار واپس کر دو اور ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کر دو۔"

یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے خوش دلی سے کہا:

"یارسول اللہ! ہمیں آپ خاتم النبیین ﷺ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں، ہم بخوشی اسے واپس کر دیتے ہیں۔"

چناں چہ ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کر دیا گیا اور وہ ہار بھی واپس حضرت زینبؓ کو بھیج دیا گیا۔

ابوالعاص کو فدیہ لیے بغیر آزاد کر دیا گیا تاہم آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے ان سے وعدہ لیا کہ مکہ واپس جا کر وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں گے کیوں کہ حضرت زینبؓ ایک مسلمان خاتون تھیں اس لیے مشرک شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں۔ ابوالعاص نے وعدہ نبھایا اور کچھ عرصے بعد حضرت زینبؓ کو مدینہ روانہ کر دیا۔ بعد میں ابوالعاص خود بھی ایمان لے آئے اور ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے دوبارہ حضرت زینبؓ کا ان سے نکاح کر دیا۔

یہ واقعہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی اولاد سے محبت و شفقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی حضرت خدیجہؓ سے محبت اور ان کی یاد کے احترام کا بھی عظیم اظہار ہے۔ اس واقعہ سے حضرت زینبؓ کی اپنے شوہر سے وفاداری اور قربانی بھی نمایاں ہوتی ہے۔

عبارت نمبر 20

آپ خاتم النبیین ﷺ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ تشریف لے گئے تو لڑکی اس حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ!

آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: "یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔" حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر بھی آپ خاتم النبیین ﷺ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا تھا: "آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غم زدہ ہو رہا ہے، لیکن منھ سے ہم وہی بات کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے۔"

سیاق و سباق

یہ سبق کی آخری عبارت ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے ہر عمل میں استقامت حال اور مداومت عمل پائی جاتی تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کے حسن خلق، ایثار، تواضع، لطف طبع، بچوں پر شفقت اور اولاد سے محبت جیسے اعلیٰ اخلاق میں بھی یہ اصول نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو اپنے خاندان اور اولاد سے بہت محبت تھی۔ حضرت فاطمہؓ جب آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں آتیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور انھیں اپنی جگہ بٹھاتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اپنے نواسوں کو اپنے گل دستے کہتے تھے۔ ان سے بے انتہا محبت کرتے، ان کو چومتے اور اپنے سینے سے لپٹاتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ انھیں اپنے دوش مبارک پر سواری بھی کراتے تھے۔

آپ خاتم النبیین ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ کے شوہر بدر کی جنگ میں قید ہو کر مدینے آئے۔ وہ فدیے کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا وہ ہار بھیج دیا جو انھیں حضرت خدیجہؓ نے تحفے میں دیا تھا۔ ہار دیکھ کر آپ خاتم النبیین ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صحابہ کی اجازت سے وہ ہار حضرت زینبؓ کو واپس کر دیا گیا۔

تشریح

علامہ شبلی نعمانی اُردو کے عظیم مؤرخ، نقاد اور سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے اسلوب میں جوش و خروش، شعلہ بیانی، روانی اور برجستگی شامل ہے۔ سیرت نگاری میں شبلی کو خاص مقام حاصل ہے۔

تشریح طلب عبارت میں آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی نواسی اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کا ذکر ہے۔ نواسی اور بیٹے کی کم سنی میں وفات آنحضور خاتم النبیین ﷺ کے لیے بہت دکھ اور صدمے کا سبب بنے لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ نے کمال صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اس عبارت میں دیے گئے واقعات سے آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی اپنی اولاد سے محبت، صبر، ہمدردی اور اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کا اظہار ہوتا ہے۔

آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی ایک نواسی سخت بیمار تھیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی صاحب زادی نے اطلاع دی تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے پیغام بھجوایا کہ:

"اللہ ہی کا ہے جو اس نے لیا اور اللہ ہی کا ہے جو اس نے دیا اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ پس صبر کرو اور اللہ سے اجر کی امید رکھو۔"
(صحیح بخاری)

آپ خاتم النبیین ﷺ کو دوبارہ اطلاع دی گئی تو آپ خاتم النبیین ﷺ خود تشریف لے گئے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے دیکھا تو لڑکی حالتِ نزع میں تھی۔ وہ اسی حالت میں آپ خاتم النبیین ﷺ کی گود میں رکھ دی گئی۔ اس کی تکلیف دیکھی تو آپ خاتم النبیین ﷺ کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعدؓ نے دیکھا تو حیران ہو کر کہا:

"یارسول اللہ! آپ خاتم النبیین ﷺ یہ کیا کر رہے ہیں؟" حضرت سعدؓ نے جب آنحضور خاتم النبیین ﷺ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو حیرت کا اظہار کیا۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے جواب دیا کہ:

"یہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے۔ بے شک اللہ انھی بندوں پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔"
(صحیح بخاری)

سوال نمبر:۴۔ اخلاق نبوی ﷺ کے کسی ایک پہلو پر گفت گو کریں۔

جواب۔ حضور خاتم النبیین ﷺ حسن اخلاق کے پیکر تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کسی سے ملتے تو پہلے خود سلام فرماتے۔ کوئی بولتا تو اس کی بات غور سے سنتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو سمٹ کر لوگوں کے برابر بیٹھتے۔ لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے۔ کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے۔

سوال نمبر:۵۔ سبق ''اخلاق نبوی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی بچوں اور اولاد سے محبت کے بارے میں آپس میں بات چیت کریں۔

جواب۔ سبق کے متن سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ بچوں اور اولاد سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ بچوں کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھاتے اور ان کے پیار کرتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی آنکھوں میں اپنی اولاد کے لیے آنسو آ گئے تھے۔ موجودہ دور میں ہمارے اردگرد ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے چھوٹوں سے شفقت کرتے ہیں۔ لوگ بچوں اور خاص طور پر اپنی اولاد سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اب بھی جہالت نظر آتی ہے کہ لوگ بچوں اور اپنی اولاد پر تشدد کرتے ہیں۔

سوال نمبر:۶۔ نیچے دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں اور عبارت کا مناسب عنوان لکھیں۔

کسی منفی رجحان کے نتیجے میں اپنے سخت ردعمل پر قابو پالینا، برداشت ہے اور ردعمل کے طور پر منفی رویے کے بجائے مثبت حسن سلوک کو روا رکھنا، رواداری کہلاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس وقت جن منفی رجحانات سے دوچار ہے، ان میں عدم برداشت، سر فہرست ہے۔ جس کے باعث ہمارے اندر رواداری کا وصف ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں روزانہ ایسے بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو چھوٹی چھوٹی اور انتہائی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہو رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم لوگ تھوڑی دیر کے لیے صبر وتحمل، برداشت اور حوصلے سے کام لیں تو بہت بڑے مالی وجانی نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ برداشت کا وصف لوگوں میں اس وقت پیدا ہوگا جب وہ رواداری اور حسن سلوک کو اپنا شعار بنائیں گے۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی حیات طیبہؐ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیشہ برداشت اور رواداری سے کام لیتے ہوئے ہمارے لیے ایسی بے شمار زندہ مثالیں قائم کیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ بنی رہیں گی۔ کفار مکہ کی طرف سے آپ خاتم النبیین ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ خاتم النبیین ﷺ پر پتھر برسائے گئے، طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا گیا مگر آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیشہ برداشت اور تحمل سے کام لیا بلکہ فتح مکہ کے موقع پر تمام دشمنانِ اسلام کو معاف فرما دیا۔ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں بھی اپنی معاشرتی روایات کو حوصلہ مندی اور صبر و برداشت کے اصولوں پر قائم رکھنے کا عزم کرنا چاہیے، تاکہ ہم آپس میں باہمی اخلاص اور مثالی بھائی چارے کو فروغ دے سکیں۔

سوالات:

۱۔ **منفی رجحان سے کیا مراد ہے؟**

جواب۔ منفی رجحان سے مراد سوچ اور عمل کا وہ زاویہ ہے جس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت سخت ردِعمل دیا جاتا ہے۔ عدم برداشت اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

۲۔ **رواداری کسے کہتے ہیں؟**

جواب۔ کسی شخص کے منفی عمل کے جواب میں مثبت حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا رواداری کہلاتا ہے۔

۳۔ **کفار مکہ آپ خاتم النبیین ﷺ سے کیسا سلوک کرتے تھے؟**

جواب۔ کفار مکہ حضور خاتم النبیین ﷺ پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے۔ راستے میں کانٹے بچھانا اور پتھر برسانا اس کی مثالیں ہیں۔

۴۔ **سیرت طیبہ کی روشنی میں ہمیں کیسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟**

جواب: سیرت طیبہ کی روشنی میں ہمیں حوصلہ مندی اور صبر و برداشت کے اصولوں پر قائم رہنا چاہیے۔

۵۔ **فتح مکہ کے موقع پر آپ خاتم النبیین ﷺ نے دشمنانِ اسلام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟**

جواب۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور خاتم النبیین ﷺ نے اپنے تمام دشمنوں کو معاف فرما دیا۔

۶۔ **اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں؟**

جواب۔ اس عبارت کا مناسب عنوان ''برداشت اور رواداری کا فروغ / کی اہمیت'' ہو سکتا ہے۔

فعل کی اقسام (بلحاظ معنی)

فعل لازم: جب کسی جملے میں استعمال ہونے والے فعل کے ساتھ صرف فاعل آئے اور جملے کا مفہوم سمجھ میں آ جائے تو وہ فعل، فعل لازم کہلاتا ہے۔ مثلاً: اکبر آیا۔ عمران جاگا۔ سلیمان بیٹھا۔

فعل متعدی: جب کسی جملے میں فاعل کے ساتھ ساتھ مفعول لگا کر مفہوم واضح کیا جائے تو استعمال ہونے والا فعل، فعل متعدی کہلائے گا۔
مثلاً: اسلم کتاب پڑھ رہا ہے۔ بلی نے چوہے کو پکڑ لیا۔

سوال نمبر:۷۔ فعل کی پہچان کر کے ان کے سامنے فعل لازم یا فعل متعدی لکھیں۔

وہ مدرسے گیا۔	فعل متعدی	میں نے کتاب پڑھی۔	فعل متعدی
ہم نے کھانا کھایا۔	فعل متعدی	تم نے پانی پیا۔	فعل متعدی
وہ دیر سے جاگا۔	فعل لازم	نادیہ ابھی ابھی آئی ہے۔	فعل لازم
امجد نے خط لکھا۔	فعل متعدی	قصاب نے بکرا خریدا۔	فعل متعدی

سیاق و سباق:

کسی بھی بیان، واقعہ، عمل یا تحریر کے وہ متعلقہ حالات و واقعات، ماحول یا پس منظر کو کہتے ہیں جو اُس کے درست مفہوم کو سمجھنے میں مدد دیں۔ سیاق و سباق کے بغیر کسی بات کا درست مفہوم سمجھنا دشوار ہو سکتا ہے۔

نوٹ: اساتذہ اپنے طلبا کو معیاری اور مثالی سیاق و سباق لکھنے کی مشق کروائیں۔

حوالۂ متن: حوالۂ متن سے مراد ہے کسی دیے ہوئے اقتباس، عبارت یا تحریری مواد کے حوالہ جات بیان کرنا۔ عام طور پر سبق کا عنوان، ماخذ اور مصنف کا نام درج کرنا حوالہ متن کہلاتا ہے۔ مثلاً:

سبق کا عنوان: اخلاق نبوی ﷺ

مصنف کا نام: مولانا شبلی نعمانی

ماخذ: سیرت النبی ﷺ (جلد دوم)

سوال نمبر:۸۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں۔

۱۔ اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے ---------------- اس کا نام استقامت حال اور مداومت عمل ہے۔

۲۔ ''اولاد سے نہایت محبت تھی ---------------- ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔''

جواب۔ دیکھیے نثر پاروں کی تشریحات

سوال نمبر:۹۔ ''ہماری زندگی میں 'حسنِ خلق کی اہمیت''' کے موضوع پر ایک پیراگراف تحریر کریں۔

جواب۔ انسانی زندگی میں حسنِ خلق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہر مذہب کے لوگ، بلکہ دنیا میں بسنے والا ہر انسان اچھے اخلاق و کردار، اچھے حسنِ سلوک کا قائل ہے اور کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اخلاقی خوبیوں کو حاصل کرنا انسان کی فطرت کا اہم تقاضا ہے بلکہ بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ اس کے بغیر انسان میں انسانیت اور حسن و خوبی نہیں آتی۔ یہی وہ عظیم اور قابلِ قدر جوہر ہے جس کے ذریعے معاشرے میں بھائی چارہ، اتحاد و اتفاق، پیار و محبت عفو و درگزر اور مطابقت و ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ حسنِ خلق درحقیقت انسان کا زیور اور اس کا حسن و خوب صورتی ہے۔ اسی کے ذریعے اجتماعی و انفرادی زندگیوں میں توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کے دلوں پر فتح حاصل کی جاتی ہے۔

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ شبلی نعمانی کا اصل نام تھا:
(الف) شبلی حسین (ب) محمد شبلی (ج) شبلی علی (د) علامہ شبلی — (ب)

2۔ شبلی کس نام سے مشہور ہوئے؟
(الف) مولانا شبلی (ب) علامہ شبلی (ج) مولوی شبلی (د) شبلی نعمانی — (د)

3۔ مولانا شبلی نعمانی کب پیدا ہوئے؟
(الف) 8 نومبر 1853ء میں (ب) 8 نومبر 1855ء میں (ج) 8 نومبر 1857ء میں (د) 8 نومبر 1859ء میں — (ج)

4۔ مولانا شبلی نعمانی کہاں پیدا ہوئے؟
(الف) مبارک پور (ب) قصبہ بندول (ج) ابراہیم پور (د) حافظ پور — (ب)

5۔ موضع بندول کا ضلع تھا:
(الف) اعظم گڑھ (ب) علی گڑھ (ج) کلکتہ (د) کرنال — (الف)

6۔ مولانا شبلی نعمانی کے والد کا نام تھا:
(الف) شیخ نجیب اللہ (ب) شیخ نقیب اللہ (ج) شیخ حبیب اللہ (د) شیخ حبیب اللہ — (د)

7۔ مولانا شبلی نعمانی کے والد کا پیشہ تھا:
(الف) جج (ب) ڈاکٹر (ج) کسان (د) وکیل — (د)

8۔ مولانا شبلی کس کالج میں استاد مقرر تھے؟
(الف) گورنمنٹ کالج (ب) علی گڑھ کالج (ج) اورینٹل کالج (د) پنجاب یونی ورسٹی — (ب)

9۔ شبلی نعمانی نے علی گڑھ کالج میں پڑھایا:
(الف) سات برس (ب) دس برس (ج) تیرہ برس (د) سولہ برس — (د)

11۔ شبلی نعمانی نے پروفیسر تھامس آرنلڈ سے سیکھی:
(الف) انگریزی (ب) فارسی (ج) فرانسیسی (د) جرمن — (ج)

12۔ شبلی نعمانی نے پروفیسر تھامس آرنلڈ کو پڑھائی:
(الف) فارسی (ب) عربی (ج) اُردو (د) فرانسیسی — (ب)

13۔ مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ کالج میں پڑھاتے تھے:
(الف) فارسی (ب) اُردو (ج) انگریزی (د) ہندی — (الف)

14۔ مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی ممالک کا سفر کیا:
(الف) مصر، ترکی (ب) مصر، شام (ج) شام، ایران (د) افغانستان، یمن — (ب)

15۔ اسلامی ممالک کی سیر کے دوران میں مولانا شبلی نعمانی کے شریکِ سفر تھے:
(الف) مولانا الطاف حسین حالی (ب) سرسید احمد خاں (ج) آرنلڈ (د) ولیم — (ج)

16۔ مولانا شبلی نعمانی نے علی گڑھ کالج سے استعفیٰ دیا:
(الف) 1890ء (ب) 1895ء (ج) 1898ء (د) 1899ء — (ج)

17۔ شبلی نعمانی سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ سے چلے گئے:
(الف) حیدر آباد دکن (ب) لکھنؤ (ج) دہلی (د) کلکتہ — (الف)

18۔ شبلی نعمانی حیدر آباد دکن میں کس عہدے پر فائز رہے:
(الف) ڈپٹی انسپکٹر مدارس (ب) ہیڈ ماسٹر (ج) جج (د) ناظم تعلیمات — (د)

19۔ شبلی نعمانی حیدر آباد دکن میں ناظم تعلیمات رہے:
(الف) دو سال (ب) تین سال (ج) چار سال (د) پانچ سال — (ج)

20۔ مولانا شبلی نعمانی نے حیدر آباد دکن میں کس ادارے کی نظامت سنبھالی؟
(الف) ندوۃ العلما (ب) دائرۃ المعارف (ج) دائرۃ العلوم (د) دائرۃ الحزن — (ب)

21۔ مولانا شبلی نعمانی کی کوشش سے ادارے کا قیام عمل میں آیا:
(الف) ندوۃ العلما (ب) دار العلوم (ج) جامعۃ العلوم (د) مخزن العلوم — (الف)

22۔ اعظم گڑھ میں "دار المصنفین" کا ادارہ قائم کیا:
(الف) مولانا الطاف حسین حالی نے (ب) مولانا محمد حسین آزاد نے (ج) مولانا ظفر علی خان نے (د) مولانا شبلی نعمانی نے — (د)

23۔ شبلی نعمانی کی شہرت کا مدار زیادہ تر ہے:
(الف) نظم پر (ب) غزل پر (ج) نثر پر (د) تنقید پر — (ج)

24۔ "سیرت النبی ﷺ" تصنیف ہے:
(الف) مولانا الطاف حسین حالی کی (ب) مولانا ظفر علی خان کی (ج) مولانا شبلی نعمانی کی (د) مولانا محمد حسین آزاد کی — (ج)

25۔ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ کی جلدیں لکھیں:
(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ — (الف)

26۔ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب "شعر العجم" کی جلدیں ہیں:
(الف) تین (ب) پانچ (ج) سات (د) نو — (ب)

27۔ سبق "اخلاقِ نبوی" لیا گیا ہے:
(الف) سیرت النبی جلد اول (ب) سیرت النبی جلد دوم (ج) سیرت النبی جلد سوم (د) سیرت النبی جلد چہارم — (ب)

28۔ "سیرت النبی" کی تکمیل کی:
(الف) مولانا ظفر علی خاں نے (ب) مولانا الطاف حسین حالی نے (ج) سید سلیمان ندوی نے (د) مولانا محمد حسین نے — (ج)

29۔ شبلی نعمانی نے وفات پائی:
(الف) 1911ء (ب) 1912ء (ج) 1913ء (د) 1914ء — (د)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ مداومتِ عمل سے مُراد ہے:
(الف) حسنِ عمل (ب) حسنِ سلوک (ج) عمل کا استقلال (د) بے عملی — (ج)

2۔ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ وہ اس کی بن جائے:
(الف) فطرت (ب) فطرتِ ثانیہ (ج) عادت (د) معمول — (ب)

3۔ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر قائم رہے:
(الف) ثابت قدمی سے (ب) مداومت سے (ج) مستقل مزاجی سے (د) استقلال سے — (د)

4۔ استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کے الفاظ ہیں:
(الف) ہم آواز (ب) مُہمل (ج) متضاد (د) ہم معنی — (د)

5۔ انسان کے سوا دنیا کی ہر مخلوق صرف ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہے:
(الف) فطرتاً (ب) مجبوراً (ج) عادتاً (د) جبراً — (الف)

6۔ اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاقِ حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی پابندی کرے:
(الف) خوشی سے (ب) مستقل مزاجی سے (ج) شدت سے (د) ثابت قدمی سے — (ج)

7۔ انسان اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اخلاقِ حسنہ پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر ہے:
(الف) قادر (ب) مجبور (ج) پابند (د) آزاد — (ب)

8۔ مداومتِ عمل پر کاربند رہنے والے انسان سے افعال صادر ہوتے ہیں جیسے:
(الف) آفتاب سے روشنی (ب) درخت سے پھل (ج) پھول سے خوش بو (د) تمام — (د)

9۔ آپ خاتم النبیین ﷺ اپنے تمام کاموں میں پابندی فرماتے تھے:
(الف) وقت کی (ب) ثابت قدمی کی (ج) مداومتِ عمل کی (د) مستقل مزاجی کی — (ج)

10- آپ خاتم النبیین ﷺ نے جس کام کو جس طریقہ سے، جس وقت شروع فرمایا اس پر قائم رہے:
(الف) پابندی سے (ب) شدت سے (ج) باقاعدگی سے (د) نرمی سے (ب)

11- سنت کا لفظ اسی اصول سے پیدا ہوا ہے:
(الف) ہماری معاشرت میں (ب) ہماری تاریخ میں (ج) ہماری شریعت میں (د) ہماری فقہ میں (ج)

12- سنت وہ فعل ہے، جس پر حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ نے ہمیشہ فرمائی:
(الف) مستقل مزاجی (ب) ثابت قدمی (ج) استقامت (د) مداومت (د)

13- جس قدر سنن ہیں، وہ درحقیقت ناقابلِ انکار مثالیں ہیں، آپ خاتم النبیین ﷺ کی استقامتِ حال اور:
(الف) ثابت قدمی کی (ب) مداومتِ عمل کی (ج) مستقل مزاجی کی (د) استقلال کی (ب)

14- سنت کی جمع ہے:
(الف) سنہ (ب) سنین (ج) سنن (د) سنات (ج)

15- کسی سے ملتے وقت آپ خاتم النبیین ﷺ پہل کرتے تھے:
(الف) خیر مقدم میں (ب) سلام ومصافحہ میں (ج) تواضع میں (د) خاطر مدارات میں (ب)

16- کسی سے ملتے وقت آپ خاتم النبیین ﷺ کا معمول تھا کہ:
(الف) خود سلام ومصافحہ فرماتے (ب) سلام کا جواب دیتے (ج) حوصلہ افزائی فرماتے (د) دل شکنی نہ کرتے (الف)

17- کوئی شخص جھک کر آپ خاتم النبیین ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے، جب تک وہ خود نہ ہٹاتا۔
(الف) رُخ (ب) چہرہ (ج) منھ (د) نگاہ (ج)

18- مجلس میں بیٹھتے تو ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے آپ خاتم النبیین ﷺ کے:
(الف) پاؤں (ب) ہاتھ (ج) بازو (د) زانو (د)

19- آپ خاتم النبیین ﷺ کے خدمت گزار پانی لے کر آتے کہ اس میں ہاتھ ڈالیں، تا کہ پانی ہوجائے:
(الف) صاف وشفاف (ب) میٹھا (ج) پاک وصاف (د) متبرک (د)

20- اکثر نوکر چاکر، غلام خدمتِ اقدس میں لے کر آتے:
(الف) دودھ (ب) پانی (ج) پھل (د) کھانا (ب)

21- آپ خاتم النبیین ﷺ کے خدمت گزار کس وقت پانی لے کر آتے؟
(الف) صبح کو (ب) دوپہر کو (ج) شام کو (د) رات کو (الف)

22- مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو فرماتے:
(الف) برداشت (ب) ناپسند (ج) گوارا (د) منع (الف)

23- کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے آپ خاتم النبیین ﷺ:
(الف) تعریف فرماتے (ب) تذکرہ نہ فرماتے (ج) تذکرہ فرماتے (د) نصیحت فرماتے (ب)

24- ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں لگا کر حاضر ہُوا:
(الف) عود (ب) عنبر (ج) زعفران (د) مُشک (ج)

25- ایک صاحب آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں زعفران لگا کر حاضر ہوئے اور جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ ان سے کہہ دینا:
(الف) زعفران نہ لگائیں (ب) یہ رنگ دھو ڈالیں (ج) یہ خوش بو نہ لگائیں (د) زعفران لگا لیا کریں (ب)

26- مجلس نبوی میں جگہ ہوتی تھی:
(الف) کم (ب) زیادہ (ج) بہت کم (د) بُہت زیادہ (ج)

27- مسجد نبوی خاتم النبیین ﷺ میں جو لوگ پہلے آ کر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بعد باقی نہ رہتی تھی:
(الف) گنجائش (ب) جگہ (ج) صف (د) زمین (ب)

28- مسجد نبوی خاتم النبیین ﷺ میں جگہ بُہت کم ہوتی تھی اس لیے آپ خاتم النبیین ﷺ بعد میں آنے والوں کے لیے بچھا دیتے:
(الف) صف (ب) کپڑا (ج) دری (د) ردائے مبارک (د)

29- کسی کی کوئی بات بُری معلوم ہوتی تو آپ خاتم النبیین ﷺ مجلس میں اُس کا نام لے کر نہیں کرتے تھے:
(الف) تذکرہ (ب) ذکر (ج) تعارف (د) مشہور (ب)

30- کسی کی کوئی بات بُری معلوم ہوتی تو آپ خاتم النبیین ﷺ مجلس میں اُس کا نام لے کر ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ فرماتے تھے:
(الف) صیغۂ جمع متکلم میں (ب) صیغۂ واحد مذکر متکلم میں (ج) صیغۂ تعمیم میں (د) صیغۂ واحد متکلم میں (ج)

31- آپ خاتم النبیین ﷺ مجلس میں طریقۂ ابہام اس لیے اختیار کرتے تھے کہ شخصِ مخصوص کی نہ ہو:
(الف) رسوائی (ب) ذلت (ج) بے عزتی (د) تذلیل (ب)

32- آپ خاتم النبیین ﷺ مجلس میں سمجھاتے ہوئے اختیار کرتے تھے:
(الف) صیغۂ جمع متکلم (ب) صیغۂ واحد مذکر متکلم (ج) صیغۂ تعمیم (د) صیغۂ واحد متکلم (ج)

33- آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق وعادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا، وہ تھا:
(الف) تحمل (ب) شفقت (ج) برداشت (د) ایثار (د)

34- آپ خاتم النبیین ﷺ کو اولاد سے بے انتہا تھی:
(الف) انسیت (ب) شفقت (ج) محبت (د) دل لگی (ج)

35- حضرت فاطمہؓ جب آپ خاتم النبیین ﷺ کے پاس تشریف لاتیں تو فرطِ محبت سے:
(الف) بٹھاتے (ب) کھڑے ہوجاتے (ج) بیٹھ جاتے (د) دعا دیتے (ب)

36- حضرت فاطمہؓ جب تشریف لاتیں، فرطِ محبت سے آپ خاتم النبیین ﷺ پیشانی پر بوسہ دیتے اور انھیں بٹھاتے:
(الف) اپنے سامنے (ب) دائیں طرف (ج) اپنی جگہ پر (د) کرسی پر (ج)

37- حضرت فاطمہؓ خود پیستیں:
(الف) چکی (ب) دال (ج) چنے (د) باجرہ (الف)

38- حضرت فاطمہؓ خود ہی بھر کر لاتیں:
(الف) پانی کی بالٹی (ب) پانی کا گھڑا (ج) پانی کی مشک (د) پانی کی صراحی (ج)

39- حضرت فاطمہؓ کی ہتھیلیاں گھِس گئی تھیں:
(الف) برتن دھونے سے (ب) چکی پیسنے سے (ج) کپڑے دھونے سے (د) جھاڑو دینے سے (ب)

40- ایک دن حضرت فاطمہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو عرضِ حال نہ کر سکیں:
(الف) پاسِ حیا سے (ب) شرم وحیا کی وجہ سے (ج) حجاب کی وجہ سے (د) لحاظ کی وجہ سے (الف)

41- نبی کریم خاتم النبیین ﷺ جب سفر پر جاتے تو حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے:
(الف) کسی بھی وقت (ب) سب سے پہلے (ج) سب سے آخر میں (د) صبح کے وقت (ج)

42- حضرت فاطمہؓ آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں، پاسِ حیا سے عرضِ حال نہ کر سکیں تو ان کی طرف سے یہ عرضِ حال کی:
(الف) حضرت حسنؓ نے (ب) حضرت حسینؓ نے (ج) جنابِ امیرؓ نے (د) حضرت امیر حمزہؓ نے (ج)

43- نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابھی انتظام نہیں ہُوا:
(الف) مسکینوں کا (ب) اصحاب صفہ کا (ج) صحابہ کرام کا (د) مہاجرین کا (ب)

44- آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تک اصحاب صفہ کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف نہیں کر سکتا:
(الف) دھیان (ب) خیال (ج) توجہ (د) کام (ج)

45- آپ ﷺ کو عار نہ تھی:
(الف) اونٹ کی سواری سے (ب) گھوڑے کی سواری سے (ج) خچر کی سواری سے (د) گدھے کی سواری سے (د)

46- آپ ﷺ کو کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا:
(الف) غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ (ب) غریبوں اور یتیموں کے ساتھ (الف)
(ج) غریبوں اور غلاموں کے ساتھ (د) غریبوں اور مفلسوں کے ساتھ

47 ایک دفعہ آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے تو لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے:
(الف) احترام میں (ب) تکریم کے لیے (ج) اعزاز میں (د) تعظیم کے لیے (د)

48- ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن ہیبت کا اس قدر رعب طاری ہُوا کہ وہ:
(الف) مرعوب ہو گیا (ب) خوف زدہ ہو گیا (ج) کانپنے لگا (د) ڈر گیا (ج)

49- آپ ﷺ نے فرمایا تعظیم کے لیے نہ اُٹھو:
(الف) مشرکوں کی طرح (ب) یہودیوں کی طرح (ج) اہل عجم کی طرح (د) جاہلوں کی طرح (ج)

50- غریب سے غریب بیمار ہوتا تو آپ ﷺ:
(الف) دعا دیتے (ب) عیادت کرتے (ج) دوا دیتے (د) تسلی دیتے (ب)

51- ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا تو اس پر طاری ہُوا:
(الف) خوف (ب) لرزہ (ج) ہیبت کا رعب (د) خوف و ہیبت (ج)

52- نبی کریم ﷺ سے ملنے والے ایک شخص پر رعب طاری ہوا، آپ ﷺ نے اس کی:
(الف) شہرت کا (ب) دولت کا (ج) نبوت کا (د) قبیلے کا (ج)

53- آپ ﷺ نے فرمایا میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو کھایا کرتی تھی:
(الف) روٹی (ب) سوکھا گوشت (ج) سبزی (د) چاول (ب)

54- آپ ﷺ بچوں پر فرماتے تھے:
(الف) رحم (ب) کرم (ج) مہربانی (د) شفقت (د)

55- آپ ﷺ کا معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔
(الف) اونٹ پر (ب) گھوڑے پر (ج) گود میں (د) سواری پر (د)

56- راستے میں بچے ملتے تو ان کو:
(الف) دعا دیتے (ب) سلام کرتے (ج) نصیحت کرتے (د) مصافحہ فرماتے (ب)

57- ایک دن خالد بن سعید خدمتِ اقدس میں آئے۔ ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی جس کے بدن پر کُرتا تھا:
(الف) نیلے رنگ کا (ب) سرخ رنگ کا (ج) پیلے رنگ کا (د) سبز رنگ کا (ب)

58- حبشی زبان میں سنہ کہتے ہیں:
(الف) خوب صورت کو (ب) نیک کو (ج) حسنہ کو (د) احسن کو (ج)

59- آپ ﷺ کی محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ آپ ﷺ اسی طرح لطف فرماتے تھے:
(الف) یہودیوں کے بچوں پر (ب) مشرکین کے بچوں پر (ج) عیسائیوں کے بچوں پر (د) منافقین کے بچوں پر (ب)

60- ایک غزوہ میں بچے مارے گئے:
(الف) منافقین کے (ب) عیسائیوں کے (ج) کفار کے (د) مشرکین کے (د)

61- آپ ﷺ نے فرمایا تم سے بچے بہتر ہیں:
(الف) کفار مکہ کے (ب) یہودیوں کے (ج) مشرکین کے (د) مسلمانوں کے (ج)

62- نبی کریم ﷺ فصل کا میوہ سب سے پہلے دیتے تھے:
(الف) نوجوانوں کو (ب) بچوں کو (ج) بوڑھوں کو (د) بڑوں کو (ب)

63- ایک دفعہ ایک بدوی حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا میرے بچے ہیں:
(الف) پانچ (ب) سات (ج) دس (د) بارہ (ج)

64- آپ ﷺ نے ایک بدوی صحابی سے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تمھارے دل سے جو چھین لے تو میں کیا کروں؟"
(الف) خلوص کو (ب) محبت کو (ج) اخلاص کو (د) تقویٰ کو (ب)

65- نبی کریم ﷺ کبھی کبھار ظرافت کی باتیں فرماتے۔ ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا:
(الف) او خوب صورت آنکھوں والے (ب) او ایک کان والے
(ج) او دو کان والے (د) او چار کان والے (ج)

66- آپ ﷺ نے دو کان والے کہہ کر پکارا:
(الف) حضرت طلحہؓ کو (ب) حضرت زیدؓ کو (ج) حضرت بلالؓ کو (د) حضرت انسؓ کو (د)

67- حضرت انسؓ تھے:
(الف) اطاعت شعار (ب) دولت مند (ج) ذہین (د) عقل مند (الف)

68- حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام تھا:
(الف) ابولبابہ (ب) ابوالقاسم (ج) ابوعمر (ابوعمیرؓ) (د) ابوذر (ج)

69- ابوعمر نے پال رکھا تھا: (احادیث میں نام ابوعمیرؓ آیا ہے)
(الف) طوطا (ب) کبوتر (ج) بلبل (د) مولا (د)

70- ابوعمر کا مولا:
(الف) مر گیا (ب) اُڑ گیا (ج) بیمار ہو گیا (د) سو گیا (الف)

71- ابوعمر کا مولا مر گیا تو اسے:
(الف) افسوس ہوا (ب) دکھ ہوا (ج) رنج ہوا (د) ملال ہوا (ج)

72- ایک شخص نے سواری کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تمھیں دوں گا:
(الف) اونٹ (ب) خچر (ج) گھوڑا (د) اونٹنی کا بچہ (د)

73- آپ ﷺ نے فرمایا جنت میں نہیں جائیں گی:
(الف) جوان عورتیں (ب) لڑکیاں (ج) بوڑھی عورتیں (د) بچیاں (ج)

74- بوڑھیاں جنت میں جائیں گی:
(الف) جوان ہو کر (ب) فوت ہو کر (ج) دوبارہ زندہ ہو کر (د) نیکوکار ہو کر (الف)

75- ایک بدوی صحابی جو حضور اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے، کا نام تھا:
(الف) زیدؓ (ب) مصعبؓ (ج) زاہرؓ (د) اسامہؓ (ج)

76- گاؤں سے چیزیں لا کر شہر میں بیچا کرتے تھے:
(الف) حضرت زیدؓ (ب) حضرت زاہرؓ (ج) حضرت اسامہؓ (د) حضرت حنظلہؓ (ب)

77- آپ ﷺ نے گود میں بٹھا لیا:
(الف) حضرت حنظلہؓ کو (ب) حضرت سعدؓ کو (ج) حضرت اسامہؓ کو (د) حضرت زاہرؓ کو (د)

78۔ ایک شخص نے شکایت کی کہ میرے بھائی کے پیٹ میں ہے:
(الف) گرانی (ب) درد (ج) تکلیف (د) مروڑ (الف)

79۔ ایک شخص نے شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ اُسے:
(الف) دودھ پلاؤ (ب) لسی پلاؤ (ج) شہد پلاؤ (د) شربت پلاؤ (ج)

80۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا خدا سچا ہے، شہد میں ہے:
(الف) شفا (ب) غذا (ج) مٹھاس (د) راحت (ب)

81۔ چوتھی بار وہ شخص آیا تو حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "خدا سچا ہے لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ ہے":
(الف) جھوٹا (ب) سخت (ج) نرم (د) سچا (الف)

82۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں جاتے:
(الف) حضرت اُم کلثومؓ کے پاس (ب) حضرت فاطمہؓ کے پاس (ج) حضرت حفصہؓ کے پاس (د) حضرت عائشہؓ کے پاس (ب)

83۔ آپ خاتم النبیین ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے آپ خاتم النبیین ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتیں:
(الف) حضرت حفصہؓ (ب) حضرت حلیمہؓ (ج) حضرت امّ کلثومؓ (د) حضرت فاطمہؓ (د)

84۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے حسنینؓ کو کنگن منگوا کر دیے:
(الف) سونے کے (ب) چاندی کے (ج) ہاتھی دانت کے (د) پیتل کے (ج)

85۔ حضرت فاطمہؓ جب تشریف لاتیں تو فرطِ محبت سے ہو جاتے:
(الف) خوش (ب) کھڑے (ج) آبدیدہ (د) مسرور (ب)

86۔ حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحب زادوں کے لیے کنگن بنوائے تھے:
(الف) چاندی کے (ب) پیتل کے (ج) سونے کے (د) ہاتھی دانت کے (الف)

87۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کو حسنین کریمینؓ سے بے انتہا محبت تھی فرماتے تھے یہ میرے ہیں:
(الف) پھول (ب) باغ (ج) شیر (د) گل دستے (د)

88۔ حسنینؓ کو آپ خاتم النبیین ﷺ کہتے تھے:
(الف) میرے نواسے (ب) میرے گل دستے (ج) میرے بیٹے (د) میرے پیارے (ب)

89۔ ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حضرت امام حسینؓ کپڑے پہنے ہوئے آئے:
(الف) سفید (ب) سیاہ (ج) سُرخ (د) سبز (ج)

90۔ ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ سوار تھے:
(الف) گھوڑے پر (ب) دوش مبارک پر (ج) اونٹ پر (د) گود میں (ب)

91۔ حضرت زینبؓ کے شوہر قید ہو کر آئے:
(الف) خندق سے (ب) اُحد سے (ج) حنین سے (د) بدر سے (د)

92۔ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا:
(الف) کنگن (ب) ہار (ج) سونا (د) گلوبند (ب)

93۔ حالتِ نزع میں تھی آپ خاتم النبیین ﷺ کی:
(الف) بیٹی (ب) بھتیجی (ج) بھانجی (د) نواسی (د)

مُصنف
خواجہ حسن نظامی
(1873-1955)

سبق ۴: فاقہ میں روزہ

مصنف کا تعارف

اصل نام "سید علی حسن" تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی ہمشیرہ کی اُولاد میں سے تھے اور ساری زندگی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے زیرِ سایہ گزاری۔ درگاہ کے متولی تھے۔ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ شروع ہی سے کتب بینی کا شوق تھا، اپنی ہمت اور شوق سے پڑھا۔ شروع میں کتابیں بیچتے تھے پھر کتابیں لکھیں، رسالوں کے مدیر ہوئے اور ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ انھوں نے بے شمار مضامین، پمفلٹ اور کتابیں لکھیں۔ موضوعات کا تنوع ان کا خاصہ تھا۔ روحانیات اور مذہبیات سے لے کر عملی زندگی اور تراکیب و نسخوں سمیت انھوں نے ہر موضوع پر لکھا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور مغلیہ خاندان کی بربادی ان کے خاص موضوعات تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں: "بیگمات کے آنسو"، "سی پارۂ دل"، "غدرِ دہلی کے افسانے" اور "مضامینِ حسن نظامی" زیادہ مشہور ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار اُردو کے منفرد اور صاحبِ طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی، روانی اور تاثیر کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ اپنے دور کی دہلی کی رواں، شستہ اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں جس میں وہ بے تکلفی لیکن چستی اور موزونیت سے کام لے کر سوز و گداز کا عنصر پیدا کر دیتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کو مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری میں خاص ملکہ اور مقام حاصل ہے۔ انھوں نے نہایت ہی منفرد، انوکھے اور دل چسپ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی معمولی چیز کو موضوع بنا لیتے ہیں اور اپنے اسلوبِ تحریر اور منفرد و متنوع زاویۂ نگاہ سے اس میں نئی دل چسپیاں اور انوکھے زاویے پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا انداز ایک کھلے ذہن، کھلے اور وسیع المشرب نقطۂ نظر رکھنے والے صوفی کا ہے۔

تصانیف

بیگمات کے آنسو، سی پارۂ دل، دہلی کی آخری شمع، بہادر شاہ کا روزنامچہ، دہلی کی سزا، سفر نامہ حجاز و مصر و شام، جگ بیتی کہانیاں، انگریزوں کی بپتا، محرم نامہ، طمانچہ بر رخسارِ یزید وغیرہ۔

- ☆ طلبہ کے ادبی ذوق کی تربیت کرنا۔
- ☆ طلبہ کے سماجی، سیاسی اور اخلاقی شعور میں اضافہ کرنا۔
- ☆ "فاقہ میں روزہ" جیسے مضامین سماجی مسائل اور غربت کی حالت کو بیان کرتے ہیں، خواجہ حسن نظامیؒ کے مقصدِ تحریر کو سمجھنا۔
- ☆ طلبہ میں ہمدردی اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی ترغیب پیدا کرنا۔

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر (21) فاقہ (بھوکا رہنا)، دہلوی: (دہلی میں رہنے والا)، تاج دار: (تاج والا، مراد بادشاہ)، کنبہ: (خاندان، گھرانہ)، فسانہ (کہانی، قصہ)، دہلی زندہ تھی: (مراد دہلی آباد تھی اور پُر رونق تھی)، لال قلعہ: (دلی میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کا تعمیر کردہ مشہور قلعہ، جہاں مغل بادشاہ بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کیا کرتے تھے)، تیموریوں: (امیر تیمور کی اولادوں، مراد مغل بادشاہ)، آخری نشان: (آخری علامت، مراد جھنڈا)، مردانہ مکان: (محل کا وہ حصہ جو مرد حضرات کے بیٹھنے کے لیے مخصوص ہو)، بے تکلفانہ: (دوستانہ انداز)، زنان خانہ: (محل کا وہ حصہ جو عورتوں کے لیے مخصوص ہو)، لونڈی: (کنیز)، عرض کیا: (گزارش کی)، مغموم: (غم زدہ، رنجیدہ) بے تکلف ندیم: (وہ دوست جس سے کوئی تکلف نہ ہو، قریبی دوست)، خیر باشد: (خیر ہو، خیریت ہے)،

مزاجِ عالی: (جناب کے مزاج، جناب کی طبیعت)، **مکدر:** (اداس، ناراض)، **خواہ مخواہ:** (بلاوجہ)، **گویّا:** (گانا گانے والا، گلوکار)، **شورغل:** (شورشرابا)، **ناگوار:** (ناپسندیدہ) **مخلیس:** (مجلیس)، **تفریحی:** (دل کو خوش کرنے والا) **لحاظ** (پاس داری)، **جی الجھنا:** (دل پریشان ہونا، دل گھبرانا)، **مصاحب:** (دوست) **ہاتھ باندھ کر:** (نہایت ادب سے)، **عرض کیا:** (گزارش کی)، **جامع مسجد:** (دہلی کی مشہور مسجد، مسجدِ جہاں نما، جسے شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا) **عجب بہار:** (مرادمنفرد رونق)، **رنگ برنگ:** (قسم قسم کے، طرح طرح کے)، **جگمگٹے:** (ہجوم، رش)، **خداوالوں:** (اللہ والوں، مراد نیک لوگ، اولیا)، **صلاح:** (مشورہ)، **مصاحبوں:** (دوستوں)، **جامع مسجد:** (دہلی کی مشہور مسجد، مسجد جہاں نما، جسے شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا)، **عجب عالم:** (عجیب منظر)، **حلقہ:** (دائرہ)، **قرآن کے دور:** (قرآن کی دہرائی، حافظوں کا ایک دوسرے کو زبانی قرآن سنانا) **حفاظ:** (حافظ کی جمع جن کو قرآن زبانی یاد ہو)، **مسائلِ دین:** (زندگی کے مسائل کے بارے میں دین کے احکام)، **فقہی مسئلہ:** (قرآن وسنت کی روشنی میں کسی مسئلہ کا حکم)، **مراقبہ:** (تمام خیالات چھوڑ کر اللہ کی جانب متوجہ ہونا)، **وظائف:** (وظیفہ کی جمع، مقررہ تعداد میں تسبیح اور ذکر وغیرہ پڑھنا)، **مشغول:** (مصروف)، **ہجوم:** (رش)، **کُلُّ جدید لذید:** (عربی مقولہ، ہر نئی چیز مزے دار ہوتی ہے)

نمبر 22 خوان (کھانے کے تھال) **محل سلطانی:** (شاہی محل)، **متعدد خوان:** (کئی کھانوں کے تھال)، **مکلف چیزوں:** (مزیدار چیزوں)، **آراستہ:** (سجا ہوا)، **امرا:** (امیر کی جمع، دولت مند)، **خوانوں:** (خوان کی جمع، کھانے کے تھال)، **آرائش:** (سجاوٹ)، **دینی چرچے:** (دینی رونق، مذہبی جوش) **فقرا:** (فقیر کی جمع، درویش)، **سحری:** (صبح صادق) **اول شب:** (رات کا آغاز)، **خانقاہوں:** (روحانی تربیت گاہیں، درویشوں کے رہنے کی جگہ)، **نوعمری:** (جوانی)، **صحبت:** (ہمراہی، ساتھ رہنا)، **بےتکلف:** (بے دھڑک، دوستانہ انداز میں)، **زیروزبر:** (تہ وبالا، تباہ وبرباد)، **گھر اکھڑ گئے:** (گھر تباہ ہوگئے)، **ماما گیری کرنا:** (خدمت کرنا، ملازمت کرنا)، **شان وشوکت:** (ٹھاٹ، رعب ودبدبہ)، **تاراج ہونا:** (لُٹ جانا، برباد ہونا)، **دانہ دلنا:** (دانے پیسنا)، **انبار:** (ڈھیر) **شاہ جہاں:** (پانچواں مغل بادشاہ، مکمل نام شہاب الدین محمد شاہ جہاں تھا، اسے تعمیرات سے دل چسپی تھی، اس نے بہت سی شاہکار عمارتیں بنوائیں)، **بے مثل:** (لاثانی، جس کی کوئی مثال نہ ہو)، **اصطبل:** (گھوڑے باندھنے کی جگہ)، **واگزاشت:** (قبضہ چھڑانا)، **سرکار:** (حکومت)، **میلے کچیلے:** (گندے)، **پیوند لگے کپڑے:** (پھٹے پرانے کپڑے)، **قرآن کے دور:** (قرآن کی دہرائی، حافظوں کا ایک دوسرے کو زبانی قرآن سنانا)، **پریشان حالی:** (تنگ دستی، مصیبت زدگی)، **وظیفہ پڑھنا:** (مقررہ تعداد میں تسبیح اور ذکر وغیرہ پڑھنا)، **دال سیو:** (دال کی ایک قسم، معمولی کھانا) **ترکاری:** (سبزی)، **قتلے:** (ٹکڑے، قاش)، **اگلا ساسماں:** (پہلے جیسا منظر)، **چہل پہل:** (رونق)، **شان وشوکت:** (ٹھاٹ، رعب ودبدبہ)، **فلک کے مارے:** (آسمان کے ستائے، مراد تقدیر کے ستائے)، **دب جانا:** (مغلوب ہونا)، **غربا:** (غریب کی جمع، مفلس، نادار)، **غنیمت:** (فائدہ، شکر کا مقام)، **غدر:** (بغاوت، 1857ء کی جنگِ آزادی جسے انگریز غدر یا بغاوت کا نام دیتے تھے)، **فسانہ:** (کہانی، قصہ)، **عذر:** (بہانہ، ٹال مٹول)، **اِصرار:** (ضد، بار بار کہنا)، **دردناک:** (تکلیف دہ)، **سنگینوں:** (نوک دار چھری جو بندوق کے آگے لگاتے ہیں)، **آتش ناک:** (آگ برسانے والا)، **مینہ برس چکا:** (بارش ختم ہوگئی)، **بےچادر:** (چادر کے بغیر)، **وارثوں:** (وارث کی جمع، قریبی رشتہ دار)، **بےیارومددگار:** (بے سہارا، جس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو)، **ظلِ سبحانی:** (اللہ کا سایہ، مراد بادشاہ بہادر شاہ ظفر)، **کم سن:** (نوعمر، چھوٹی عمر) **اجڑے:** (ویران، برباد)

نمبر 23 سالار (رہنما، رہبر)، **کوچ کرنا** (سفر کرنا)، **رتھوں:** (رتھ کی جمع، گھوڑا گاڑی)، **غازی پور:** (ہندوستان کی ایک ریاست یوپی کا شہر)، **لشکر:** (سپاہ، فوج)، **جولان گاہ:** (میدانِ جنگ)، **شاہدرہ:** (ایک علاقے کا نام)، **قطب صاحب:** (ایک علاقے کا نام جہاں صوفی بزرگ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے)، **چھترپور:** (ایک علاقے کا نام) **گوجروں:** (ایک قوم کا نام) **لق ودق:** (ویران، سنسان)، **دشوار:** (مشکل)، **زاروقطار رونا:** (لگا تار رونا، شدت سے رونا) **کلیجہ پھٹنا:** (جگر پھٹنا، صدمے کی تاب نہ لانا)، **ٹوٹا بوریا:** (پھٹا پرانا بستر، چٹائی)، **سہمی:** (خوف زدہ، گھبرائی) **بےکسی:** (بےبسی، مجبوری) **معصوم:** (بےقصور) **دلاسا:**

(تسلی) **ہمت بندھائی:** (حوصلہ دیا)، **ٹھوکریں کھانا:** (پامال ہونا، دربدر ہونا) **تاجور:** (تاج والے، بادشاہ) **بےبس:** (مجبور) **بےکسوں:** (بےسہاروں)، **چنگیز خان:** (منگول نسل سے تعلق رکھنے والا مشہور فاتح، اصل نام تموجن تھا، تیموری اور مغل اسی کی نسل سے تھے)، **تیمور:** (امیر تیمور، مشہور فاتح، مغل بادشاہ اسی کی نسل سے تھے) **شہریاروں:** (بادشاہوں)، **شاہ جہاں:** (پانچواں مغل بادشاہ، مکمل نام شہاب الدین محمد شاہ جہاں تھا) **ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھادی:** (تاج محل کی تعمیر کی جانب اشارہ ہے جو شاہ جہاں نے اپنی ملکہ کے لیے مقبرہ بنوایا تھا) **جواہر نگار:** (ہیرے جواہرات سے مزین) **بےنظیر:** (لاثانی، بےمثال)، **مسجد دہلی:** (مراد جامع مسجد دہلی جسے شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا) **شہنشاہ:** (بادشاہوں کا بادشاہ) **کنبے:** (خاندان) **سرکشی:** (نافرمانی، بغاوت)، **رونگٹے کھڑے ہونا:** (خوف سے جسم پر موجود باریک بال کھڑے ہونا)، **القصہ:** (مختصر یہ کہ)، **بہ ہزار دقت:** (ہزار مشکلوں سے، بڑی مشکل سے)، **میواتی:** (ایک قوم کا نام، میوات کی رہنے والی میو قوم) **چوپاڑ:** (چوپال، لکڑیوں اور گھاس پھوس کا بنا برآمدہ)، **گنوار:** (اُجڈ، دیہاتی) **بار:** (بوجھ)، **ٹھالی:** (بےکار، فضول)، **ہوس:** (لالچ) **فلک:** (آسمان)، **عالیشان:** (شان دار، عظیم الشان) **اکتانا:** (بےزار ہونا) **سپاہی زادہ:** (سپاہی کا بیٹا) **تیغ:** (تلوار)، **تفنگ:** (بندوق)، **ہنر:** (فن، کمال)، **رکھوالی:** (حفاظت، نگہبانی)، **برس دن:** (سال بھر)

نمبر 24 جانور اڑانا: (مراد پرندے کھیت سے اڑانا) **بھادوں:** (برسات کا مہینا، بکرمی سال کا پانچواں مہینہ جو 15 اگست سے 15 ستمبر تک ہوتا ہے)، **اہلیہ:** (بیوی)، **لوٹ پوٹ کر:** (جیسے تیسے کر کے، زور مار کر)، **نالہ چڑھ آیا:** (نالے میں بہت زیادہ پانی آگیا)، **کمر کمر پانی ہونا:** (بہت زیادہ پانی ہونا)، **بدتر:** (بری)، **غرقِ آب:** (پانی میں ڈوبنا)، **چھپر:** (گھاس پھوس کا سائبان)، **بلّیوں:** (بلّی کی جمع، بانس)، **تر ہونا:** (بھیگ جانا گیلے ہونا)، **جاڑے:** (سردی) **اندھیرا گھپ:** (نہایت تاریکی)، **مینہ کی جھڑی:** (مسلسل بارش برسنا)، **ابتر:** (خراب)، **تڑپنا:** (تکلیف سے بےچین ہونا)، **نازونعمت:** (آرام اور خوش حالی)، **غدر:** (بغاوت، 1857ء کی جنگِ آزادی جسے انگریز غدر یا بغاوت کا نام دیتے تھے)، **گورغریباں:** (وہ قبرستان جہاں مسافروں یا غریبوں کی قبریں ہوں) **سڑجانا:** (خراب ہونا)، **لحاظ:** (شرم) **قطب صاحب:** (ایک علاقے کا نام جہاں صوفی بزرگ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے) **نصف:** (آدھا)، **دل بہت نازک تھا:** (حساس دل تھا، ایسا دل جو سختی برداشت نہ کر سکے) **ٹھنڈا سانس بھرا:** (آہِ سرد، غم کی وجہ سے سانس لینا)، **ڈھارس:** (تسلی، حوصلہ) **درپیش ہونا:** (سامنا ہونا)، **کوڑی:** (معمولی رقم کا پرانا سکہ)، **کلیجہ منھ کو آنا:** (دل گھبرانا، برا حال ہونا)، **ہوائیاں اڑنا:** (پریشانی میں چہرے کا رنگ فق ہونا)، **دلاسے:** (تسلی، حوصلہ)، **نڈھال:** (کمزور، سست)، **غوطہ سا:** (ڈبکی سی)، **ناتوانی:** (کمزوری)، **محال:** (ناممکن، مشکل)، **حاصلِ مطلب:** (نتیجہ، خلاصہ) **قصور:** (خطا)

نمبر 25 محتاج: (حاجت مند، ضرورت مند) **خطا:** (غلطی)، **کھیل:** (اناج کا معمولی سادانہ)، **نعمت:** (مال ودولت، خوشی) **قصہ:** (کہانی)، **شکرانہ:** (شکر ادا کرنا) **گردشِ فلک:** (زمانے کی گردش، انقلاب) **جوں کی توں:** (ویسے کی ویسے، اسی طرح)، **قدیمی غیرت داری:** (پرانی خودداری)، **متغیر:** (تبدیل)، **فاقہ:** (بھوک)، **ناتوانی:** (کمزوری)، **تیور بدلنا:** (انداز بدلنا، نگاہیں بدلنا)، **تُف:** (افسوس، لعنت) **غیرت:** (شرم، خودداری)، **خیرات:** (راہِ خدا میں مال یا کھانا دینا، صدقہ)، **حرارت نہیں مٹی:** (گرمی ختم نہیں ہوئی۔ وقار ختم نہیں ہوا)، **صدقہ خوری:** (صدقہ کھانا)، **شیوہ:** (عادت، طور طریقہ)، **پسینا آنا:** (شرمندہ ہونا)، **ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے:** (محاورہ، حوصلہ ہارنا)، **سہنا:** (برداشت کرنا)، **خیروخوبی:** (خیروعافیت)، **بسر ہونا:** (گزرنا)، **ماہوار:** (ہر مہینے، ماہانہ)، **پنشن:** (وظیفہ، امداد)، **انحصار:** (دارومدار)

توضیحات

دہلی: دہلی بھارت کا دارالحکومت ہے۔ دہلی دراصل دہلیز کا مخفف ہے یعنی ہندستان کے دروازے کی چوکھٹ، جسے فاتحین کے لیے عبور کرنا ضروری تھا۔ جو بھی ہندوستان پر حملہ کرتا وہ سب سے پہلے دہلی ہی کو اجاڑتا تھا۔ بعد ازاں اسے دلی کہا جانے لگا۔ انگریزوں نے بھی 1857ء میں جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو دلی میں خوب قتل وغارت کی۔

لال قلعہ: لال قلعہ دلی کا مشہور قلعہ تھا جہاں مغل بادشاہ بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کیا کرتے تھے۔ اسے سترھویں صدی میں پانچویں مغل بادشاہ شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ وسیع و عریض قلعہ تھا جس کے اردگرد سبزہ و ہریالی تھی۔ اس کی تعمیر میں دس سال کا عرصہ لگا تھا۔ یہ اپنے حسن و جمال میں بے مثال تھا۔ اس کی بعض عمارتوں میں سنگِ مرمر استعمال کیا گیا تھا اور چھتوں اور دیواروں پر سونے کے پانی سے دل کش نقاشی کی گئی تھی۔ دیوانِ خاص میں فارسی کا ایک شعر بھی کندہ کیا تھا، جس سے اس کی خوب صورتی کا اندازہ ہوتا ہے:

گر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے اور مینا بازاروں کا انعقاد بھی ہوتا تھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے دلی پر قبضہ کیا تو انھوں نے اس کا تقریباً 80 فی صد حصہ منہدم کر دیا۔ دراصل 1857ء کی جنگِ آزادی (جسے انگریز غدر کہتے تھے) میں میرٹھ سے آئے ہوئے مسلمان مجاہدین (جنھیں انگریز باغی کہتے تھے) اس قلعے کے اندر موجود عمارت میں ٹھہرے تھے۔ انھوں نے اسے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ اسی غصے میں انگریزوں نے قلعہ کے اندر کی عمارتوں کو نشانہ بنایا اور توڑ پھوڑ کر کے اس کے ایک بڑے حصے کو نقصان پہنچایا۔ ممکن تھا کہ مکمل تعمیرات کو منہدم کر دیا جاتا لیکن لارڈ کیننگ نے ایسا نہ کرنے کا حکم دیا جس کی وجہ سے ایک چھوٹا سا حصہ بچ گیا۔

تیموری: مشہور فاتح امیر تیمور کی اولاد کو تیموری کہا جاتا ہے۔ مغل بادشاہ تیموری ہی کی اولاد تھے۔ تیموری خاندان کے ایک سردار ظہیر الدین بابر نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کا خاتمہ 1857ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی معزولی کے بعد ہوا۔

مرزا سلیم بہادر: مرزا سلیم بہادر مشہور مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی اور ممتاز النسا بیگم کے بیٹے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بھائی تھے۔ 1799ء میں پیدا ہوئے اور 1836ء میں انھوں نے وفات پائی۔

ابوظفر بہادر شاہ: ابوظفر بہادر شاہ آخری مغل بادشاہ تھے۔ ان کا مکمل نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ 1775ء میں پیدا ہوئے اور 1862ء میں وفات پائی۔ اکبر شاہ ثانی کے دوسرے بیٹے تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے انھیں جلاوطن کر دیا اور برما کے شہر رنگون میں قید کر دیا۔ وہیں انھوں نے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں وفات پائی۔

جامع مسجد دہلی: دلی کی مشہور جامع مسجد، مسجد جہاں نما جو جامع مسجد دلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دہلی کی اہم ترین مسجد ہے۔ اسے مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے 1656ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے صحن میں تقریباً پچیس ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔ جامع مسجد کے شمالاً، جنوباً اور شرقاً تینوں اطراف میں سیڑھیاں ہیں جن پر روزانہ بازار لگا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں دن بھر رونق اور چہل پہل رہتی تھی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے یہاں کی تمام رونق اور چہل پہل ختم ہوگئی۔

فقہی مسئلہ: فقہی مسئلہ سے مراد قرآن و سنت کی روشنی میں کسی مسئلہ کے بارے میں شرعی حکم ہے۔

مراقبہ: مراقبہ سے مراد تمام خیالات چھوڑ کر اللہ کی جانب متوجہ ہونا ہے۔ یہ صوفیا کی ایک خاص مشق ہے جو وہ سیرِ باطن اور اپنے نفس کے محاسبہ کے لیے کرتے ہیں۔ مراقبہ میں تمام خیالات سے ذہن خالی کر کے، بالکل یک سو ہو کر، کسی گوشے میں آنکھیں بند کر کے اور سر جھکا کر اپنے قلب یا نفس پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔

وظائف: وظائف وظیفہ کی جمع ہے۔ مقررہ تعداد میں درود و تسبیح اور ذکر وغیرہ پڑھنا وظائف کہلاتا ہے۔

کُلُّ جدید للدید: مشہور عربی مقولہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے۔

شاہ جہاں: شاہ جہاں پانچواں مغل بادشاہ تھا۔ اس کا مکمل نام شہاب الدین محمد خرم شاہ جہاں تھا۔ 1592ء میں پیدا ہوا اور 1666ء میں وفات پائی۔ شاہ جہاں جہانگیر کا بیٹا تھا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد بادشاہ بنا۔ اس کے زمانے کو عہدِ زریں

بھی کہا جاتا ہے۔ اسے تعمیرات سے دل چسپی تھی، اس نے بہت سی شاہ کار عمارتیں بنوائیں جن کے آثار آج بھی قائم ہیں۔ ان میں تاج محل، ممتاز محل، لال قلعہ، موتی مسجد، تختِ طاؤس اور جامع مسجد دہلی شامل ہیں۔ تعمیرات میں دل چسپی کی وجہ سے اسے معمارِ شہنشاہ اور انجینئرِ شہنشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ 1658ء میں شاہ جہاں کو اس کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر نے معزول کر دیا تھا۔

غدر: غدر کے لغوی معنی بغاوت یا سرکشی ہیں۔ 1857ء کی جنگ کو مسلمان جنگِ آزادی کا نام دیتے ہیں جب کہ انگریز اور ہندو اسے غدر یعنی بغاوت یا سرکشی کا نام دیتے تھے۔

ظلِ سبحانی: ظلِ سبحانی کے لفظی معانی اللہ کا سایہ ہیں۔ یہ لفظ مجازاً بادشاہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ سبق میں اس سے مراد بہادر شاہ ظفر ہے جو آخری مغل بادشاہ تھا۔

غازی آباد: غازی آباد ہندوستان کی ایک ریاست یوپی کے ایک ضلع کا نام ہے۔

شاہدرہ: بھارت کی ایک بستی کا نام جو دہلی کے قریب آباد تھی۔

قطب صاحب: قطب صاحب دہلی کے قریب ایک علاقے کا نام ہے جہاں صوفی بزرگ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے۔ انھیں کی نسبت سے اس علاقے کو قطب صاحب کہا جاتا تھا۔

چھتر پور: چھتر پور بھارت کے ایک علاقے کا نام۔

گوجر: گوجر بھارت میں آباد ایک قوم کا نام۔

چنگیز خان: چنگیز خان منگول نسل سے تعلق رکھنے والا مشہور فاتح تھا۔ یہ 1162ء میں پیدا ہوا اور 1227ء میں فوت ہوا۔ تیموری اور مغل اسی کی نسل سے تھے۔ چنگیز خان تاریخ میں ایک ظالم، سفاک اور بے رحم فاتح کے طور پر مشہور ہے جس کی تلوار نے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا بے دریغ خون بہایا۔ چنگیز خان منگول نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا اصل نام تموجن تھا۔ جس کا مطلب ''لوہے کا کام کرنے والا'' ہے۔ جب یہ اپنے قبیلے کا سردار بنا تو اس نے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر منگول سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے سرداروں نے اسے چنگیز خان (یعنی کائناتی شہنشاہ) کا خطاب دیا۔ اس کے بعد وہ دنیا فتح کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ہمسایہ اقوام اور ممالک پر پے در پے حملے کیے اور ایک بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ اس نے شمالی چین، وسطی ایشیا، ایران، افغانستان بخارا اور ترکی کو تہ و بالا کر دیا۔ وہ قتل و غارت اور خون دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ الغرض چنگیز خان تاریخ میں خوف، دہشت اور بربریت کا نام ہے۔

تیمور: امیر تیمور مشہور فاتح تھا۔ مغل بادشاہ اسی کی نسل سے تھے۔ تیمور سمرقند کے علاقے میں 1336ء میں پیدا ہوا اور 1405ء میں فوت ہوا۔ یہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا اس لیے تاریخ میں تیمور لنگ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ تیمور منگول نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بیالیس ممالک فتح کیے۔ اسے سکندرِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت کام لے سکتا تھا۔ چناں چہ وہ جنگ میں ایک ہاتھ سے تلوار اور دوسرے سے کلہاڑا استعمال کرتا تھا۔

ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی: اس عبارت میں تاج محل کی تعمیر کی جانب اشارہ ہے جو شاہ جہاں نے اپنی ملکہ ممتاز کے لیے مقبرہ بنوایا تھا۔ تاج محل آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے سنگِ مرمر سے بنی ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ یہ اپنے فنِ تعمیر کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور عجائبات میں شامل ہے۔ اس کی تعمیر 1632ء میں شروع ہوئی اور تقریباً 25 سال میں مکمل ہوئی۔ استاد احمد لاہوری کو اس کا معمار خیال کیا جاتا ہے۔ بیس ہزار معماروں اور مزدوروں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

میواتی: ہندوستان کی ریاست میوات کے رہنے والی ایک میو قوم کے لوگ میواتی کہلاتے ہیں۔ میو قدیم النسل قوم ہے اور برصغیر میں اولین اسلام قبول کرنے والی قوم ہے۔ میواتی قوم کی زبان کا لہجہ ہندی زبان میں ہریانوی اور راجستھانی زبان کا امتزاج ہے۔

سبق کا خلاصہ

جب دہلی کے لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری پرچم لہرا رہا تھا۔ انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم (بہادر شاہ ظفر کے بھائی) مردانے میں دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں زنان خانے سے ایک لونڈی نے آ کر عرض کی کہ حضور کو بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔ جب شہزادہ تھوڑی دیر بعد اندر سے غم زدہ واپس آیا تو ایک دوست نے وجہ دریافت کی، کہا کہ کل شام افطاری کے وقت تحسن خان گویا گا کر ان کا دل بہلا رہا تھا اور اماں حضور قرآن پڑھ رہی تھیں، انھیں یہ شور غل بُرا لگا اور رمضان میں ایسی محفلیں بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ بلحاظِ ادب قبول تو کر لیا لیکن اس پابندی سے جی الجھتا ہے، سولہ دن کیسے بسر ہوں گے؟ ایک مصاحب نے کہا افطاری سے پہلے جامع مسجد تشریف لے جایئے۔ عجب بہار ہوتی ہے، آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔ جب مرزا سلیم وہاں گئے تو عجب نظارا دیکھا، کہیں قرآن کی تلاوت ہو رہی، کہیں مسائلِ دین پر بحث ہو رہی ہے، کہیں مراقبہ کا حلقہ ہے تو کہیں وظائف، الغرض چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔ مرزا کو یہ نظام بہت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ افطار کے وقت افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ قلعہ کی بیگمات، شہر کے امرا سب افطاری کا سامان بھیجتے تھے۔ مرزا کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا! اب وہ روزانہ مسجد جانے لگا۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بھی اکثر ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب دہلی اجڑی اور قلعہ برباد کر دیا گیا تو بیگمات جو پہلے خیرات کرتی تھیں خود محتاج ہو گئیں۔ جامع مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کچھ پیوند لگے کپڑوں میں مسلمان نظر آئے۔

مرزا شہ زور کہتے ہیں جب انگریزی توپوں نے شہر میں آگ برسائی تو پردہ دار خواتین بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ بہادر شاہ ظفر جو سب کا سہارا تھے، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ میں بھی اپنی بوڑھی ماں، کم سن بہن اور بیوی کو ساتھ لے کر دو رتھوں میں سوار ہو کر گھر سے نکلا۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا۔ عورتیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتیں اور اپنی قسمت پر آنسو بہاتیں۔ والدہ کہتی تھیں الٰہی! ہم کہاں جائیں؟ کس کا سہارا ڈھونڈیں؟ ہم چنگیز خاں کی نسل اور تیمور کی اولاد ہیں، ہم شاہ جہاں کے گھر والے ہیں، ہم عزت والے تھے لیکن اب زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا؟

الغرض بڑی مشکل سے ایک گاؤں پہنچے جو مسلمان میواتیوں کا تھا۔ چند روز انھوں نے ہمیں اپنی چوپال میں ٹھہرایا اور کھانے پینے کو دیا۔ آخر انھوں نے مجھے کھیتوں کی رکھوالی پر اور عورتوں کو کپڑے سینے کے لیے رکھ لیا۔ اس کے عوض انھوں نے سال بھر کا اناج دینا قبول کیا۔ ایک رات اس زور سے بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں سیلاب آ گیا۔ میری بیوی کو جاڑے سے بخار آیا اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ گاؤں والوں نے کفن وغیرہ منگوا کر دو پہر تک اسے دفن کرا دیا۔

سیلاب سے اناج بھیگ کر خراب ہو گیا تھا۔ گاؤں کے چودھری نے قطب صاحب سے ایک روپیہ کا آٹا منگوا دیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہو گا کہ رمضان شروع ہو گیا۔ چار پانچ دن بعد آٹا ختم ہوا تو بڑی مشکل پیش آئی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا، بھوک کے مارے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ چھوٹی بہن دلاسا دینے پر سو گئی۔

سحری کے وقت والدہ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ "رمضان کے مہینے میں ہم سیکڑوں محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے اب خود محتاج ہیں۔ روزہ پر روزہ رکھتے ہیں۔" دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھنا پڑا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی نیاز کا دودھ اور میٹھے چاول لایا اور پانچ روپے زکوٰۃ کے دیے۔ والدہ کو بتایا تو انھوں نے کہا کہ، اس سے تو مر جانا بہتر تھا۔ صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔ والدہ کی باتوں سے میں بہت شرمندہ ہوا۔ روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھایا اور پانچ روپے کا آٹا منگوا لیا جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہو گیا۔

اس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں رہے پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں والدہ انتقال کر گئیں اور بہن کی شادی ہو گئی۔ انگریز سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

پس منظر:

"فاقہ میں روزہ" تاجدار دہلی کے کنبے کا فسانہ ہے۔ اس قصے میں عقل مند آدمی کے لیے عبرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جسے

سُنتے ہی انسان اپنے غرور و تکبر کو بھول جاتا ہے اور آدمی "آدمی" بن جاتا ہے۔ یہ حکایت نہیں حقیقت ہے جسے خواجہ حسن نظامی نے خود سُنا اور پھر بیان کیا ہے: **"بیگمات کے آنسو"** غدر دہلی 1857 کے افسانوں کا حصہ اوّل ہے۔ اسے خواجہ حسن نظامی کی اعلیٰ درجہ کی تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ بقول مصنف یہ حصہ **"محض میری ذاتی تحقیقات سے تیار ہوا ہے۔"** اس میں شامل تمام دردناک سچی کہانیاں اُن کی اپنی تحریر کردہ ہیں۔ یہ شاہی سے بربادی کی عبرت ناک داستانیں ہیں۔ سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مرکزی خیال

وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ حالات بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ کل کے بادشاہ آج محتاج و بے بس بھی ہو سکتے ہیں۔ آج کے فقیر اور مشکلات کے اسیر کل کے خوش حال اور باوقار افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سبق میں یہی حقیقت دکھائی گئی ہے۔ مغلیہ خاندان جن کے دربار سجے تھے، محلات روشن اور مسجدیں آباد تھیں؛ وقت بدلتے ہی وہ لوگ دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ اس سبق میں مغلیہ خاندان کی زبوں حالی کا نقشہ بہت دردناک انداز میں کھینچا گیا ہے۔ مرزا سلیم کی روحانی تبدیلی، جامع مسجد دہلی کی اجڑی حالت، مرزا شہ زور کی غربت و بے بسی ان سب حقائق کو واضح کرتی ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار، دولت اور شان و شوکت سب وقتی چیزیں ہیں۔ جب وقت پلٹا کھاتا ہے تو بادشاہ بھی روٹی کے نوالے کو ترسنے لگتے ہیں۔ مرزا شہ زور کی ماں کی دعائیں، ان کا صبر، ان کی غیرت اور تکالیف کا بیان انتہائی سبق آموز ہے۔ دنیا کی ہر چیز فانی ہے اور انسان کو صبر، شکر، عاجزی اور حوصلے کے ساتھ حالات کا سامنا کرنا چاہیے کیوں کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبا ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق میں سے دی گئی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل یہ سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں)

اجمالی سیاق و سباق:

مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورے پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا۔ شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان بہہ گیا۔ مرزا نوشہ کی بیگم بخار سے فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ وہ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ رمضان میں افطاری کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا نوشہ دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

عبارت نمبر 1

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی، لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا: خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا: نہیں کچھ نہیں، بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت تحسن خاں گویا گا رہا تھا اور مرا دل بہلا رہا تھا۔ اس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں، ان کو یہ شور غل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان میں گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا، مگر اس کی پابندی سے جی الجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیوں کر بسر ہوں گے۔

حوالۂ متن

سبق کا عنوان : فاقہ میں روزہ

مصنف کا نام : خواجہ حسن نظامی

ماخذ : بیگمات کے آنسو

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے، اس میں مصنف نے مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں دہلی کی رونقوں کو بیان کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کے ایک دوست کے مشورے پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا۔ شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان بہہ گیا۔ مرزا شہ زور کی بیگم کو بخار ہو گیا اور وہ فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ وہ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ رمضان میں افطاری کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا نوشہ دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

دہلی کو اس کی رونقوں، چہل پہل، ہنگاموں اور دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ہندوستان کا دل کہا جاتا تھا۔ دہلی دراصل دہلیز کا مخفف ہے یعنی ہندوستان کے دروازے کی چوکھٹ، جسے فاتحین کے لیے عبور کرنا ضروری تھا۔ جو بھی ہندوستان پر حملہ کرتا سب سے پہلے دلی ہی کو اجاڑتا تھا۔ انگریز 1803ء میں دہلی میں داخل ہوئے اور انھوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور مغل بادشاہ کا عمل دخل برائے نام رہ گیا تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو دلی میں خوب قتل وغارت کی۔ انگریز فوجی شکاری کتوں کی طرح گلیوں میں پھیل گئے اور مکانوں میں داخل ہو کر سب کچھ لوٹنے لگے۔ بقول سرسید احمد خاں:

''آسمان سے کوئی بلا ایسی نہیں تھی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے کسی مسلمان کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔''

تشریح طلب عبارت میں مصنف ماضی کے اُن دنوں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی۔ اس کی رونقیں اور چہل پہل بحال تھی۔ ہر طرف عیش وطرب کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ لال قلعہ پر امیر تیمور کی نسل سے تعلق رکھنے والے مغل بادشاہوں کی آخری نشانی یعنی ان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے اور موسیقی کی محفلیں سجتی تھیں۔ انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بھائی مرزا سلیم بہادر محل کے مردانہ حصے میں بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے کچھ دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران میں زنان خانہ سے ایک کنیز باہر آئی اور مرزا سلیم سے نہایت ادب سے عرض کی کہ آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔ مرزا سلیم فوراً اس کے ساتھ محل میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو غم زدہ دکھائی دیے۔

ایک بے تکلف دوست نے ان سے پوچھا کہ عالی جناب کے مزاج کچھ اداس معلوم ہوتے ہیں، خیریت تو ہے؟ مرزا صاحب نے بتایا کہ بعض اوقات اماں حضور بلاوجہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ شام کو افطاری سے قبل نتھن خاں گویے سے

میں گانا سن رہا تھا اور اپنے دل کو بہلا رہا تھا۔ یہی وقت اماں کے قرآن شریف پڑھنے کا ہوتا ہے۔ چناں چہ انھیں اس وقت یہ شور غل اور میرا گانا سننا ناگوار گزرا۔ اسی لیے آج مجھے بُلا کر حکم دیا ہے کہ رمضان میں گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بس اسی بات پر میرا دل رنجیدہ ہے۔ میں اپنا جی بہلانے کے لیے اور تفریح کے لیے گانا سنتا ہوں، بھلا میں اپنی اس تفریح کی عادت کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب اور لحاظ سے اماں کی بات کو میں نے قبول تو کر لیا ہے لیکن مجھ سے موسیقی سنے بغیر رہا نہیں جائے گا۔ ایسی پابندیوں سے میرا جی اُلجھتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ رمضان کے بقیہ سولہ دن بغیر گانا سنے کیسے گزاروں گا۔ دراصل یہ مغل شہزادوں کی عیش کوشی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ راگ رنگ میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ رمضان میں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ حضرت علیؓ سے حدیث مروی ہے:

انما بعثت بکسر المزامیر (کنز العمال)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے آلاتِ موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

جب کسی قوم کا حکمران طبقہ عیش وعشرت اور بے جا تفریح میں حد سے بڑھ جائے تو پوری قوم اس کی پیروی کرتی ہے اور انھی کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ حکمران طبقہ اور قوم کے افراد محنت اور جستجو سے عاری ہو جاتے ہیں۔ یہ رجحان قوم میں سستی، کاہلی اور غیر ذمہ داری کو فروغ دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں تعلیم، معیشت اور دیگر اہم شعبے زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قوم کی اخلاقی حالت بگڑنے لگتی ہے۔ اخلاقی اور سماجی اقدار کی جگہ محض تفریح اور ناپسندیدہ عادات کو فروغ ملتا ہے۔ لوگ فضول خرچی، بے راہ روی اور غیر اخلاقی کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ انھیں قومی اور اجتماعی مفادات کی کوئی پروا نہیں رہتی۔ قوم کے بااثر لوگوں پر اخلاقی تباہی پہلے آتی ہے۔ سب سے پہلے انھی کے اخلاق مسخ ہوتے ہیں اور پھر پوری قوم بے راہ روی کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ بقول مولانا حالی:

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر — تو ہوتے ہیں مسخ اُن میں پہلے تو نگر

کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر — نہ عقل ان کی ہادی نہ دیں ان کا رہبر

قوم کو زوال سے بچانے کا حل علامہ اقبالؒ نے یوں پیش کیا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے — شمشیر وسناں اول، طاؤس ورباب آخر

عبارت نمبر 2

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے دور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفت گو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے۔ کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جب دلی کی رونقیں آباد تھیں۔ ان دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ جس پر وہ بہت رنجیدہ خاطر ہوئے کہ سولہ دن کیسے گزریں گے۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ افطاری کے وقت جامع مسجد جایا کریں وہاں خوب رونق ہوتی ہے۔

تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا۔ شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان اس میں بہہ گیا اور مرزا شہ زور کی بیگم کو بخار ہو گیا۔ کچھ دن بعد وہ فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ وہ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ رمضان میں افطاری کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں دہلی کی رونقیں برقرار تھیں، ان دنوں مرزا سلیم (بہادر شاہ ظفر کے بھائی) ایک دن رمضان میں افطاری سے پہلے ایک گوئیے سے گانا سن رہے تھے۔ جس پر ان کی والدہ نے انھیں کہا کہ رمضان میں ایسی محفلیں نہیں ہونی چاہییں۔ مرزا سلیم بہت رنجیدہ ہو گئے کہ رمضان کے بقیہ سولہ دن موسیقی کے بغیر کیسے کٹیں گے۔ ان کی پریشانی کو دیکھ کر ان کے ایک بے تکلف دوست نے انھیں مشورہ دیا کہ وقت گزاری کے لیے شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد تشریف لے جایا کریں، اس وقت وہاں عجیب بہار کا سماں ہوتا ہے۔ وہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

مرزا سلیم کو ان کا یہ مشورہ پسند آیا۔ چناں چہ دوسرے دن وہ چند دوستوں کے ہمراہ افطاری سے پہلے جامع مسجد جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے عجب دنیا دیکھی۔ جگہ جگہ لوگ دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہیں حلقے میں قرآن شریف دہرایا جا رہا ہے۔ رات کو نمازِ تراویح پڑھانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں دین کے فقہی مسائل پر بحث مباحثہ ہو رہا ہے۔ کہیں کچھ عالم کسی فقہی مسئلے پر مکالمہ کر رہے ہیں اور بیسیوں لوگ ان کے گرد جمع ہو کر ان کی گفت گو بڑی دل چسپی سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ باطنی توجہ اور مراقبہ کا حلقہ قائم ہے۔ چند صوفیا دائرہ بنائے سر جھکائے مراقبہ میں مصروف ہیں۔ کہیں کوئی درود و وظائف کی تسبیحات میں مشغول ہے۔ الغرض مسجد میں ایک روحانی سماں تھا۔ چاروں طرف اللہ کے نیک بندوں کا ہجوم تھا۔

دیکھا اک دن فقیروں کی محفل میں جا — تھا بچھونا زمیں پہ بچھا گھاس کا
تھا ہر طرف فقیروں کا اک جمگھٹا — کر رہے تھے وہ سب دل سے ہُو ہُو ہُو

اللہ ہُو ، اللہ ہُو ، اللہ ہُو ، اللہ ہُو

رمضان شریف بہت بابرکت مہینا ہے۔ اس مہینے میں مسلمانوں میں عبادت اور خدمتِ خلق کا جذبہ عروج پر ہوتا ہے۔ افطاری کے وقت مسجدوں میں روحانی اور پر کیف منظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لوگ روزے کی برکتیں سمیٹنے اور افطار کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ مساجد میں بہت چہل پہل ہوتی ہے۔ افطار کا اہتمام کرنے والے کھجوریں، شربت، پھل، دودھ اور دیگر لوازمات پورے کر رہے ہوتے ہیں۔ دسترخوان سجائے جاتے ہیں اور لوگ مل جل کر روزہ کھولنے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ امیر و غریب میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اذان سے ذرا پہلے خاموشی چھا جاتی ہے اور ہر کوئی دعا میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی اذان کی آواز گونجتی ہے سب کے چہروں پر شکر اور خوشی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

یہ رونقیں اور مصروفیات دراصل رمضان کی برکت اور عبادت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ افطاری کا وقت دعاؤں کی قبولیت کا وقت سمجھا جاتا ہے اس لیے لوگ بڑے ذوق و شوق سے مسجدوں میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ روزہ افطار کروانا بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ امرا اور اہلِ خیر خاص طور پر مساجد میں افطاری کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس سارے عمل سے لوگوں میں بھائی چارے، محبت اور اخوت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے اور مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کو فروغ ملتا ہے۔

مرزا سلیم کو موسیقی سے لگاؤ تھا اور وہ شام کو گانا سنتے تھے۔ دوست کے مشورے پر انھوں نے مسجد میں آ کر چہل پہل اور رونق دیکھی تو بہت متاثر ہوئے اور ہر روز مسجد آنے لگے۔

عبارت نمبر 3

کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ مرزا کو یہ نظارہ نہایت پسند آیا اور وقت بہت لُطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا

وقت آیا۔ سیکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محل سلطانی سے متعدد خوان مکلّف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے تاکہ روزہ داروں میں افطاری تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب اُمرا علیحدہ سے افطاری کے سامان بھیجتے تھے، اس لیے ان خوانوں کی گنتی سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چوں کہ ہر امیر کوشش کرتا تھا کہ اس کا سامانِ افطاری دوسروں سے بڑھ کر رہے، اس لیے ریشمی رنگ برنگ کے خوان پوش اور ان پر مقیشی جھالریں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہو جاتی تھی۔

مرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان و شوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھروں میں وہ دیکھتے کہ سیکڑوں فقرا کو سحری اور اول شب کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا، یہ دن ان کے گھر میں بڑی برکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف اس دور کا ذکر کرتے ہیں جب دہلی پر مغلوں کی حکومت تھی۔ ایک دن مرزا سلیم (آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بھائی) کو ان کی والدہ نے رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ جس پر مرزا اداس ہو گئے۔ ایک دوست کے مشورے پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ افطاری کے وقت وہاں کی چہل پہل سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جب انگریزوں نے دہلی پر حکومت قائم کر لی تو مرزا شہ زور (مرزا سلیم کے بھانجے) دشمن سے بچنے کے لیے خاندان سمیت دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب کے نتیجے میں تمام سامان بہہ گیا اور زکوٰۃ، خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ خوراک نہ ہونے کی وجہ سے فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں دلی مغلوں کے زیرِ حکومت تھی، بہت بارونق ہوا کرتی تھی۔ مرزا سلیم (بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بھائی) موسیقی کے بے حد دلدادہ تھے۔ وہ رمضان میں بھی شام کو موسیقی سنتے تھے۔ ان کی والدہ نے انھیں رمضان المبارک میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ جس پر مرزا رنجیدہ ہو گئے کہ باقی کے سولہ روزے کیسے گزریں گے۔ ان کی یہ پریشانی دیکھ کر ان کے ایک قریبی دوست نے مشورہ دیا کہ آپ وقت گزاری کے لیے شام کو افطار سے پہلے جامع مسجد تشریف لے جایا کریں، اس وقت وہاں عجیب سماں ہوتا ہے۔ چناں چہ مرزا اپنے دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے افطار سے قبل جامع مسجد چلے گئے۔ یہاں کی رونق انھیں بہت پسند آئی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کو ہر نئی چیز اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے مشہور عربی مقولہ ہے کل جدید لذیذ یعنی ہر نئی چیز مزے دار ہوتی ہے۔

مرزا جامع مسجد میں لوگوں کی گہما گہمی سے بہت محظوظ ہوئے۔ جگہ جگہ لوگ دائروں میں بیٹھے تھے۔ کہیں قرآنِ پاک کی تلاوت کی جا رہی تھی تو کہیں فقہی مسائل پر بحث مباحثہ کیا جا رہا تھا۔ یہ نظارہ مرزا کو بہت پسند آیا اور ان کا وقت بہت آسانی سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد افطار کا وقت ہو گیا، جس نے ایک عجب سماں باندھ دیا۔ افطار کا وقت ہوتے ہی وہاں سیکڑوں کی تعداد میں کھانے کے تھال آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ رمضان میں یہ دستور تھا کہ روزانہ شاہی محل سے مزیدار پکوانوں کے تھال جامع مسجد بھیجے جاتے تھے تاکہ روزے داروں میں افطاری تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ قلعے کی تمام بیگمات اور شہر کے تمام امیر گھرانوں سے بھی جامع مسجد میں افطاری بھیجی

جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں بچھنے والے دسترخوان پر کئی قسم کے لذیز پکوان نظر آتے تھے۔ یہ اس وقت ایک رواج تھا کہ تمام امیر اور شاہی گھرانے مسجد میں افطاری بھیجا کرتے تھے تاکہ ہر خاص و عام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکے۔

رمضان میں نیکی کا جذبہ عروج پر ہوتا ہے اس لیے شاہی خاندان روزہ داروں کی افطاری کا خاص اہتمام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ سب کچھ نمائش اور خود کو دوسروں سے برتر ظاہر کرنے کے لیے بھی کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے دہلی کے ہر امیر آدمی کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کے ہاں سے بھیجی جانے والی افطاری سب سے عمدہ ہو۔ اس لیے سب بڑھ چڑھ کر افطاری بھجواتے تھے اور اپنی بھجوائی ہوئی افطاری کو دوسروں سے ممتاز دکھانے کے لیے افطاری کے تھال کو سجا کر بھیجتے تھے۔ تھالوں کو رنگ برنگے چمک دار رومالوں سے، جن کے کناروں پر موتی لٹک رہے ہوتے، ڈھانپ کر جامع مسجد میں لایا جاتا تھا۔ یہ تھال دسترخوان کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے۔ لہٰذا مرزا کے دل پر اس شان و شوکت اور دینی ماحول کا بڑا اثر ہوا۔ بقول مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ع صحبتِ صالح ترا صالح کند

ترجمہ: "نیک لوگوں کی صحبت نیک بنا دیتی ہے"

اور بقول شاعر:

؎ اپنا رنگ دکھاتی ہے صحبت اللہ والوں کی — اللہ سے ملواتی ہے صحبت اللہ والوں کی

امرا نہ ہی جوش میں اپنا نام بنانے اور خود کو نمایاں کرنے کے لیے روز کھانے سے بھرے تھال مسجد میں بھجوایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھروں سے بھی لوگ سحری اور رات کا کھانا خانقاہوں اور مسجدوں میں رہنے والے فقیروں کو بھیجتے تھے۔

مسجدوں کی طرح خانقاہیں بھی نیک لوگوں کی آماج گاہیں ہوتی ہیں۔ خانقاہوں میں وہ لوگ رہتے ہیں جو دنیا کی نمود و نمائش اور حرص و ہوس سے کنارہ کش ہو کر زندگی اللہ کی راہ میں وقف کر دیتے ہیں۔ مسجدیں لوگوں کی عبادت کی جگہیں ہوتی ہیں اور خانقاہیں روحانی تربیت کے مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ رمضان شریف میں لوگ مسجدوں کے ساتھ ساتھ خانقاہوں میں بھی فقیروں اور درویشوں کے لیے سحری اور افطاری بھیجتے تھے۔ چناں چہ رمضان کا مہینہ بہت ہی بارونق اور بابرکت ہوتا۔ دراصل مصنف نے شاہی دور کے دہلی کے حالات بیان کیے ہیں۔ جب ہر طرف رونق ہی رونق تھی۔ امرا سے لے کر عام لوگوں کے پاس بھی اتنے وسائل ہوتے تھے کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے اور سب کو رمضان کی خوشیوں میں شریک کرتے تھے۔ مرزا کو شام کو موسیقی سننے سے منع کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بہت رنجیدہ تھے لیکن مسجد میں دینی ماحول سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ چناں چہ انھوں نے باقاعدگی سے مسجد جانا شروع کر دیا۔ مسجد کے پاکیزہ اور بابرکت ماحول سے انھیں ایسا لطف حاصل ہوا کہ گانا سننے کا شوق باقی نہ رہا۔ ہر طرف نیکی کا سماں تھا اور وہ دن انھیں بہت بابرکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

تشریح طلب عبارت میں لوگوں کے جذبۂ خیر اور دہلی کی آسودہ حالی کا خوب صورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔

عبارت نمبر 4

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نوعمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیر و زبر ہو گئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا۔ ان کے گھر اکھڑ گئے۔ ان کی بیگمات ماما گیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان و شوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہ جہاں کی خوب صورت اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جب دہلی زندہ تھی اور لال قلعہ پر مغلوں کا پرچم لہراتا تھا۔ انہی

دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورے پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔

تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ جب انگریزوں نے دہلی کو تاراج کیا تو مرزا شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان اس میں بہہ گیا۔ مرزا کی بیگم کو بخار ہو گیا اور وہ فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ وہ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ رمضان میں افطاری کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے ان کی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق "فاقہ میں روزہ" میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت درد انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف دہلی کی تباہی اور مغلیہ خاندان کے مصائب بیان کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب دہلی کو ہندوستان کا دل کہا جاتا تھا۔ اس وقت لال قلعہ پر مغلوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ انگریز تجارت کے بہانے ہندوستان میں آئے اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ انگریز 1803ء میں دہلی میں داخل ہوئے اور انھوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مغل بادشاہ کا اثر و رسوخ برائے نام رہ گیا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد رہی سہی حکومت اور عزت بھی جاتی رہی۔ جب انگریزوں نے دلی پر قبضہ کیا تو دلی میں خوب قتل و غارت کی۔ انگریز فوجی شکاری کتوں کی طرح گلیوں میں پھیل گئے اور گھروں میں داخل ہو کر لوٹ مار کرنے لگے۔ بقول شاعر:

؎ ہوک اٹھتی ہے یہ سن کر مرے دل ناکام میں — پلٹنیں کفار کی ہوں خانۂ اسلام میں (شہزادی کلثوم)

مصنف مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ مرزا شہ زور اپنی نوعمری کی وجہ سے اکثر اپنے ماموں مرزا سلیم کی محفلوں میں بے تکلف شریک ہو جایا کرتے تھے۔ مرزا شہ زور کا بیان ہے کہ ایک تو وہ زمانہ تھا جب دہلی آباد تھی، اس کی رونقیں بحال تھیں اور وہ ہندوستان کا دل کہلاتی تھی لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دہلی تباہ و برباد ہو گئی۔ انگریزوں نے جب دہلی پر قبضہ کیا تو لال قلعہ کو برباد کر دیا۔ وہی لال قلعہ جسے سترھویں صدی میں پانچویں مغل بادشاہ شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ جو بہت وسیع و عریض تھا اور جس کے اردگرد سبزہ و ہریالی تھی۔ جس کی تعمیر میں دس سال کا عرصہ لگا تھا۔ جو اپنے حسن و جمال میں بے مثال تھا۔ انگریزوں نے اس کا تقریباً 80 فی صد حصہ منہدم کر دیا۔ شاہی خاندان کے گھر تباہ کر دیے گئے۔ ان کی خواتین نوکروں کی طرح لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگیں۔ مسلمانوں کا جاہ و جلال اور شان و شوکت خاک میں مل گئی۔ بقول میر تقی میر:

؎ دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ دہلی کی تباہی کے بعد مجھے ایک بار رمضان میں جامع مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ جس مسجد میں کبھی درس و تدریس، تلاوت اور ذکر و وظائف کے حلقے ہوا کرتے تھے آج وہاں جگہ جگہ انگریز سپاہیوں نے چولھے بنائے ہوئے ہیں اور سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ کہیں گھوڑوں کو چارا اور دانہ ڈالا جا رہا ہے اور کہیں گھاس کے ڈھیر نظر آ رہے ہیں۔ وہ مسجد جسے مشہور مغل بادشاہ شاہ جہاں نے لاکھوں روپے خرچ کر کے بنوایا تھا، جس کا شمار اپنے زمانے کی بے حد خوب صورت مساجد میں ہوتا تھا، وہ گھوڑوں کا اصطبل بنی ہوئی تھی۔ الغرض بڑا دل خراش منظر تھا۔

جنگ آزادی سے قبل دلّی میں بہت خوشحالی تھی۔ قلعہ بھی آباد تھا اور شہر میں خوب رونق تھی۔ اس لیے دلّی کی جامع مسجد میں بھی رمضان المبارک میں خوب چہل پہل ہوتی تھی۔ ہر طرف علمی و روحانی محفلیں سجی ہوتی تھیں۔ افطار کے وقت امرا کے گھروں سے روزہ داروں کے لیے افطاری آتی تھی۔ شاہی محلات سے بھی افطار کے لیے پُرتکلف کھانے آتے تھے۔ بڑی برکت اور چہل پہل کے دن ہوتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے دلی پر قبضہ کیا تو پورے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ شاہی قلعے کے ساتھ ساتھ جامع مسجد کو بھی برباد کر دیا۔ جامع مسجد کو فوجی چھاؤنی میں بدل دیا اور اس کی بے حرمتی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مسجد کو نمازیوں کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کے صحن میں فوجی گھوڑے باندھے جانے لگے۔ مسجد کے کئی حصوں کو فوجی بیرکوں میں بدل دیا گیا۔ مسجد کی سیڑھیوں پر توپیں رکھ دی گئیں۔ مسجد کی دیواروں کو گولیوں اور توپ کے گولوں سے نقصان پہنچایا گیا۔ مسجد کے تقدس اور شان و شوکت کو بے دردی سے پامال کیا گیا۔ عظیم الشان مسجد کی بے حرمتی پر ہر مسلمان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

ان مظالم پر بھی تُو سرشار ہے مدہوش ہے   مسجدوں میں جانور بندھتے ہیں تو خاموش ہے   (شہزادی کلثوم)

عبارت نمبر 5

اور پھر جب مسجد واگزاشت ہوگئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا کہ چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیے۔ کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کر دیے۔ نہ وہ اگلا ساساماں، نہ وہ اگلی سی چہل پہل، نہ وہ پہلی سی شان و شوکت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد آج کل کا زمانہ بھی دیکھا جب کہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غربا آئے تو ان سے رونق کیا خاک ہو سکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے۔ اگر مسلمانوں کے افلاس کا یہی عالم رہا تو آئندہ خبر نہیں کیا نوبت آئے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ مرزا سلیم (آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کے بھائی) موسیقی سننے کے بہت شوقین تھے۔ ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ جس پر مرزا رنجیدہ ہو گئے۔ ان کے دوست نے انھیں افطاری سے قبل وقت گزاری کے لیے جامع مسجد دہلی جانے کا مشورہ دیا۔ مرزا جامع مسجد گئے تو انھیں وہاں کی شان و شوکت بے حد پسند آئی۔ دہلی کی یہ رونق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیوں کہ 1857ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ جس کے نتیجے میں دہلی اُجڑ گئی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ مرزا کے بھانجے (شہزور) دشمن سے بچنے کے لیے خاندان سمیت دہلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے گاؤں میں پناہ لی۔ جہاں سیلاب آنے اور روزگار نہ ہونے کی وجہ سے خیرات اور زکوٰۃ پر گزر بسر ہونے لگی۔ خوراک نہ ہونے کے باعث فاقہ میں روزہ رکھنا پڑا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا دہلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف 1857ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب انگریزوں نے دہلی پر حملہ کیا تو شاہی خاندان کے اکثر مردوں اور امرا کو جان سے مار دیا گیا۔ بس چند بچے اور بیگمات کو چھوڑ دیا گیا

جنھیں اپنی گزر بسر کے لیے دوسروں کے یہاں ملازمت کرنی پڑی۔ نیز 1857ء کی جنگِ آزادی نے دہلی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ دہلی جو کبھی ہندوستان کا دل ہوا کرتی تھی، بے رونق اور برباد ہو گئی۔ شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی جامع مسجد کو انگریز سپاہیوں نے اپنے گھوڑے ٹھہرانے کی جگہ بنا دیا۔ جو جامع مسجد کبھی دہلی کی شان و شوکت اور رونق کا گہوارا ہوا کرتی تھی، اب اس کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔

دلی کہاں گئیں ترے کوچوں کی رونقیں   گلیوں سے سر جھکا کے گزرنے لگا ہوں میں   (جاں نثار اختر)

شاہی مسجد کو چھاؤنی میں بدل کر اس کی بے حرمتی کی گئی۔ اسے نمازیوں کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کے کئی حصوں کو فوجی بیرکوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ گھوڑوں کی خوراک اور سامانِ حرب پڑا تھا۔ مسجد کے صحن میں چولھے نصب کر کے فوجیوں کے لیے کھانے تیار کیے جاتے تھے۔ گولیوں سے مسجد کے در و دیوار اور میناروں کو داغ دار کیا گیا۔ مسجد کی رونق اور شان و شوکت ختم کر دی گئی تھی۔ مسلمانوں نے مسجد کی بے حرمتی پر شدید احتجاج کیا جس کے نتیجے میں کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے جامع مسجد پر سے اپنا قبضہ ختم کر دیا اور مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی۔ مرزا شہزور کہتے ہیں کہ ان کا ایک دفعہ پھر جامع مسجد جانا ہوا۔ اس وقت بھی رمضان کا مہینہ تھا۔ لیکن شاہی دور اور انگریز دور میں آنے والے رمضان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شاہی دور میں جامع مسجد کی الگ ہی رونقیں نظر آتی تھیں۔ افطار کے وقت کھانوں سے سجے ہوئے تھال اور لوگوں کی گہما گہمی ایک عجب اور دل فریب نظارہ پیش کرتی تھی۔ لیکن انگریز حکومت میں دہلی کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ وہ جامع مسجد جو کبھی رمضان میں شان و شوکت اور محبت کا گہوارہ ہوا کرتی تھی، جنگِ آزادی کے بعد اس کا حال کچھ یوں تھا کہ مسجد لوگوں سے خالی تھی صرف چند لوگ میلے گندے، پیوند لگے کپڑے پہنے وہاں بیٹھے تھے۔ دو چار آدمی قرآن پاک پڑھ رہے تھے اور کچھ پریشان حال بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ افطار کا وقت ہوا تو رنگ برنگے کھانوں کی بجائے چند آدمیوں نے کھجوریں، دال اور سبزی وہاں بیٹھے لوگوں میں تقسیم کر دی۔

دراصل مصنف نے یہاں انگریز حکومت کے دور میں مسلمانوں کی زبوں حالی کو نہایت دردمندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انگریزوں کے آتے ہی مسلمانوں کی وہ شان و شوکت نہ رہی جو کبھی ہُوا کرتی تھی۔ وہ پستی کا شکار ہو گئے۔ جس کی وجہ سے مسجدوں اور خانقاہوں میں رونق باقی نہ رہی۔ نیز دہلی کی ہر گلی اور کوچہ مسلمانوں کی زبوں حالی کی داستان سنا رہا تھا۔ اس دور کے مسلمانوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے تقدیر کے ستائے ہوئے ہوں۔ جامع مسجد میں تقدیر کے ستائے ہوئے روزہ دار کھجور اور معمولی کھانوں سے روزہ افطار کرنے کے لیے جمع تھے۔ کیوں کہ دہلی کے جو حالات تھے ان لوگوں کے لیے یہ افطاری بھی غنیمت تھی۔

بقول شاعر:

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب   رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا   ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے
(میر تقی میر)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت آنے سے برصغیر میں مسلمان دب گئے۔ یعنی جہاں پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی اب اسی ریاست میں مسلمان کسم پرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان جدید سائنسی تعلیم سے ناواقف تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہ تعلیم اسلام کے خلاف تھی۔ لہٰذا جن مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے حصول سے انکار کر دیا وہ مزید خستہ حالی کا شکار ہو گئے۔ جب کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بہت حد تک دین سے دوری اختیار کر لی۔ انھی مسلمانوں کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی نے بجا فرمایا تھا کہ:

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں مے خانوں میں   واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں

اس لیے وہ مسجدوں میں کم نظر آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسجدوں کی رونق ختم ہو گئی تھی۔ غریب غربا مسجد میں آتے تھے لیکن جامع مسجد میں کوئی چہل پہل نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی بڑی بات تھی کہ مسجد آباد تھی۔ نیز مسلمانوں کے لیے یہی بہت تھا کہ عبادت کے لیے مسجد ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی حالت روز بہ روز بدتر ہوتی جا رہی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ

آخر یہ حالات کب تک رہیں گے۔ بقول شاعر:

ـ ایسی ہوا بھی کہ ہے چاروں طرف فساد — جز سایہ خدا کہیں دارالاماں نہیں (شیخ ظہور الدین حاتم)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ جب مصنف نے ان سے 1857ء کی جنگِ آزادی کے حالات و واقعات سننا چاہے تو اُنھیں یاد کر کے مرزا شہ زور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یعنی وہ حالات ناقابل بیان حد تک دردناک تھے۔ انگریزوں کے آنے سے مغلوں کا تخت و تاج چھن گیا اور شاہی خاندان کھلے آسمان کے نیچے آ گیا۔

عبارت نمبر 6

جب انگریزی توپوں اور سنگینوں نے ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی، تاج سر سے اتار لیا، تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتش ناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ چھوٹے، بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور ظل سبحانی، جن پر ہم سب کا سہارا تھا، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورہ پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا۔

تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان اس میں بہہ گیا اور مرزا شہ زور کی بیگم کو بخار ہو گیا۔ کچھ دن بعد وہ فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ وہ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ رمضان میں افطاری کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت درد انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے مرزا شہ زور سے اِصرار کیا کہ غدر کا قصہ اور تباہی بیان کریں تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب میں نے بہت اِصرار کیا تو انھوں نے اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ مرزا شہ زور نے بتایا کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تمام شہر توپوں کی گولہ باری نے تباہ و برباد کر دیا۔ انگریز فوجی کتوں کی مانند گلی محلوں میں پھیل گئے اور چُن چُن کر لوگوں کو قتل کرنے لگے۔ ہمارے سر سے تاج اُتار لیا گیا اور تخت پر قبضہ کر لیا گیا۔ تمام شہر میں بارودی گولوں کی برسات ہو رہی تھی۔ مرزا شہ زور جنگِ آزادی کے دوران میں دہلی کی تباہی اور اس کے ساتھ عوام پر گزرنے والے مصائب کی انتہائی دردناک تصویر کشی کرتے ہیں۔ مرزا شہ زور اپنی آنکھوں دیکھی روداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انگریزوں نے دہلی پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ وہ توپوں، کرچوں (۔۔۔۔) اور سنگینوں (بندوقوں کی تیز دھاروں) سے لیس ہو کر آئے تھے۔ انھوں نے گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہا دیں اور شہر کو کھنڈر بنا دیا۔ ہر طرف تباہی

اور موت کا منظر چھا گیا۔ مسلمان جو صدیوں سے اس ملک پر حاکم تھے، اپنے گھروں سے بھی محروم ہو گئے۔

ـ مایوسیوں نے حسرت و ارمان مٹا دیے — کیسا یہ گھر بھرا ہوا ویران ہو گیا (شہزادی کلثوم)

انگریزوں نے دہلی پر مکمل قبضہ کر لیا۔ ہر طرف توپوں اور بندوقوں کی گھن گرج تھی۔ وہ پردہ نشین خواتین جو سات پردوں میں رہتی تھیں، گلیوں میں نکلنے پر مجبور ہو گئیں۔ جنھوں نے کبھی گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی، گلیوں اور چوراہوں میں اپنے پیاروں کی لاشیں تلاش کر رہی تھیں۔ انگریز فوجیوں نے ان کے پیاروں کو بے رحمی سے قتل کر دیا تھا اور لاشوں کو بے گور و کفن پھینک دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جو ابھی جرم و خطا کے تصور سے بے بہرہ تھے، اپنے باپوں کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ اپنی ماؤں کے ہمراہ، غم کی تصویر بنے، وہ ''ابا ابا'' پکارتے ہوئے گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ ان کے والد یا تو قتل ہو چکے تھے یا قید میں ڈال دیے گئے تھے۔ معصوم بچوں اور عورتوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ان کے گھر بار تباہ ہو چکے تھے اور ان کے لیے کوئی سائبان بھی نہ تھا۔ ظلم و ستم کی ایسی قیامت برپا تھی کہ مظلوموں کو تسلی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر جو دہلی کے بادشاہ تھے، ہم سب کو انھی کا سہارا تھا۔ لیکن وہ بھی بے یار و مددگار تھے۔ انگریزوں نے انھیں تخت سے ہٹا کر بے بس کر دیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ شان و شوکت کی علامت، لال قلعے کو چھوڑنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت کا آخری باب ختم ہو چکا تھا اور انگریزوں کے ظالمانہ دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

ـ بن کے صیدِ دامِ حرص و آرزو رُسوا ہو گئے — جو تماشا دیکھتے تھے خود تماشا ہو گئے (شہزادی کلثوم)

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے بھی جان بچانے کے لیے اپنی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور بیوی کو ساتھ لیا اور قلعے سے نکل گیا۔ میں اس اُجڑے ہوئے قافلے کا گویا سالار تھا جو دشمنوں سے جان بچانے کے لیے اپنے قافلے کو لیے مارا مارا پھر رہا تھا۔ مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ یہ قافلہ نہ کسی منزل سے آشنا تھا، نہ کسی راستے سے واقف تھا۔ بے بسی اور کرب میں ڈوبے ہوئے چند افراد کا یہ قافلہ محرومی اور کسمپرسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے ان کا اجڑا ہوا ماضی اور آگے ایک نامعلوم مستقبل تھا۔ بقول میر تقی میر:

ـ دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اس عبارت میں دہلی کی تباہی و بربادی، مسلمانوں پر ہونے والے مظالم، عورتوں کی بے بسی، بچوں کی بے کسی اور بہادر شاہ ظفر کی بے چارگی کی ایک دردناک تصویر پیش کی گئی ہے۔

عبارت نمبر 7

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے، اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل، تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی! ایک بڑھاپے سے لاچار، دو قدم چلنا دوبھر۔ دوسری بیمار اور حاملہ۔ تیسری دس برس کی نادان لڑکی۔ عورتیں روتی تھیں اور بین کر کر کے روتی تھیں۔ میرا کلیجہ ان کے بین سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں: الٰہی ہم کہاں جائیں۔ کس کا سہارا ڈھونڈیں۔ ہمارا تاج و تخت تو لٹ گیا تو ٹوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے۔ اس بیمار پیٹ والی کو کہاں لے کر بیٹھوں؟ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں؟ جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں۔ کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منہ تکتی تھی۔ مجھ کو اس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ اَب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم موسیقی سننے کے بے حد شوقین تھے۔ ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کیا تو مرزا رنجیدہ ہوگئے۔ ایک دوست کے مشورہ پر شام کو وقت گزاری کے لیے جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ لیکن جب انگریزوں نے حکومت قائم کی تو جامع مسجد کو بھی اصطبل بنادیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تمام شہر توپوں سے گولہ باری کر کے تباہ کر دیا اور شاہی خاندان اپنی جان بچانے کے لیے قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا شہ زور نے اپنے خاندان سمیت میواتیوں کے گاؤں میں پناہ لی۔ جہاں سیلاب آنے اور روزگار نہ ہونے کے باعث زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر ہونے لگی۔ خوراک کی کمی کی وجہ سے فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں شہزادہ شہ زور اپنے سفر کے حالات بتاتے ہیں۔ جب انگریزوں نے دلی پر قبضہ کیا تو شہر کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لوگوں کو قتل کیا اور شہر کی جامع مسجد کو چھاؤنی میں بدل دیا۔ قلعے پر قبضہ کر کے مغلیہ حکومت کا چراغ گل کر دیا۔ لوگوں کو بہادر شاہ ظفر سے امیدیں تھیں کیوں کہ وہ بادشاہ تھے۔ لیکن بہادر شاہ ظفر بھی جان بچا کر قلعے سے نکل گئے۔ انگریزوں نے شاہی خاندان کے افراد کو قتل کرنا شروع کر دیا تو سب کو اپنی جان اور عزت بچانے کی فکر ہوئی۔ شہ زور بھی اپنی ماں، بیوی اور کم سن بہن کو لے کر قلعے سے بھاگ نکلے۔ مشہور مؤرخ لارڈ رابرٹ لکھتا ہے:

''میرا گزر دہلی کے چاندنی چوک سے ہُوا تو ہر جانب لاشوں کے انبار تھے۔''

مرزا شہ زور اپنے سفر کی اذیتوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کو لے کر قلعے سے فرار تو ہو گئے لیکن انھیں کسی منزل کا پتہ نہ تھا۔ وہ اور ان کے اہلِ خانہ دور تھوں (گھوڑا گاڑیوں) پر سوار ہو کر غازی آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ غازی آباد بھی مغل سلطنت کا حصہ تھا اور قدرے پرامن علاقہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں غازی آباد میں آسانی سے پناہ مل جائے گی اور حالات بہتر ہونے تک ان کا خاندان وہاں سکون سے رہ سکے گا۔ غازی آباد جاتے ہوئے شاہدرہ کے مقام پر پہنچے تو انھیں خبر ہوئی کہ راستے میں انگریز فوجوں نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ انگریز فوج کے دستے راستے میں گشت کر رہے تھے اور ہر جگہ فوجی موجود تھے۔ آگے غازی آباد جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر وہ قطب صاحب چلے گئے۔ قطب صاحب، دہلی کے قریب ایک تاریخی اور روحانی مقام ہے جو حضرت بختیار الدین کاکیؒ کی نسبت سے مشہور ہے۔ انھوں نے رات قطب صاحب میں گزاری اور اگلے دن کے سفر کے لیے آرام کیا۔ اگلی صبح یہ مختصر سا قافلہ سفر پر روانہ ہو گیا لیکن منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سفر کے دوران میں چھترپور کے قریب پہنچے تو وہاں کے مقامی لوگوں (گوجروں) نے حملہ کر دیا۔ انھوں نے بے دردی اور بے رحمی سے ان کا سامان لوٹ لیا۔

؎ اس رنگ بدلتی دنیا میں پہچان بڑی ہی مشکل ہے — یہ کس کو خبر ہے اے شاہد کس بھیس میں کون لٹیرا ہے

(شاہد غازی)

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ گوجروں نے اُن کا سامان لوٹ لیا لیکن اتنی مہربانی کی کہ انھیں زندہ چھوڑ دیا۔ دراصل مغلیہ حکومت کے خاتمے سے ہر طرف افراتفری تھی۔ انگریز فوج نے دلی پر قبضہ کر کے مغلیہ اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا اور اس کی توجہ امن وامان قائم کرنے کی طرف نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کو کچلنے کی طرف تھی۔ اس انتشار کا فائدہ لینے والے بے حس لوگ مسافروں کا سامان لوٹنے میں مصروف تھے۔ مرزا شہ زور کا خاندان جان بچا کر قلعے سے بھاگا تھا۔ اس لیے اُن کے پاس سامان بھی برائے نام تھا لیکن لوٹنے والوں کو پھر بھی ان پر ذرا رحم نہ آیا۔ تاہم انھوں نے یہ احسان کیا کہ ان کی جان نہ لی اور انھیں زندہ چھوڑ دیا۔ انگریز فوج کی نظروں سے بچنے کے لیے راستہ تبدیل کیا تھا لیکن گوجروں نے لوٹ مار کر کے اور مصیبت پیدا کر دی۔ بقول شاعر:

؎ ایک اور دریا کا سامنا تھا منیرؔ مجھ کو — میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

(منیر نیازی)

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ یہ لٹا پٹا قافلہ کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ راستہ ویران، لق ودق جنگل، خوف کی فضا اور کمزور عورتوں کا ساتھ، انتہائی مشکل اور تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ وہ جنگ کی تباہی کا شکار تھے اور ان کا سامان بھی لٹ چکا تھا۔ اب ان کے پاس صرف جان بچانے کا امکان تھا۔ ان حالات میں نازک اور کمزور عورتوں کا ساتھ ہونے کی وجہ سے صورتِ حال بہت گمبھیر ہو گئی تھی۔

مرزا شہ زور کے ساتھ تین عورتیں تھیں۔ ایک اس کی بوڑھی ماں تھی جو بڑھاپے سے لاچار تھی۔ بڑھاپے اور غم کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو چکی تھیں اور ان کے لیے دو قدم چلنا بھی مشکل تھا۔ دوسری عورت مرزا شہ زور کی بیوی تھی۔ اگرچہ وہ جوان تھی لیکن بیماری کی وجہ سے وہ بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔ تیسری دس برس کی ایک معصوم لڑکی جو مرزا شہ زور کی بہن تھی۔ اس بے چاری کو زمانے کے حالات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ تھی کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا تھا۔ وہ سیاست اور اقتدار کی حرص وہوس سے بے بہرہ تھی۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ کا کچھ ادراک نہ تھا۔ قافلے میں موجود سب عورتیں غم اور مشکلات کا شکار تھیں۔ ہر ایک کے اپنے مسائل تھے۔ سب کو حالات کی ستم ظریفی کا سامنا تھا۔ وہ روتی تھیں اور غم ناک ہو کر بین کرتی تھیں۔ حالات کے ستم سہنا ان کے بس میں نہ تھا اور وہ بے چین ہو کر نالہ وفریاد کرتی تھیں۔ عورتوں کی ایسی حالت دیکھ کر مرزا شہ زور کا دل ٹوٹ جاتا تھا۔

؎ پوچھتے کیا ہو سبب دفنِ دلِ زار کے بعد — میں مصیبت زدہ اب بھی نہ ہراساں ہوتا

(ناطق گلاوٹھی)

مرزا شہ زور اپنی والدہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ مسلسل پریشانی میں مبتلا تھیں۔ ان کی باتیں سُن کر کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ فریاد کر رہی تھیں کہ اے اللہ! اس مصیبت کی گھڑی میں ہم کہاں جائیں، کس کا سہارا ڈھونڈیں اور کہاں پناہ تلاش کریں؟ ہمارا تخت وتاج لٹ چکا ہے۔ نہ ہمارا اقتدار باقی ہے نہ کوئی جائے امان، نہ ساز وسامان ہے اور نہ ہی کوئی حامی ومددگار۔ وہ اپنی بیمار بہو اور معصوم بچی کے بارے میں بہت پریشان تھیں۔ وہ تشویش میں مبتلا تھیں کہ انھیں کس کے حوالے کریں۔ لوگوں کے رویے دیکھ کر صرف انسانوں پر سے ہی اعتماد ختم نہیں ہوا تھا، انھیں درخت بھی دشمن لگنے لگے تھے۔ مشکلات کی کڑی دھوپ میں کہیں کسی شجر کا سایہ دکھائی نہیں دیتا تھا جو کچھ سکون کا ذریعہ ثابت ہوتا۔ مرزا کی بہن کی حالت بھی بہت ابتر تھی۔ وہ حالات کو دیکھ کر سہمی ہوئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا۔ وہ سہمی کھڑی تھی اور سب کو تکتی جا رہی تھی۔ اس کی معصومیت اور بے کسی دیکھ کر مرزا شہ زور کا دل بھر آتا تھا اور وہ غمگین ہو جاتے تھے۔

یہ حالات اگرچہ بہت ہمت شکن تھے لیکن شہ زور کو سب کی جان بچانے کی فکر تھی۔ چناں چہ اس نے عورتوں کو دلاسا دینا شروع کیا۔ انھیں آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ ہمت ہارنے سے سفر طے نہیں ہو سکتا اور مصیبتوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ سکون صرف منزل میں ہے۔ بقول شاعر:

؎ تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش — گل مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

(حیدر علی آتش)

اُنھوں نے عورتوں کی ہمت بندھا کر چلنے پر آمادہ کیا۔ گاؤں سامنے تھا اس لیے عورتوں نے مجبوراً چلنا شروع کر دیا لیکن

کسی میں چلنے کی طاقت نہ تھی۔ والدہ بہت کمزور ہو گئیں تھیں ان کے لیے چلنا دشوار تھا وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ انھیں اپنا اقتدار اور شان و شوکت یاد آتی تھی۔ محلات کے عیش و آرام کے مقابلے میں بے سروسامانی اور کسمپرسی ان کے لیے بہت مایوس کن تھی۔

صاف دیکھا ہے کہ غنچوں نے لہو تھوکا ہے　　موسمِ گل میں الٰہی کوئی دل گیر نہ ہو　　(تشنہ لکھنوی)

عبارت نمبر 8

"تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کو ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کر دیا، جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہ جہاں کے گھر والے ہیں، جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھادی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبہ میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے، آج ہم پر آسمان روتا ہے"۔

سیاق و سباق

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورہ پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد گھوڑوں کا اصطبل بن گئی۔ جب انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کیا تو شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے۔ راستے میں گوجروں نے ان پر حملہ کیا اور تمام سامان لوٹ لیا۔

تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ آخر مرزا شہ زور اور اس کے خاندان نے میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست طوفان آیا اور تمام سامان اس میں بہہ گیا اور مرزا شہ زور کی بیگم کو بخار ہو گیا۔ کچھ دن بعد وہ فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ وہ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات پر گزر بسر کرنے لگے۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق "فاقہ میں روزہ" میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مرزا شہ زور کی والدہ کی فریاد ہے۔ وہ اپنے حالات پر نوحہ کناں ہیں۔ جب لال قلعے پر قبضہ کر کے انگریز فوج نے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تو شاہی خاندان کے افراد جان بچا کر قلعے سے بھاگ نکلے۔ نازونعم میں پلی خواتین کو جب سخت راستوں کا سفر کرنا پڑا تو وہ بے بسی اور کسمپرسی کی تصویر بن گئیں۔ مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کے افراد پر جو قیامت ٹوٹی، وہ ایک ایسا المیہ تھا جس کی تصویر شہ زور کی والدہ کے الفاظ میں نظر آتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا فرمان مبارک ہے:

"مصائب برداشت کرو یہ تمھارے گناہوں کی وجہ سے آتے ہیں۔"

مرزا شہ زور کی والدہ کہتی ہیں کہ قسمت ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو بادشاہوں کے تاج کو ٹھوکریں مارتے تھے۔ یہ الفاظ دراصل ایک اُجڑے ہوئے خاندان کی چیخ پکار اور تقدیر کے جبر کی گواہی دیتے ہیں۔ ایک ایسا خاندان جس کی شرافت، جاہ و جلال اور

بادشاہی صدیوں تک ہندوستان پر حکمرانی کرتی رہی، آج دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھا۔ جن کی ہیبت اور شان و شوکت سے لوگوں کے دل کانپتے تھے، وہ زمین پر سر چھپانے کی جگہ تلاش کر رہے تھے۔ یہ تقدیر کی بے رحمی ہے کہ جن لوگوں نے تخت و تاج کو زینت بخشی وہی حالات کے تھپیڑوں کا شکار بن کر بے بسی کی تصویر بن گئے۔ جو بے کسوں کے کام آتے تھے، قسمت نے انھیں بے بس کر دیا تھا۔ بوڑھی ماں کے الفاظ صرف مغل خاندان کی تباہی کا نہیں بلکہ ایک تہذیب کی بربادی کا ماتم ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تقدیر نے ان لوگوں کو ٹھوکریں کھلوا دی ہیں جو دوسروں کو سہارا دیتے تھے، جن کی شفقت اور کرم نوازی سے بے کسوں کو پناہ ملتی تھی۔ تاریخ کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ مغل بادشاہوں نے اپنے دور میں انصاف اور رعایا پروری کی جو مثالیں قائم کیں وہ سب 1857ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر خاک میں مل چکی تھیں کیوں کہ ان کے اپنے گھرانے کے افراد کو پناہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔

ایسے بھی زبوں حال کئی لوگ ہیں کاشرؔ　　بے گھر ہیں اسی شہر میں گھر ہوتے ہوئے بھی　　(شوزب کاشرؔ)

مرزا شہ زور کی بوڑھی والدہ اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتی ہیں جو جنگ و جدل میں ناقابلِ شکست تھے۔ اس حوالے سے وہ چنگیز خان اور امیر تیمور کا ذکر کرتی ہیں۔ چنگیز خان دنیا کا ایک بڑا فاتح تھا۔ اس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپتے تھے۔ چنگیز خان کا اصل نام تموجن تھا اور وہ 1162ء میں منگولیا میں پیدا ہوا۔ اُس نے مختلف منگول قبائل کو متحد کر کے ایک طاقت ور فوجی قوت بنائی اور چین، وسطی ایشیا مشرقی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ تک فتوحات حاصل کیں۔ 1227ء میں اس کا انتقال ہوا۔ مرزا شہ زور کی والدہ نے اپنے آباؤ اجداد میں دوسرا نام امیر تیمور کا لیا ہے۔ امیر تیمور ازبکستان کے علاقے میں 1336ء پیدا ہوا۔ اس نے ایران، ہندوستان، شام، ترکی اور وسطی ایشیا سمیت کئی علاقے فتح کیے۔ 1405ء میں چین کی ایک مہم کے دوران میں اس کا انتقال ہوا۔ مغلوں کا تعلق چنگیز خان اور امیر تیمور کی نسل سے تھا۔ مرزا شہ زور کی والدہ نے اپنے آباؤ اجداد میں شاہ جہاں کا نام لیا اور اس کی بنوائی ہوئی دو عمارات تاج محل اور جامع مسجد دہلی کا ذکر کیا ہے۔ شاہ جہاں مغل سلطنت کا پانچواں بادشاہ تھا۔ اس نے 1628ء سے 1658ء تک ہندوستان میں حکومت کی۔ تاج محل، لال قلعہ اور دہلی کی جامع مسجد شاہ جہاں کے ذوقِ تعمیر کی یادگار مثالیں ہیں۔ غرض چنگیز خان کی نسل، تیمور کے وارث، وہ مغل جو کبھی ہندوستان کے تاجور تھے آج قسمت کے ہاتھوں بے بس ہو کر دربدر پھر رہے ہیں۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی کا ثبوت ہے۔ وقت بدلتا ہے تو کیسے کیسے عظیم لوگ اور طاقت ور بادشاہ خاک میں مل جاتے ہیں۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا　　کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا　　(میر تقی میرؔ)

یہاں دہلی کی جامع مسجد اور تاج محل کا ذکر کرنا بھی معنی خیز ہے۔ یہ مغلیہ دَور کی عظیم تعمیرات ہیں۔ لیکن یہ محض عمارتیں نہیں بلکہ ایک تہذیب کی عظمت کے نشان ہیں۔ یہ وہ یادگاریں ہیں جو آج بھی مغلوں کی شان و شوکت کی گواہی دیتی ہیں۔ شاہجہان نے تاج محل جیسا شاہکار تعمیر کرایا اور ایک قبر کو جواہرات سے سجا دیا تھا۔ اس نے ایسی عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی لاکھوں عقیدت مندوں کے سجدوں سے آباد ہے۔ اس عظیم بادشاہ کا خاندان بے کسی کی تصویر بنا بھٹک رہا تھا۔

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ شہ زور کی ماں اپنے خاندان کی عظمت اور شان و شوکت کو بیان کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم ہندوستان کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بنا کر عزت دی تھی۔ آج وہ سب کچھ لٹ چکا ہے۔ ہم کیوں ذلیل و رسوا ہو گئے ہیں؟ ہماری عظمت کا چراغ کیوں گُل ہو گیا ہے؟ آج ہم ایسی مصیبتوں میں گرفتار ہیں کہ آسمان بھی ہماری حالت پر اشک بہاتا ہے۔

مغلیہ اقتدار کا خاتمہ اور دہلی کی تباہی درحقیقت ہندوستان کی ایک پوری تہذیب کی موت تھی۔ دہلی جو کبھی علوم و فنون، عدل و انصاف، تہذیب و تمدن اور عظمت و جلال کا مرکز تھی، ایک ویران اور اُجڑی ہوئی بستی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ شہر جس میں شاہی دربار کی رونقیں اور رنگینیاں تھیں، وہاں خون کی ندیاں بہا دی گئیں۔

؎ لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں　　تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں　　(بشیر بدر)

مرزا شہ زور کی بوڑھی ماں صرف اپنی تباہی پر آنسو نہیں بہا رہی تھیں بلکہ وہ ہندوستان کی عظیم تاریخ کی موت پر نوحہ کر رہی تھیں۔ یہ تباہی صرف اس کے خاندان کی تباہی نہیں تھی بلکہ ایک پورا عہدِ زریں ظلم اور تاریکی کی نذر ہو گیا تھا۔ انگریزوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب اور طرزِ زندگی کو مٹانے کی کوشش کی تھی۔

یہ تاریخ کا ایک تلخ سبق ہے کہ طاقت اور عروج ہمیشہ قائم نہیں رہتے۔ کل کے حکمران آج بے یار و مددگار ہو جاتے ہیں۔ مرزا شہ زور کی کہانی عروج و زوال کی ایک داستان ہے جس میں اہلِ نظر کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔ بقول شاعر:

؎ زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا　　بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے　　(حیدر علی آتش)

عبارت نمبر 9

کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا، لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے۔ اُکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے: ''میاں جی! چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے۔ تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن نٹھالی (بے کار) بیٹھے کیا کرے ہے۔ کچھ کام کیوں نہیں کرتا؟ میں نے کہا: ''بھائی! جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے۔ ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے۔ جب فلک نے عالی شان محل چھین لیے تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات، سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے، خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتائی جاتی ہے۔ مجھ کو کوئی کام بتاؤ، ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کو موسیقی سننے کا بہت شوق تھا۔ لیکن ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا جس پر وہ رنجیدہ ہو گئے۔ ایک قریبی دوست کے مشورے پر شام کو افطاری کے وقت جامع مسجد دہلی چلے گئے جہاں کی رونق انھیں بہت پسند آئی۔ یہ مسجد جو کبھی مسلمانوں کی شان و شوکت کا مظہر ہوا کرتی تھی انگریزی حکومت کے آنے سے اصطبل میں تبدیل ہو گئی۔ جب انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، مرزا شہ زور اپنے اہلِ خانہ کو لے کر دہلی سے نکل گئے۔ راستے میں گوجروں نے ان پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا شہ زور نے اپنے خاندان سمیت میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آنے سے سب کچھ بہہ گیا اور صدقہ خیرات پر گزر بسر ہونے لگا۔ چھ ماہ گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

جب انگریز فوج نے دلی کے لال قلعے پر قبضہ کر کے مغلیہ سلطنت کا چراغ گل کر دیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو ہر طرف تباہی اور بربادی کا سماں تھا۔ شاہی خاندان کے افراد کو قتل کیا جا رہا تھا اور مسلمانوں پر بھی ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر جان بچا کر قلعے سے نکل گئے اور شاہی خاندان بے یار و مددگار رہ گیا۔ مرزا شہ زور بھی اپنی ماں، بیمار بیوی اور کم سن بہن کو لے کر قلعے سے بھاگ نکلے۔ ہر طرف افراتفری تھی اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ راستے میں گوجروں نے ان کا ساز و سامان لوٹ لیا۔ خواتین کی بُری حالت ہو گئی اور بڑی کسمپرسی کے عالم میں وہ مسلمان میواتیوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ انھوں نے ان لوگوں کی خاطر مدارات کی اور ایک چوپال میں رہنے کو جگہ دے دی۔

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ ان مسلمان گنواروں نے انھیں کچھ دن تو چوپال میں ٹھہرائے رکھا اور کھانے پینے کو بھی دیا لیکن غریب لوگ اتنے افراد کے کھانے پینے کا بوجھ کب تک برداشت کر سکتے تھے۔ آخر وہ اکتا گئے اور اُن سے کچھ کام لینے کا سوچنے لگے۔ انھیں چوپال سے بھی اٹھا دیا گیا۔ مرزا شہ زور جو کبھی مغل خاندان کے شہزادے تھے وہ اپنے خاندان کے ساتھ پناہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ گاؤں والوں نے انھیں کچھ دنوں کے لیے پناہ دی لیکن وہ ہمیشہ کے لیے ان کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے مرزا شہ زور سے کہا کہ چوپال چھوڑ کر ایک ٹوٹے ہوئے چھپر میں رہائش رکھ لیں۔ مرزا شہ زور کے لیے یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ ان کے لیے دنیا میں کوئی مستقل ٹھکانا نہیں بچا تھا۔ اس لیے انھوں نے گاؤں والوں کو حقیقت پسندانہ جواب دیا کہ:

''ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے، جب فلک نے عالی شان محل چھین لیے تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے؟''

مرزا کے یہ الفاظ نہ صرف ان کی حقیقت پسندی کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کی بے بسی اور کم مائیگی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ الفاظ وقت کے جبر اور قسمت کی ستم ظریفی کا اعلان بھی تھے۔ ان کی سلطنت، ان کے محلات، ان کی بادشاہت اور شان و شوکت سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اس حال میں تھے کہ کہیں چند دن پناہ مل جائے تو غنیمت سمجھتے:

؎ تدبیر سے قسمت کی بُرائی نہیں جاتی　　بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی　　(داغ دہلوی)

صرف ٹھکانے اور پناہ کا مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ ان کے لیے روزگار کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگرچہ ان گاؤں والوں نے ان کے کھانے پینے کی خبر رکھی مگر وہ خود بھی غریب لوگ تھے۔ اس لیے وہ زیادہ دن تک اتنے افراد کو مفت میں کھلا پلا نہیں سکتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے مرزا شہ زور سے کہا کہ تم بیکار بیٹھے رہتے ہو، بہتر ہے کوئی کام کرو۔ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ ایک ایسا شخص جو شاہی خاندان کا فرد تھا۔ جو خدمت گزاروں اور غلاموں کے جھرمٹ میں پلا بڑھا تھا، آج اس مقام پر آ گیا تھا کہ لوگ اس سے محنت مشقت کرنے کو کہہ رہے تھے۔ مرزا شہ زور تقدیر کے ہاتھوں مجبور تھے اور ان کی بات ماننے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بقول شاعر:

؎ تمھارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کرو سو کرو　　وگرنہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے　　(لوشی گیلانی)

مرزا شہ زور نے ان سے کہا کہ انھیں بھی خالی بیٹھنا گوارا نہیں۔ ان کا دل بھی بے کار بیٹھے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ انھوں نے کہا میں خود کوئی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی کام بتاؤ جو میں کر سکوں۔ گویا مرزا شہ زور ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے اور خود محنت سے کما کر گزارا کرنا چاہتے تھے۔ مرزا شہ زور ناز و نعم میں پلے تھے اور کوئی مشقت طلب کام نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن گاؤں میں تو سبھی کام جسمانی مشقت کے ہوتے ہیں۔ تقدیر نے انھیں ایک اور امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کس طرح کروٹ بدلتی ہے، وقت کس طرح عزت داروں کو ذلت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے اور انسان کس طرح بے بسی کی تصویر بن جاتا ہے۔

مرزا شہ زور محلات کی نرمی اور تہذیب میں پلا بڑھا تھا۔ گاؤں کے گنواروں کے سخت اور بے مروت الفاظ اور لہجے سے اسے یقیناً تکلیف پہنچی اور اسے اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوا۔ جو شہزادہ خدام کے جھرمٹ میں رہتا تھا، اسے گاؤں کے لوگوں کی سخت زبان اور تلخ رویے کا سامنا تھا۔ اس کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچی مگر حقیقت یہ تھی کہ اب وہ کسی محل اور جاگیر کا وارث نہیں تھا بلکہ ایک بے بس مسافر تھا۔ اس کے دل میں ماضی کی شان و شوکت اور حال کی ذلت کا شدید احساس تھا۔ مگر زندگی کے امتحان نے اسے حقیقت قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

؎ دیکھیے کیا دکھاتی ہے تقدیر　　چپ کھڑا ہوں گناہ گاروں میں　　(لالہ مادھو رام جوہر)

مرزا شہ زور کی داستان ایک فرد یا ایک خاندان کی کہانی نہیں بلکہ ایک عہد کا نوحہ ہے۔ وہ مغل جو کبھی ہندوستان کے مالک تھے، جن کے حکم پر فوجیں حرکت میں آ جاتی تھیں، جو شہروں کو بساتے اور اجاڑتے تھے، اب تقدیر کے ہاتھوں خود بے بس اور بے یار و مددگار ہو چکے تھے۔ ان کا غرور، ان کی شان و شوکت، ان کا اقتدار، سب کچھ وقت کی دھول میں دب چکا تھا۔ دہلی جو عظمت و جلال اور تہذیب و تمدن کی مرکز تھی، ظالموں کے ہاتھوں اجڑ چکی تھی۔ ہندوستان جو مغل بادشاہوں کا غلام تھا، اس کے باسی شاہی خاندان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہ

تھے۔ یہ عبرت کی کہانی ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میں جاں بلب ہوں اے تقدیر تیرے ہاتھوں سے کہ تیرے آگے مری کچھ نہ چل سکی تدبیر

(شیخ ظہورالدین حاتم)

عبارت نمبر 10

ان کا چودھری بولا: ''ہم نے گئے بیرا (ہمیں کیا خبر) کہ تم گئے کام (کیا کام) کر سکے ہے۔'' میں نے جواب دیا ''میں سپاہی زادہ ہوں۔ تیغ و تفنگ چلانا میرا ہنر ہے، اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔'' گنوار ہنس کر کہنے لگے، نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا۔ گھاس کھودنی پڑے گی۔ ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔ گنوار کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا: ''بھائیو! مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔'' مجھ کو روتا دیکھ کہ گنواروں کو رحم آ گیا اور بولے: ''اچھا! تو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔"

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مرزا سلیم موسیقی سننے کے بہت شوقین تھے۔ لیکن ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا جس پر مرزا رنجیدہ ہو گئے۔ اپنے ایک دوست کے مشورے پر مرزا شام کو افطار کے وقت جامع مسجد دہلی چلے گئے اور وہاں کی رونق انھیں بہت پسند آئی۔ غدر میں انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شاہی خاندان کے وارثوں کو پھانسی دے دی گئی اور ان کے اہلِ خانہ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ مرزا شہ زور نے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ میواتیوں کے گاؤں میں پناہ لی۔ جہاں پہلے تو انھیں چوپال میں ٹھہرایا گیا لیکن بعد میں وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ سیلاب آنے سے سب کچھ بہہ گیا اور صدقات و خیرات پر گزارا ہونے لگا۔ ان کی بیوی کو بخار ہوا اور وہ مر گئی۔ چھ ماہ میواتیوں کے گاؤں میں رہنے کے بعد شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز حکومت نے ان کی پانچ روپے پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

مرزا شہ زور اپنی والدہ، بیمار بیوی اور کم سن بہن کے ہمراہ میواتیوں کے گاؤں پہنچا تو انھوں نے انھیں رہنے کو چوپال میں جگہ دی۔ کچھ روز انھوں نے شاہی خاندان کے افراد کے کھانے پینے کا خیال بھی رکھا۔ چند دن بعد انھوں نے چوپال خالی کرنے کو کہا اور انھیں ایک پرانے چھپر میں رہنے کو جگہ دے دی۔ گاؤں والوں نے مرزا شہ زور کو کوئی کام کاج کر کے کمانے کا مشورہ دیا۔ مرزا شہ زور شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں دلی کی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد وہ قلعے سے جان بچا کر اپنے خاندان کے ساتھ میواتیوں کے ایک گاؤں میں پہنچا تھا۔

مرزا شہ زور کی یہ داستان ان کی بے بسی اور بے سروسامانی کا کربناک منظر پیش کرتی ہے۔ جو لوگ کل تک تخت نشین تھے، جن کے محلوں میں عیش و عشرت کے ساز و سامان موجود تھے، وہ معمولی پناہ کے لیے مجبور اور بے بس تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ در بدر بھٹکتے رہے اور پناہ کے متلاشی رہے۔ جن لوگوں نے مہربانی کرتے ہوئے انھیں پناہ دی وہ بھی زیادہ دن تک ان کا بوجھ اٹھانے پر آمادہ نہ تھے۔ شاہی خاندان کا یہ فرد جو کبھی بے حساب دولت اور بے شمار نعمتوں کا مالک تھا، اپنے رہنے

سہنے اور کھانے پینے کے لیے گنوار دیہاتیوں کے رحم و کرم پر تھا۔

ہوا کے رحم و کرم پہ ہُوں بے ٹھکانہ ہُوں شجر سے ٹوٹا ہُوا ایک زرد پتا ہُوں (محفوظ الرحمٰن عادل)

گاؤں والوں نے انھیں چند روز پناہ دی اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کیا لیکن وہ اس ذمہ داری کو آخر کب تک اٹھاتے؟ وہ لوگ اپنی زندگی کی دوڑ میں مصروف تھے۔ ان کے لیے ایک اجڑے خاندان کو ہمیشہ کے لیے پالنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے مرزا شہ زور کو کام کاج اور محنت مشقت کرنے کو کہا تو ایک اور تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑا۔ مرزا شہ زور سے گاؤں والوں نے کہا کہ تم کیا کام کر سکتے ہو؟ شہ زور نے بتایا کہ وہ سپاہی زادہ ہے اس لیے تلوار اور بندوق چلانے کے سوا کسی اور فن سے واقف نہیں۔ تلوار بازی کوئی معمولی فن نہیں لیکن گنواروں کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

کسی مرض کی دوا چشمِ اشک بار نہیں نہ انتظار کے قابل نہ خواب کے قابل (جلیل مانک پوری)

تلخ حقیقت یہ تھی کہ وہ شخص جو فوجوں کی قیادت کرتا تھا، جس نے شاہی دربار کے آداب میں پرورش پائی تھی، جس کا پیشہ تلوار بازی تھا اور جس کی حکمتِ عملی جنگی چالیں چلنا تھا، اس سے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ گزر بسر کے لیے کیا کام کر سکتا تھا۔ اور اس کے جواب میں جب اس نے بتایا کہ وہ تلوار اور بندوق چلانے کا ماہر ہے، اس کے سوا کچھ نہیں جانتا تو گاؤں والوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔ ایک گنوار نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ یہاں تلوار بازی کی نہیں، ہل چلانے اور کھیتوں میں محنت مزدوری کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک بھیانک حقیقت تھی کہ طاقت وروں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا اس لیے تلوار کسی کام کی نہیں تھی۔ تلوار بازوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لیے طاقت اور ہنر بھی بے کار ہو چکے تھے۔ گاؤں والوں نے کہا کہ ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں؟ یہاں تو گھاس کھودنی ہوگی اور کھیتوں میں ہل چلانا ہوگا۔ یہ سن کر مرزا شہ زور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اشک بار آنکھوں سے کہا کہ بھائیو! مجھے تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔

مرزا شہ زور کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ تلوار بازی کی بجائے اب اسے گھاس کھود کر پیٹ پالنا ہوگا۔ مغل دربار کی شان و شوکت کا حصہ رہنے والا شخص ایک دیہاتی سے یہ سُن رہا تھا کہ اس کی تلوار کسی کام کی نہیں اور اب اسے ہل چلانا اور کھیتوں میں کام کرنا ہوگا۔ جب اس نے اشک بار آنکھوں سے التجا کی کہ اسے کھیتوں میں کام کرنا نہیں آتا تو گاؤں والوں کو رحم آ گیا۔ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ مرزا شہ زور اور اس کا خاندان بے بس تھا۔ وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ مرزا شہ زور کے ہاتھ وہ کام کرنے کے عادی نہیں تھے جو عام کسان کرتا تھا۔ چناں چہ انھوں نے ایک درمیانی راستہ نکالا اور کہا کہ وہ کھیتوں کی رکھوالی کا کام کر لے۔ وہ کھیتوں کی نگرانی کرے کہ کوئی جانور یا چور ان کی فصلوں کو نقصان نہ پہنچائے۔ ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ ان کی عورتیں گاؤں کی خواتین کے کپڑے سیا کریں گی۔ اس محنت کے عوض مرزا شہ زور اور ان کے خاندان کو کھانے کے لیے اناج دے دیا جائے گا۔ جو پورے سال کے گزارے کے لیے کافی ہوگا۔

مرزا شہ زور نے مجبوراً یہ منظور کیا اور کام کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مرزا شہ زور جو کبھی حکم دینے والے تھے، آج یہ نوبت آ چکی تھی کہ وہ دوسروں کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ محل میں وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارتے تھے لیکن یہاں گاؤں میں انھیں دوسروں کی شرائط پر زندہ رہنا تھا۔ شاہی دسترخوان پر اَن گنت نعمتوں کے مزے لینے والا، اب گاؤں کے کسانوں کی دی ہوئی خوراک پر گزارا کرنے پر مجبور تھا۔ گاؤں کا ماحول، گنواروں کا اندازِ تکلم اور سخت رویہ بھی مرزا شہ زور اور ان کے خاندان کے لیے اذیت کا باعث تھا۔ مرزا شہ زور محلات کی نرمی اور تہذیب میں پلا بڑھا تھا۔ گاؤں کے گنواروں کے سخت اور بے مروت الفاظ اسے اپنی بے بسی کا شدید احساس دلاتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے مہربانی کرتے ہوئے مرزا شہ زور کے خاندان کو پناہ دی تھی لیکن ان کے رویے اور درشت لہجے یہ باور کراتے تھے کہ اب وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہیں۔

دیکھیے کیا دکھاتی ہے تقدیر چپ کھڑا ہوں گناہ گاروں میں (لالہ مادھورام جوہر)

یہ تمام واقعات ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ طاقت اور اقتدار ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتے۔ مرزا شہ زور اور ان کے خاندان کی کہانی اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ عروج ہمیشہ زوال کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور وقت کسی کے ساتھ وفادار نہیں رہتا۔

مری عروج کی لکھی تھی داستاں جس نے مرے زوال کا قصہ بھی اس کتاب میں تھا (وکاس شرما راز)

عبارت نمبر ①

چناں چہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اُڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینا آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا۔ میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں، وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر خود لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں، مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی۔ سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالا چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہو گیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چوں کہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا، اس لیے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل ہی غرق آب ہو گئیں اور عورتیں چیخیں مارنے لگیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلیوں میں دو چارپائیاں اُڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹا بھر میں اُتر گیا مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مرزا سلیم موسیقی کے بہت شوقین تھے۔ لیکن ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا جس پر وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ اپنے ایک دوست کے مشورے پر وہ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد گئے۔ وہاں کی رونق انھیں بے حد پسند آئی۔ انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا۔ انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی لہٰذا شاہی خاندان کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ مرزا شہ زور اپنی والدہ، بیوی اور کم سن بہن کے ہمراہ دلی سے نکل گئے اور انھوں نے میواتیوں کے گاؤں میں پناہ لی۔ جہاں انھیں چوپال میں ٹھہرایا گیا۔ بعد میں مرزا کو کھیتوں کی رکھوالی پر رکھ لیا گیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ میواتیوں کے گاؤں میں سیلاب آنے کی وجہ سے سب کچھ بہہ گیا اور صدقات، خیرات پر گزر بسر ہونے لگی۔ چھ ماہ گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا دہلی چلے گئے جہاں انگریز حکومت نے ان کی پانچ روپے ماہوا پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق "فاقہ میں روزہ" میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں بتایا گیا ہے کہ مرزا شہ زور نے کھیت سے جانور اُڑانے کا کام شروع کر دیا۔ بھادوں کے مہینے میں سیلاب کی وجہ سے بھی اُن کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مرزا شہ زور اپنی داستان سنا رہے ہیں کہ دلی کی تباہی کے بعد وہ میواتیوں کے گاؤں میں پہنچے اور ایک چھپر میں رہنا شروع کیا۔

مرزا شہ زور کی یہ داستان ایک زوال پذیر عہد کی کہانی ہے، ایک وقت تھا جب شاہی خاندان کی عظمت اور جلالت تھی لیکن دلی کی تباہی کے بعد وہی خاندان در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ لوگ جو کبھی محلات میں عیش و عشرت کی زندگی بسر

کرتے تھے، اقتدار چھن جانے کے بعد ٹوٹی جھونپڑی میں رہنے پر مجبور تھے۔ لاچاری اور بے بسی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول بھی کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ مرزا شہ زور اپنے خاندان کے ہمراہ میواتیوں کے دیہات میں پناہ لینے پر مجبور تھے۔ وہ دیہاتی خود اپنی زندگی کی سختیوں سے پریشان تھے۔ وہ خود محنت مشقت کر کے روزی کماتے تھے۔ اس لیے زیادہ عرصے تک کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا شہ زور کو مجبوراً گاؤں کے کھیتوں کی رکھوالی کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔ ان کی بیمار بیوی اور کم سن بہن کو بھی گاؤں کی عورتوں کے کپڑے سینے کا کام کرنا پڑا۔

مرزا شہ زور کھیتوں میں جاتے اور سارا دن ان کی نگرانی کرتے۔ فصلوں کو جانوروں سے بچاتے اور فصلوں کی حفاظت کرتے۔ گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ خواتین کے لیے یہ سب کچھ نیا اور اجنبی تھا۔ ایک وقت تھا جب وہ محلات میں رہتی تھیں۔ انھیں ہر طرح کے جواہرات اور ریشمی لباس میسر تھے۔ کام کاج کے لیے کنیزیں اور خادمائیں ہر وقت خدمت میں حاضر رہتی تھیں۔ وقت بدلا اور آج وہ ایک معمولی جھونپڑی میں بسیرا کرنے پر مجبور تھیں۔ آج وہ خود دوسروں کے لباس سیتی تھیں تاکہ کچھ غلہ حاصل ہو اور ان کی گزر بسر ہو سکے۔

سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی

بدقسمتی صرف روزگار کی تنگی تک محدود نہ تھی۔ جب بھادوں کا مہینا آیا تو گاؤں میں وبائی بخار پھیل گیا۔ بخار نے ہر گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مرزا شہ زور کی بیوی اور بہن بھی بخار کی لپیٹ میں آ گئیں۔ گاؤں کے میواتی تو سخت جان تھے اس لیے بخار سے پریشان نہیں ہوتے تھے۔ اس قسم کی بیماری میں وہ دوا اور حکیم کے محتاج نہ تھے بلکہ ٹونے ٹوٹکے کر کے خود ہی ٹھیک ہو جاتے تھے۔ مگر مرزا شہ زور اور ان کا خاندان جو شاہی محل میں زندگی گزارنے کا عادی تھا، اتنا سخت جان نہ تھا۔ وہ بیماری میں عمدہ علاج اور بہترین طبی سہولیات کے عادی تھے۔ اس لیے جب شہ زور کی بیوی اور بہن کو بخار نے آلیا تو ان کے لیے یہ ایک ناقابلِ برداشت اذیت بن گیا۔ ان کے پاس دوا تھی نہ حکیم اور نہ ہی کوئی ایسا شخص تھا جو ان کی مدد کر سکتا۔ یوں وہ بے بسی کی تصویر بنے اپنی بیوی اور بہن کو تکلیف میں تڑپتا دیکھتے رہے اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ یہ حالت ان کے لیے اس صدمے سے کم نہ تھی جو انھیں دہلی کی تباہی کے وقت سہنا پڑا تھا۔

مرزا شہ زور کا خاندان ابھی بخار کی تکلیف جھیل رہا تھا کہ ان پر ایک اور آفت آن پڑی۔ ایک رات شدید طوفانی بارش ہوئی، جس نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگل سے نکلنے والا نالہ چڑھ آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاؤں سیلاب کی زد میں آ گیا۔ ہر طرف کمر تک پانی جمع ہو گیا۔ کسان اور دیہاتی تو اس قسم کی آفت کے عادی تھے۔ برسات کے موسم میں گاؤں میں سیلاب آنا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ انھوں نے سیلاب سے نمٹنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ مگر مرزا شہ زور اور ان کا خاندان تو شاہی محلات کی محفوظ دیواروں میں رہنے کا عادی تھا۔ اس لیے یہ صورت حال ان کے لیے نہایت ہول ناک تھی۔

پانی تیزی سے ان کے جھونپڑے میں داخل ہونے لگا اور عورتوں کی چارپائیاں پوری طرح پانی میں ڈوب گئیں۔ مرزا شہ زور اپنی بوڑھی ماں، بیمار بیوی اور بہن کو بڑی بے بسی سے چیختے چلاتے دیکھتے رہے لیکن فوری طور پر کچھ نہ کر سکے۔ آخر بڑی مشکل سے چھت کے شہتیروں اور بلیوں سے چارپائیاں پھنسا کر عورتوں کو بٹھایا گیا۔ ان کے لیے یہ سب ایک خوف ناک خواب کی مانند تھا۔ وہ لوگ جو کبھی دہلی کے عالی شان محلوں میں چین و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے، بدقسمتی سے گاؤں کی ایک جھونپڑی میں پانی کے رحم و کرم پر تھے۔ جس خاندان نے ہندوستان پر تین سو سال حکومت کی تھی، وقت کے تھپیڑوں نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ حالات اور لوگوں کے رحم و کرم پر تھے۔

بات رکھ لی مرے قاتل نے گناہ گاروں میں اس گناہ پر مجھے مارا کہ گناہ گار نہ تھا (امیر مینائی)

پانی کچھ ہی دیر میں اتر گیا لیکن جو نقصان ہو چکا تھا وہ ناقابلِ تلافی تھا۔ ان کا کھانے کا اناج مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔ جو چند کپڑے وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، وہ سب خراب ہو چکے تھے۔ وہ پہلے ہی غربت اور تنگ دستی کا شکار تھے، اب جو کچھ بھی ان کے پاس

تھا، وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ بیماری اور تکلیف میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پاس کھانے اور اوڑھنے بچھانے کو بھی کچھ نہیں بچا تھا۔

مرزا شہ زور کی دردناک کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ طاقت، دولت اور بادشاہت، کسی بھی چیز کو ثبات نہیں۔ جو آج عروج پر ہے وہ کل زوال کا شکار ہو سکتا ہے۔ وقت کا ایک دھارا ہے جو کبھی ایک جانب بہتا ہے اور کبھی دوسرے رخ۔

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں　　(میر حسن)

عبارت نمبر 12

پچھلی رات میری بیوی کو درِ دِزہ شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بھی بخار آیا۔ اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ، مینہ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے، آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے الٰہی! کیا انتظام کیا جائے۔ مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ یہاں تک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ بچہ پیٹ ہی میں رہا۔

چوں کہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں، غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی، مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا بڑا لگا کہ جان لے کر گیا۔ صبح ہو گئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی، تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورِ غریباں میں ہمیشہ کے لیے جا سوئی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورہ پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد گھوڑوں کا اصطبل بن گئی۔ جب انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کیا تو شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔

تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ جب رمضان آیا تو افطاری کے لیے بھی کچھ نہ تھا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دن گاؤں کے چودھری کا آدمی زکوٰۃ کے کچھ پیسے اور کھانا لے کر آیا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مرزا شہ زور کی بیوی کی وفات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں مغل اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور دہلی کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر قلعے سے نکل گئے اور شاہی خاندان کے افراد بھی جانیں بچانے کے لیے منتشر ہو گئے۔ مرزا شہ زور بھی اپنی بوڑھی ماں، بیمار بیوی اور کم سن بہن کو لے کر میواتیوں کے ایک گاؤں پہنچے اور وہاں پناہ لی۔ اس اقتباس میں مرزا شہ زور کے درد و الم کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ مرزا شہ زور کی روداد ایک ایسی آزمائش کی تصویر ہے جو نہ صرف ایک خاندان بلکہ ایک پوری سلطنت کے زوال کا درد اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ خاندان ہندوستان پر حکمرانی کرتا تھا، تخت و تاج کا مالک تھا، لیکن وقت نے ایسی کروٹ لی کہ شاہی خاندان در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا　　کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا　　(میر تقی میر)

مرزا شہ زور کے لیے زندگی پہلے ہی کسی عذاب سے کم نہ تھی لیکن قدرت نے اُن پر ایک ایسا قیامت خیز وار کیا، جس کا صدمہ شاید کسی انسان کے لیے سہنا ممکن نہ ہو۔ بارش کی وجہ سے جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں سیلاب آ گیا۔ عورتوں کی چارپائیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ بڑی مشکل سے چھت کے شہتیروں کے ساتھ چارپائیوں کو باندھ کر عورتوں کو بٹھایا گیا۔ پانی تو جلد اتر گیا لیکن اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے سب خراب ہو گئے۔ بارش کی تباہی اور کھانے پینے کی چیزوں کا بھیگ جانا بھی ایک سخت آزمائش تھی۔ مرزا شہ زور کی بیوی جو ہمیشہ شاہی محلات میں پلی تھی، مسلسل مصیبتیں اور تکلیفیں سہتے سہتے کمزور ہو چکی تھی۔ بھوک، بیماری، بے سروسامانی اور غربت کا یہ حال تھا کہ اب مزید کسی آزمائش کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ ایسے میں جب بارش کی رات سیلاب سے ہر چیز بھیگ چکی تھی، قدرت نے ان کے مقدر میں ایک اور امتحان لکھ دیا تھا۔ مرزا شہ زور کی بیوی کو بچے کی پیدائش سے پہلے کا درد شروع ہو گیا جس سے اُسے تیز بخار نے آ لیا اور وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئی۔ یہ ایسا لمحہ تھا جب وہ خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اندھیری رات، گیلے کپڑے، سرد موسم، بخار سے جلتا ہوا جسم، نہ کوئی آگ جلانے کا بندوبست، نہ کوئی دوا، نہ حکیم، نہ کوئی طبی امداد اور نہ ہی کوئی مددگار، یہ سب کچھ کسی بھی انسان کی ہمت توڑنے کے لیے کافی تھا۔ ایسے لمحات میں مرزا شہ زور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ صرف بے بسی کی تصویر بنے تڑپتی ہوئی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں　　روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے　　(حیدر علی آتش)

بخار نے شدت اختیار کی، تکلیف بڑھنے لگی اور وہ کراہتی رہیں۔ ان کی برداشت آخری حدوں کو چھونے لگی اور آخر کار شدید اذیت میں تڑپتے ہوئے اُن کی جان نکل گئی۔ یہ صدمہ شہ زور کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے گھربار، عیش و آرام، مال و اسباب اور شان و شوکت سے محروم ہو چکا تھا۔ اب اپنی شریکِ حیات کو بھی کھو بیٹھا۔ یہ ایسا صدمہ تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مرزا شہ زور کی بیوی نے زندگی محلات کی نرمی اور آرام و آسائش میں گزاری تھی۔ مغل اقتدار کے خاتمے اور دہلی کی تباہی نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ غدر نے شہ زور کے خاندان سے صرف اقتدار ہی نہیں چھینا تھا بلکہ اس کی باوفا بیوی کی ہلاکت کا سبب بھی بن گیا تھا۔ شہ زور کی بیوی کی وفات کا المیہ رات کو رونما ہوا اور صبح کے وقت گاؤں والوں کو اس حادثے کی خبر ہوئی۔ گاؤں والے اگرچہ گنوار تھے اور شاہی خاندان کی عظمت و شان و شوکت سے ناواقف تھے مگر انسانیت کے ناتے مدد کے لیے آگے بڑھے۔ انھوں نے کفن کا انتظام کیا اور دوپہر تک مرزا شہ زور کی بیوی کو دفن کر دیا گیا۔ مغلیہ خاندان کی شہزادی جس کے محلات میں کبھی نعمتوں کی کمی نہ تھی، وہ خاموشی سے ہمیشہ کے لیے گورِ غریباں میں جا سوئی۔

وہ شہزادی جو کبھی ہندوستان کی شان تھی، گاؤں کے عام قبرستان میں دفن ہوئی۔ اس کی موت پر نہ کوئی سوگ منایا گیا، نہ نوحے پڑھے گئے اور نہ ملک افسردہ ہوا۔ ناز و نعم میں پلنے والی کا جنازہ ایسے سادہ انداز میں اٹھا کہ جیسے وہ کبھی شاہی خاندان کا حصہ تھی ہی نہیں۔ 1857ء کی جنگِ آزادی نے اس نازک شہزادی کو ایسی مصیبتوں میں گرفتار کر دیا تھا کہ جن کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔ غدر کی مصیبتیں ہی اس کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں لیکن وہ ایک باہمت خاتون تھی۔ ہر مصیبت میں اس نے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ اس نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور ہر مصیبت میں اس کے ساتھ رہی، اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ مسلسل سفر، خوراک کی کمی اور بیماری نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا، اس لیے مزید تکالیف کا سامنا نہ کر سکی اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس کی موت مرزا شہ زور کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھی لیکن دوسروں کے لیے ایک عام واقعہ تھا۔

اس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا　　جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں　　(جون ایلیا)

ہر زندہ چیز نے موت کا مزا چکھنا ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن مرزا شہ زور کی بیوی قسمت کی ستم ظریفی اور حالات کا شکار ہو کر، بڑی بے بسی کے ساتھ موت سے ہم آغوش ہوئی۔

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی　　تم جیسے گئے، ایسے بھی جاتا نہیں کوئی　　(کیفی اعظمی)

مرزا شہ زور کی کہانی حالات کی سنگینی کی پُر درد داستان ہے۔ مغل اقتدار کے خاتمے کے بعد شاہی خاندان کو کہیں چین نہ ملا۔ اقتدار چھن جانے کے بعد وہ جانیں بچانے کی فکر میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ ہر لمحہ ان کے مصائب بڑھتے رہے۔ زندگی ان کے لیے وبال

بن گئی۔ ان کے لیے زندگی صرف غموں اور دکھوں کا نام رہ گئی۔ مرزا شہ زور کی بیوی نے بھی وہ دکھ اٹھائے کہ جن کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ اس کی زندگی کے تمام دکھوں کا مداوا صرف موت ہی کر سکی۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں (غالبؔ)

عبارت نمبر 13

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیوں کہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا وہ بھی ہماری طرح مصیبت میں مبتلا تھے۔

تاہم بے چارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپیہ کا آٹا منگوا دیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا، وہ ہر وقت گذشتہ زمانے کو یاد کیا کرتی تھیں، رمضان کا چاند دیکھ کر انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو اگلا وقت یاد آ گیا ہے۔ تسلی کی باتیں کرنے لگا، جس سے ان کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورہ پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد گھوڑوں کا اصطبل بن گئی۔ شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان اس میں بہہ گیا۔ مرزا شہ زور کی بیگم کو بخار ہو گیا اور کچھ دن بعد وہ فوت ہو گئی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ جب رمضان آیا تو افطاری کے لیے بھی کچھ نہ تھا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دن گاؤں کے چودھری کا آدمی زکوٰۃ کے کچھ پیسے اور کھانا لے کر آیا۔ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

1857ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر کے مغلیہ حکومت کا چراغ گل کر دیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر جان بچا کر قلعے سے نکل گئے۔ انگریز فوج نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ مغل خاندان کے افراد کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جانے لگا تو مرزا شہ زور اپنی بوڑھی ماں، بیمار بیوی اور کم سن بہن کو لے کر قلعے سے نکل گئے۔ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے وہ مسلمان میواتیوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں والوں نے انھیں رہنے کے لیے ایک جھونپڑی دے دی۔ مرزا شہ زور ان کی فصلوں کی رکھوالی پر مامور ہوئے اور خواتین نے گاؤں کی خواتین کے کپڑے سینے شروع کر دیے۔ برسات کے دنوں میں گاؤں میں سیلاب آ گیا اور اناج اور کپڑے سب کچھ بھیگ گیا۔ مرزا کی بیوی بیمار ہو گئی اور اسی کسمپرسی کی حالت میں فوت ہو گئی۔ دہلی کی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد شاہی خاندان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، مرزا شہ زور ان کا ذکر کر رہے ہیں۔ شہ زور کی داستان اتنی کرب ناک ہے کہ اسے پڑھ کر قاری کا دل بھر آتا ہے۔ مرزا شہ زور کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر دن اور ہر رات ایک نئی آزمائش اور نئے صدمے سے بھرپور تھی۔ وہ شاہی خاندان جو کبھی ہندوستان کا حکمران تھا اور ہزاروں ملازمین جس کے حکم کے منتظر رہتے تھے، دوسروں کی ملازمت

کرنے پر مجبور تھا۔ نعمتوں اور آسائشوں میں پلنے والے لوگ، دو وقت کی روٹی کے محتاج ہو گئے تھے۔

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ بارش کے طوفان نے جو تباہی مچائی وہ محض مکانوں اور جسموں تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے اثرات پیٹ کی بھوک تک جا پہنچے تھے۔ بارش نے کھانے پینے کا سامان خراب کر دیا تھا۔ اناج گل سڑ گیا تھا۔ اس لیے کھانے پینے کو کچھ دستیاب نہیں تھا لیکن بھوک مٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرنا تھا، مصیبت یہ تھی کہ زندہ رہنے کے لیے کھانے کا بندوبست کیسے کیا جائے؟ بے بسی کا یہ عالم تھا کہ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے شرم آتی تھی، کیوں کہ وہ خود بھی اسی آزمائش میں گرفتار تھے۔ اس کے علاوہ شاہی خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ دوسروں کو عطا کیا تھا، کسی سے کچھ مانگا نہیں تھا۔ اس لیے دوسروں سے سوال کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ غربت، مصیبت اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ مدد دینے والا بھی اسی طرح بے بس تھا جس طرح مدد مانگنے والا مجبور تھا۔ لیکن تسکین کی بات یہ تھی کہ ان حالات میں بھی انسانی ہمدردی زندہ تھی۔

گاؤں کے چودھری کو ان کے حالات کا علم ہوا تو وہ خود مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے آدمی بھیج کر قطب صاحب سے ایک روپے کا آٹا منگوا دیا۔ مصیبت میں گاؤں کے چودھری کی یہ مہربانی بھی بہت بڑی بات تھی۔ ان حالات میں ایک لقمہ بھی کسی بہت بڑی نعمت سے کم نہ تھا۔ یہ صبر اور برداشت کا امتحان تھا۔ وہ خاندان جو کبھی ہندوستان کے پیش بہا خزانوں کا مالک تھا، اب دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ ہاتھ جو کبھی شاہی خزانوں سے دوسروں کو عطا کرتے تھے، آج محتاجی کی چکی میں پس رہے تھے۔ وقت کی ستم ظریفی تھی کہ شاہی دسترخوان پر نعمتوں کے مزے لوٹنے والوں کے لیے روٹی کا ایک نوالہ حاصل کرنا مشکل ہو چکا تھا۔

تنگ دستی، فاقہ مستی نے ہمیں گھیرا ہے آج اب نہ دنیا ہے، نہ عقبیٰ سب نے منھ پھیرا ہے آج (شمراوی کلثوم)

چودھری کا منگوایا ہوا آٹا ابھی آدھا بھی خرچ نہیں ہوا تھا کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا۔ رمضان کا چاند مسلمانوں کے لیے ہمیشہ خوش خبری اور برکت لے کر آتا ہے مگر اس خاندان کے لیے یہ چاند ماضی کی یادوں کا ایک ایسا دریچہ کھول گیا جس نے ان کے دلوں کو چیر کر رکھ دیا۔ مرزا شہ زور کی والدہ بہت نازک اور نیک دل خاتون تھیں۔ وہ غم واندوہ کو بہت جلد اور بڑی شدت سے محسوس کرتی تھیں، رمضان شریف کی آمد کا سُن کر وہ اداس ہو گئیں۔ ایک گہری سانس لے کر وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو گئیں۔ وہ کچھ بولیں نہیں مگر مرزا شہ زور ان کی خاموشی کا مطلب بخوبی سمجھ چکے تھے۔ یہ خاموشی ایک نہ ختم ہونے والے درد کی گواہی دے رہی تھی۔ وہ درد جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے میرے نالوں کی گم شدہ آواز (فیض احمد فیض)

مرزا شہ زور کی والدہ کو پچھلا زمانہ یاد آ رہا تھا جب وہ دہلی کے شاہی محل میں تھیں۔ ان دنوں جب رمضان کا مہینا آتا تھا تو ہر طرف چہل پہل اور رونق ہوتی تھی۔ شہزادیاں اور ملکائیں جامع مسجد میں روزانہ ہزاروں افراد کی افطاری کا اہتمام کرتی تھیں۔ تھال بھر بھر کر غریبوں کے لیے کھانے بھیجا کرتی تھیں۔ دل کھول کر محتاجوں کی مدد کرتی تھیں۔ وہ شاہی خاندان جو دوسروں کو عطا کرتا تھا آج خود ایک وقت کی روٹی کے لیے دوسروں کا محتاج تھا۔ یہ ایک ایسا دکھ تھا جو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے شہ زور کی والدہ رمضان کا چاند دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

مرزا شہ زور اپنی والدہ کی دلی کیفیت کو سمجھ چکے تھے اس لیے انھوں نے فوراً تسلی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی والدہ کو کچھ ڈھارس ہوئی لیکن مرزا شہ زور جانتے تھے کہ یہ زخم لفظوں سے بھرنے والا نہیں۔ ماضی کے وہ مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھے جب شاہی محلات میں نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوتے تھے، جب رمضان میں غریبوں کے لیے وسیع دسترخوان بچھائے جاتے تھے۔ آج اس بے سروسامانی میں وہ سب نظارے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ لیکن وقت کو لوٹایا نہیں جا سکتا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا (علامہ اقبالؒ)

عبارت نمبر 11

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے، مگر جب آٹا ختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا۔ بھوک کے مارے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کر کے بہت رویا کرتی تھیں، مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ ان کی خاموشی و اطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، دلاسا دینے لگا۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے پر نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے، بس ایک غوط سا تھا۔ اس غوط (غشی) اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آ گیا۔ والدہ صاحبہ اٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں انھوں نے دعا مانگی، ان کا نقل کرنا محال ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ مرزا سلیم موسیقی سننے کے شوقین تھے۔ لیکن ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ جس پر وہ بہت رنجیدہ ہو گئے۔ اپنے ایک دوست کے مشورے پر مرزا شام کو افطار کے وقت جامع مسجد گئے۔ وہاں کی رونق انھیں بے حد پسند آئی۔ غدر میں انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جامع مسجد جو کبھی مسلمانوں کی شان و شوکت کا نشان ہوا کرتی تھی اسے اصطبل بنا دیا گیا۔ غدر میں انگریزوں نے شاہی خاندان کے لوگوں کو چن چن کر قتل کر دیا۔ مرزا شہ زور اس کسمپرسی کے عالم میں اپنے خاندان سمیت دہلی سے میواتیوں کے ایک گاؤں آ گئے۔ گاؤں والوں نے مرزا کو کھیتوں کی رکھوالی کے لیے رکھ لیا۔ گاؤں میں سیلاب آنے کے باعث سارا اناج بھیگ گیا اور استعمال کے قابل نہ رہا۔ ان حالات میں گاؤں کے چودھری نے ایک روپے کا آٹا منگوا دیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ رمضان میں فاقے میں روزہ رکھنا پڑا۔ چھ ماہ گاؤں میں رہنے کے بعد جب مرزا دہلی آئے تو انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت درد انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریز فوج نے لال قلعے پر قبضہ کر لیا اور مغلیہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر لال قلعے سے نکل گئے اور شاہی خاندان کا کوئی پُرسانِ حال نہ رہا۔ انگریز فوج نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسلمانوں کو تباہ کر ڈالا۔ شاہی خاندان کے افراد جانیں بچا کر قلعے سے نکل گئے۔ مرزا شہ زور بھی اپنی ماں، بیمار بیوی اور کم سن بہن کے ساتھ قلعے سے نکل کر میواتیوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں والوں نے انھیں ایک جھونپڑی میں پناہ دی اور مرزا شہ زور کو کھیتوں کی رکھوالی کے لیے رکھ لیا۔ بارش کی وجہ سے گاؤں میں سیلاب آ گیا اور اناج خراب ہو گیا۔ مرزا شہ زور کی بیوی بیمار ہو گئی اور تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اناج خراب ہو چکا تھا اس لیے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گاؤں کے چودھری نے ہمدردی کرتے ہوئے ایک روپے کا آٹا منگوا دیا۔ ابھی آدھا آٹا ختم ہوا تھا کہ رمضان المبارک شروع ہو گیا۔

تشریح طلب عبارت میں مرزا شہ زور اپنی داستانِ غم سنا رہے ہیں۔ ان کی داستان انسانی بے بسی اور قسمت کی بے رحمی کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کی زندگی کا ہر دن ایک نئی آزمائش لاتا اور ہر رات ایک نیا کرب لے کر آتی تھی۔ شاہی محلات میں پلنے والا دو وقت کی روٹی کے لیے گاؤں کے چودھری کی خیرات پر گزارا کرنے پر مجبور تھا۔ جب تک کھانے کا سامان موجود تھا، کسی نہ کسی طرح

دن گزرتے رہے۔ رمضان کے آغاز کے ساتھ آٹا ختم ہو گیا اور ایک نیا امتحان شروع ہو گیا۔ فاقے کی مار سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب انسان کے پاس نہ کوئی ذریعہ معاش ہو اور نہ کسی سے مدد مانگنے کی ہمت۔ شاہی خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے سوال کرنا ان کے لیے کسی اذیت سے کم نہ تھا۔ ان کے پاس کوئی رقم بھی نہ تھی کہ کھانے کو کچھ خریدا جا سکتا۔ اس کیفیت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو پہلے آسودہ حال رہے ہوں اور پھر اچانک محتاجی کی دلدل میں جا پھنسے ہوں۔ مرزا شہ زور کے دل پر جو گزر رہی تھی وہ بیان سے باہر ہے کیوں کہ جب کھانے کو کچھ نہ ہو تو ہر لمحہ اذیت بن کر گزرتا ہے۔ بھوک کی شدت سے کلیجہ منہ کو آتا تھا، مگر صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ روزہ کھولنے کا وقت آیا تو دسترخوان خالی تھا۔ صرف پانی سے روزہ افطار کیا۔ بھوک کی شدت سے جسم کانپنے لگا مگر مجبوری ایسی کہ کوئی شکوہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس ساری صورتِ حال میں مرزا شہ زور نے دیکھا کہ ان کی والدہ خاموش اور پُرسکون تھیں۔ ان کی والدہ ہمیشہ مشکلات کے وقت غم کا اظہار کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ لیکن آج وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر رہی تھیں۔ یہ خاموشی دراصل ان کی مایوسی کو ظاہر کر رہی تھی۔ ان کا صبر آخری حد کو چھو رہا تھا لیکن وہ ضبط کر رہی تھیں۔

روئے بغیر چارہ، نہ رونے کی تاب ہے ۔۔۔ کیا چیز اُف یہ کیفیتِ اضطراب ہے (اختر انصاری)

ماں کی خاموشی دیکھ کر مرزا شہ زور کے دل کو کچھ سہارا ملا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی والدہ نے اس صدمے اور آزمائش کو کسی نہ کسی طرح قبول کر لیا تھا۔ سب سے زیادہ دل دہلا دینے والی کیفیت چھوٹی بہن کی تھی۔ بھوک کی شدت سے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایک معصوم بچی تھی جو اس بے رحم دنیا کے ستم سے ناواقف تھی۔ اس نے کبھی ایسی محرومی کا سامنا نہیں کیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ فاقہ کشی کی سختیوں سے دوچار تھی۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال تھی۔ مرزا شہ زور نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی مگر بھوک وہ چیز نہیں جو محض تسلیوں سے مٹ جائے۔ اس معصوم نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے۔ وہ نیند نہیں تھی بلکہ ناتوانی کا ایک غوط (غشی) تھا جو جسم کی کمزوری اور بھوک کی شدت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

بھوکے بچوں کی تسلی کے لیے ۔۔۔ ماں نے پھر پانی پکایا دیر تک (نواز دیوبندی)

رات کے اندھیروں میں بھوک اور بے بسی کا احساس مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ نیند کا تصور بھی محال تھا کیوں کہ جب پیٹ خالی ہو تو جسم کا سکون بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اسی بے بسی اور اذیت میں رات گزری اور سحری کا وقت آ گیا۔ مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ والدہ صاحبہ تہجد کے لیے اٹھیں اور اللہ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔

نہ چارہ گر کی ضرورت نہ کچھ دوا کی ہے ۔۔۔ دعا کو ہاتھ اٹھاؤ کہ غم کی رات کٹے (راحیدہ رکرشن)

تہجد کا وقت دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے اس لیے شہ زور کی والدہ نے بڑے خلوص سے اللہ کے سامنے دعا کی۔ اس وقت جو الفاظ ان کے لبوں سے نکلے، ان کو نقل کرنا محال ہے۔ ان کی دعا ایک ایسی فریاد تھی جو دل کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی۔ ان کی دعا میں ایسا درد تھا جو حساس دل کو تڑپا دے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی کہ آخر انھوں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ انھیں اس قدر سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا۔ وہ جو کبھی سیکڑوں محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے آج خود فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ وہ رمضان جس میں ان کے دسترخوان پر سیکڑوں غریبوں کے لیے افطار کا سامان ہوتا تھا۔ آج وہی مہینہ ان کے لیے بھوک اور بے بسی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب صبر کی حد ٹوٹ چکی تھی۔ ایک ماں کے دل کی تڑپ الفاظ میں ڈھل رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو ایک داستان بیان کر رہے تھے۔ بقول شاعر:

کوئی چارہ نہیں دعا کے سوا ۔۔۔ کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا (حفیظ جالندھری)

مرزا شہ زور کی روداد غم ایک انسان یا ایک خاندان کے زوال کی کہانی نہیں بلکہ ایک تہذیب کی زبوں حالی کا نقشہ ہے۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور لوگ بدلتے ہوئے حالات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

عبارت نمبر 15

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقے میں روزہ پر روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا: ''آج ہمارے ہاں نیاز تھی۔ یہ اس کا کھانا ہے اور یہ پانچ روپے زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں، مگر اب کے نقد دے دیا ہے۔''
یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئے گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بجا جاتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردشِ فلک نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قائم ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ مرزا سلیم کو موسیقی سننے کا بہت شوق تھا۔ لیکن ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا جس پر وہ رنجیدہ ہو گئے۔ اپنے ایک دوست کے کہنے پر مرزا شام کو جامع مسجد گئے۔ وہاں کی رونق انھیں بے حد پسند آئی۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب انگریزوں نے دہلی پر حملہ کیا تو جامع مسجد کو اصطبل بنا دیا۔ انھوں نے شاہی خاندان کے افراد کو چن چن کر قتل کیا۔ مرزا اپنے اہل و عیال سمیت دہلی سے ہجرت کر کے میوات کے گاؤں چلے گئے۔ جہاں انھیں کھیتوں کی حفاظت کے لیے رکھا گیا۔ گاؤں میں سیلاب آنے کے باعث سارا اناج بھیگ گیا اور استعمال کے قابل نہ رہا۔ جس کی وجہ سے فاقوں کی نوبت آ گئی اور انھیں فاقوں میں روزے رکھنے پڑے۔
تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ چھ ماہ گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا دہلی واپس آ گئے اور انگریز سرکار نے ان کی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔
تشریح طلب عبارت میں مرزا شہ زور بتا رہے ہیں کہ رمضان شروع ہوا تو ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا۔ چناں چہ فاقے میں ہی روزہ رکھنا پڑتا تھا۔ فاقہ کشی اور بے بسی کی اس داستان میں ایک اور دن گزر گیا مگر حالات میں کوئی بہتری نہ آئی۔ بھوک کی شدت نے جسم کو نڈھال کر دیا تھا مگر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ روزہ پر روزہ رکھنے سے ایسی حالت ہو گئی تھی جیسے جسم کی تمام طاقت ختم ہو گئی ہو۔ بھوک برداشت سے باہر تھی مگر مجبوری زبان نہیں کھولنے دیتی تھی۔ چہرے زرد اور جسم اس قدر ناتواں ہو چکے تھے کہ جنبش بھی محال تھی۔ دوسرا دن بھی یوں ہی فاقہ کشی میں گزر گیا۔ شام کا وقت آیا تو اچانک چودھری کا آدمی کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر آ گیا۔ دیکھا تو دودھ اور میٹھے چاول تھے۔ میٹھے چاول دیکھ ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں بعد کوئی نعمت نصیب ہوئی ہو۔ اس نے زکوٰۃ کے طور پر پانچ روپے بھی دیے۔ کہنے لگا ''ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں مگر اب نقد دے دی ہے۔'' نیاز کے دودھ اور چاول اور زکوٰۃ کے پانچ روپے پا کر یوں لگا جیسے قسمت مہربان ہو گئی ہو۔ فاقے میں اچانک کھانے کے لیے کچھ ملنے سے گویا بادشاہت مل گئی تھی۔

مرزا شہ زور خوشی خوشی اپنی والدہ کے پاس پہنچے اور انھیں خبر دی کہ ان کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ خدا نے ان کی سُن لی تھی اور انھیں کھانے کو کچھ مل گیا تھا۔ وہ بہت خوش ہو کر اپنی والدہ کو یہ قصہ سنا رہے تھے اور ساتھ ساتھ خدا کا شکر ادا کرتے جا رہے تھے۔ دل میں اطمینان تھا کہ کم از کم آج کا دن بھوک کی تکلیف کے بغیر گزرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ماں بھی یہ سُن کر خوش ہو گی اور خدا کا شکر ادا کرے گی۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ عورت ذات کی غیرت اور عزتِ نفس، وقت اور حالات سے متاثر نہیں ہوتی۔ مرزا شہ زور کی والدہ شاہی خاندان کی عزت دار خاتون تھیں۔ زکوٰۃ اور خیرات پر گزارا کرنا ان کی عزتِ نفس کے خلاف تھا۔ انھیں مرزا شہ زور کا نیاز اور زکوٰۃ قبول کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔
یہاں انسانی فطرت کا ایک بنیادی نکتہ بھی سمجھ آتا ہے۔ مرد حالات کا مقابلہ کرتا ہے لیکن بالآخر مشکلات کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتا ہے مگر عورت کی خودداری اور غیرت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ مرزا شہ زور کی والدہ کا معاملہ کچھ اور بھی سنجیدہ اور نازک تھا۔ وہ شاہی خاندان کی ایک دولت مند خاتون تھیں۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ ان کے دروازے ضرورت مندوں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ وہ سیکڑوں لوگوں کی مدد کرتی تھیں۔ انھوں نے کبھی صدقہ و خیرات قبول کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن آج حالات نے اس قدر مجبور اور بے بس کر دیا تھا کہ وہ دوسروں کے دیے ہوئے کھانے پر گزارا کریں، یہ بات ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

وائے قسمت کائنات دل ہماری لُٹ گئی — عیش کی دنیا ہماری آہ ہم سے چھٹ گئی
بادِ صَرصَر چل پڑی ایسی کہ ویراں کر دیا — دشت کا تو ذکر کیا گھر کو بیاباں کر دیا
(شہزادی کلثوم)

اس واقعے سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ بھوک اور فاقہ انسان کو مجبور کر دیتا ہے مگر خودداری اور عزتِ نفس کا احساس پھر بھی زندہ رہتا ہے۔ شاہی خاندان کی عورتیں جو کبھی دوسروں کو عطا کیا کرتی تھیں، قسمت کی خرابی سے وہ خود لینے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ یہ حقیقت تھی لیکن وہ اس حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھیں۔ چناں چہ مرزا شہ زور کی والدہ کے لیے یہ کھانا نعمت نہیں بلکہ ان کی بے بسی اور زوال کی علامت تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وقت کی گردش مرد کو تو جھکا سکتی ہے مگر عورت کی غیرت کو جھکانا مشکل ہوتا ہے۔ مرزا شہ زور تو خوشی خوشی یہ سب قبول کر چکے تھے لیکن ان کی والدہ کے لیے تکلیف دہ امر تھا۔ زکوٰۃ کے روپے اور نیاز کا کھانا ان کے لیے صرف کھانے پینے کا سامان نہیں تھا بلکہ ان کی تباہی اور محتاجی کا ایک کھلا ثبوت تھا۔ یہ کھانا اور زکوٰۃ ان کے زخموں پر مرہم نہیں بلکہ نمک کی طرح تھا جس سے انھیں شدید اذیت محسوس ہو رہی تھی۔

حال ابتر، قال ابتر جیب و داماں تار تار — آہ قسمت بن گئی ہے باعثِ صد انتشار
بن کے صیدِ دامِ حرص و آرزو رسوا ہو گئے — جو تماشا دیکھتے تھے خود تماشا ہو گئے
(شہزادی کلثوم)

اس واقعے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی دعائیں ضرور سنتا اور قبول کرتا ہے۔ مرزا شہ زور کی والدہ نے تہجد کے وقت فاقے کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے رحم کی فریاد کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سُن لی تھی اور ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر دیا تھا۔
یہ واقعہ عبرت کا درس دیتا ہے کہ عزت، طاقت اور عروج عارضی اور ناپائیدار چیزیں ہیں۔ وقت کا ایک جھٹکا انسان کو بے بسی اور بے چارگی کی گہری کھائی میں گرا دیتا ہے۔ زندگی کی یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔

عبارت نمبر 16

چناں چہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے انھوں نے تیور بدل کر کہا: تُف ہے تیری غیرت پر، خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مر جانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے، مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مر جانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے، صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔

سیاق وسباق

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ مرزا سلیم کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کر دیا۔ ایک دوست کے مشورہ پر وہ وقت گزاری کے لیے شام کو جامع مسجد جانے لگے۔ وہاں کی چہل پہل اور رونق سے مرزا بہت متاثر ہوئے۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بیان کرتے ہیں کہ جب دلی تاراج ہوئی تو جامع مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا۔ شہ زور دشمن سے بچنے کے لیے خاندان کو لے کر دلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آیا اور تمام سامان اس میں بہہ گیا اور مرزا شہ زور کی بیگم کو بخار ہو گیا۔ کچھ دن بعد وہ فوت ہو گئی۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ یہاں تک کہ رمضان میں افطاری کے لیے بھی کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن بھی فاقہ میں روزہ رکھنا پڑتا۔

تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ چھ مہینے گاؤں میں رہنے کے بعد مرزا شہ زور دلی چلے آئے جہاں انگریز سرکار نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشا پرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق "فاقہ میں روزہ" میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں انگریز فوج نے لال قلعے پر قبضہ کر لیا اور مغلیہ دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر جان بچا کر قلعے سے نکل گئے تو شاہی خاندان کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ انگریز فوج نے دہلی کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شاہی خاندان کے افراد اپنی جان بچانے کے لیے قلعے سے بھاگے اور در بدر بھٹکتے رہے۔ مرزا شہ زور بھی اپنی بوڑھی ماں، بیمار بیوی اور کم سن بہن کو لے کر دہلی سے نکل گئے۔ بہت سی مشکلات برداشت کر کے اور انگریز فوج کی نظروں سے بچتے بچاتے وہ مسلمان میواتیوں کے ایک گاؤں پہنچے۔ گاؤں والوں نے انھیں رہنے کے لیے ایک جھونپڑی دے دی اور مرزا شہ زور کو کھیتوں کی رکھوالی کا کام سونپ دیا۔ شدید بارش کی وجہ سے ان کا کھانے پینے کا سامان خراب ہو گیا۔ رمضان المبارک کی آمد پر ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا اس لیے فاقہ میں روزے رکھنے پڑے۔

مایوسیوں نے حسرت و ارماں مٹا دیے — کیسا یہ گھر بھرا ہوا ویران ہو گیا (شہزادی کلثوم)

ایک دن چودھری کا آدمی نیاز کے چاول اور زکوٰۃ کی رقم دے گیا۔ فاقہ کشی میں یہ کھانا اور زکوٰۃ کی رقم مرزا شہ زور کو بہت بڑی نعمت معلوم ہوئے۔ چناں چہ انھوں نے وہ کھانا اور زکوٰۃ کی رقم خوشی سے اپنی والدہ کو دکھائے۔ وہ خوش تھے اور انھیں امید تھی کہ والدہ کو یہ دیکھ کر تسلی ہو گی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ان چیزوں کو قبول کر لیں گی مگر ایسا نہ ہوا۔ جیسے ہی والدہ کی نظر ان پیسوں پر پڑی ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ بھوک اور ناتوانی کے باوجود ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ یہ چمک غیرت اور خودداری کی بجلی تھی۔ انھوں نے غصے اور دکھ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مرزا شہ زور کو جھڑک دیا۔ انھوں نے کہا:

"تف ہے تیری غیرت پر، خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے، ارے اس سے تو مر جانا بہتر تھا۔"

ان الفاظ میں جو تلخی اور کڑواہٹ ہے وہ دراصل ان کے دلی صدمے کی عکاسی کرتی ہے۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کے لہجے کی گھن گرج دراصل اس شاہی وقار کی چیخ تھی جو ان کے خون میں دوڑ رہا تھا۔ یہ ایک ایسی عورت کے ضمیر کی آواز تھی جو کبھی ایک عظیم سلطنت کے شاہی خاندان کی عزت تھی۔ ایک وقت تھا جب سیکڑوں محتاج اور ضرورت مند اس کے دروازے سے مرادیں پوری کرتے تھے۔ آج وقت کی گردش نے انھیں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ

دیا تھا۔ اس غیرت مند خاتون کے لیے یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ بھوک اور فاقے سے مر جانا بہتر تھا مگر کسی کے ٹکڑوں پر جینا گوارا نہیں۔ وہ بھوک اور تنگ دستی تو برداشت کر سکتی تھی لیکن اپنی عزتِ نفس کو پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سلطنت اور شان و شوکت چھن جانے کے باوجود وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھیں۔ خیرات اور زکوٰۃ لینا ان کے لیے اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ ہار چکے ہیں، مغلوب ہو چکے ہیں، محتاج ہو چکے ہیں۔ یہی سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔

مرزا شہ زور کی والدہ نے بیٹے کو جھڑکتے ہوئے کہا:

"اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری جرأت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مر جانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے، صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔"

یہ الفاظ اس بات کا اعلان تھے کہ چاہے سلطنت چھن گئی، اقتدار ختم ہو گیا، چاہے بے گھر اور بے سرو سامان ہو گئے لیکن خون میں عزت اور غیرت اب بھی باقی تھی۔ وقت نے سب کچھ چھین لیا مگر انا اور خودی اب بھی قائم تھی۔ اقتدار ختم ہو گیا لیکن ہم شکست قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بھوک سے مر جانا قبول تھا مگر اپنی غیرت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ مرزا شہ زور کی والدہ کی رگوں میں اب بھی تیموری خون کی حرارت اور جوش تھا۔ وہ میدان میں مارے جانے کو تیار تھیں لیکن جھکنے کو تیار نہ تھیں۔ وہ اپنے اجداد کی روایات اور جنگجویانہ تاریخ کو زندہ رکھنا چاہتی تھیں۔ کسی کے رحم و کرم پر جینا ان کے لیے قابلِ فخر نہ تھا۔ ان کے آباؤ اجداد نے طاقت، تلوار اور انصاف کے زور پر بادشاہت کی تھی۔ انھیں اپنی محنت، طاقت اور جرأت پر فخر تھا۔ وہ اپنے زورِ بازو سے رزق کمانے کو اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک بھوکا رہنا گوارا تھا لیکن شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ صدقہ خیرات قبول کرنا ناممکن تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو سمجھاتی ہیں کہ صدقہ خوری ان کے شایانِ شان نہیں۔ ان کی خودداری، عزتِ نفس اور غیرت اجازت نہیں دیتی کہ دوسروں کی دی ہوئی زکوٰۃ سے اپنی بھوک مٹائیں، دوسروں کے رحم و کرم پر جینا کوئی جینا نہیں۔ ایسی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں جسے برقرار رکھنے کے لیے اپنی عزتِ نفس کو قربان کرنا پڑے۔

مرزا شہ زور کی والدہ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں شدید صدمہ پہنچا ہے۔ خیرات اور زکوٰۃ قبول کرنا ان کے مرتبے کے خلاف تھا کیوں کہ وہ خود صدقہ و خیرات دینے والوں میں سے رہی تھیں۔ یہ ساری گفت گو اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ وقت کتنا ظالم ہوتا ہے۔ وہ خاندان جو کبھی ہندوستان کا شہنشاہ تھا اور دوسروں کو نوازتا تھا، وقت کی گردش نے انھیں دوسروں کے دیے ہوئے چند سکوں پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر ایک چیز جو وقت نہیں بدل سکا تھا وہ ان کی غیرت اور عزتِ نفس تھی۔ وہ بے بس ہو چکے تھے لیکن ان کی خودداری اور وقار سلامت تھا۔ ان کے لیے فاقے برداشت کرنا آسان تھا لیکن اپنی خودداری کو بیچنا ناممکن تھا۔

تم مانگے کا ریشم پہنو عیش کرو ہاں لیکن ہم — خودداری کی پھٹی پرانی ایک اکیلی شال میں خوش (عزیز نبیل)

مرزا شہ زور کی والدہ کی باتیں ہر اس شخص کے جذبات کی نمائندگی کرتی ہیں جو کبھی عزت و وقار اور اختیار کے مقام پر رہا ہو لیکن قسمت کے تھپیڑوں سے بے بسی اور ذلت کے گڑھے میں جا گرے۔ یہ صرف ایک خوددار عورت کا درد نہیں بلکہ پوری تہذیب کے زوال کی گواہی ہے۔ ان الفاظ میں وہ تلخی، کڑواہٹ، بے بسی اور بے چارگی چھپی ہے جو ایک مغلوب اور شکست خوردہ قوم کے ضمیر کی آواز ہے، ان الفاظ میں وہ تکلیف چھپی ہے جو ایک طاقت ور کے کمزور بن جانے سے جنم لیتی ہے۔ یہ الفاظ ایک خوددار لیکن مجبور شخص کی دلی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

عبارت نمبر 17

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینا آ گیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ چاہا کہ اُٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں مگر والدہ نے روکا اور کہا: "خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں۔ سب کچھ سہنا ہوگا۔" یہ کہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد

ہم سب نے مل کر کھالیا۔ پانچ روپے کا آٹا منگوایا گیا جس سے رمضان خیر وخوبی سے بسر ہوگیا۔ اس کے بعد چھے مہینے گاؤں میں رہے۔ پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا انتقال ہوگیا اور بہن کی شادی کردی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کردی جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ مرزا سلیم موسیقی کے بے حد شوقین تھے۔ لیکن ان کی والدہ نے انھیں رمضان میں موسیقی سننے سے منع کردیا۔ جس پر وہ بے حد رنجیدہ ہوگئے۔ اپنے ایک دوست کے کہنے پر شام کو افطار کے وقت مرزا جامع مسجد گئے اور وہاں کی رونق انھیں بے حد پسند آئی۔ مرزا سلیم کے بھانجے مرزا شہ زور بتاتے ہیں کہ غدر میں انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور جامع مسجد کو اصطبل بنادیا۔ شاہی خاندان کے وارثوں کو چن چن کر مارا اور ان کے اہل وعیال کو بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ مرزا شہ زور اس کسمپرسی کے عالم میں اپنے اہلِ خانہ کو لے کر دہلی سے نکل گئے اور میواتیوں کے گاؤں میں پناہ لی۔ ایک رات زبردست سیلاب آنے سے ان کا سارا اناج بھیگ گیا اور فاقوں کی نوبت آگئی۔ روزے بھی فاقوں میں رکھے۔ گاؤں کے چودھری نے نیاز اور زکوٰۃ بھجوائی جس پر مرزا کی والدہ بہت پشیمان ہوئیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے لہٰذا اس کا سباق نہیں۔

تشریح

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ منفرد انشاپرداز اور بے باک خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' میں انھوں نے دہلی کی تباہی اور شاہی خاندان کے مصائب کا بہت دردانگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

مغلیہ اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی دہلی کی تباہی کا آغاز ہوگیا۔ 1857ء میں انگریزوں نے لال قلعے پر قبضہ کرلیا تو بہادر شاہ ظفر جان بچا کر قلعے سے نکل گئے۔ انگریز فوج نے مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے شروع کردیے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شاہی خاندان کے افراد بھی انگریز فوج کے ظلم کا نشانہ بنے۔ وہ جان بچانے کے لیے قلعے سے فرار ہوگئے اور دربدر بھٹکتے رہے۔ ایک شاعر نے بھی اس دور کی عکاسی کچھ یوں کی ہے:

چھن گیا امن وسکون سب دربدر ہونے لگے　　حادثے اپنے وطن میں کس قدر ہونے لگے

مرزا شہ زور بھی بوڑھی والدہ، بیمار بیوی اور کم سن بہن کو لے کر قلعے سے نکل گئے۔ راستے میں تکلیفیں سہتے اور انگریزوں کی نظروں سے بچتے بچاتے وہ مسلمان میواتیوں کے ایک گاؤں پہنچے۔ گاؤں والوں نے انھیں رہنے کو ایک جھونپڑی دے دی۔ مرزا شہ زور اُن کے کھیتوں کی رکھوالی کرنے لگے اور خواتین گاؤں کی عورتوں کے کپڑے سی کر گزارہ کرنے لگیں۔ بارش کی وجہ سے گاؤں میں سیلاب آگیا اور ان کا سب سامان اور اناج خراب ہوگیا۔ مرزا شہ زور کی بیوی بیمار ہوگئی اور تڑپ تڑپ کر جاں دے دی۔ رمضان المبارک شروع ہوا تو ان کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہ تھا، اس لیے فاقہ میں روزے رکھنے پڑے۔ ایک دن گاؤں کے چودھری کا ایک آدمی نیاز کے چاول اور زکوٰۃ کی رقم لے کر آیا۔ مرزا شہ زور کو فاقہ کشی میں یہ چیزیں ایک بہت بڑی نعمت معلوم ہوئیں۔ اسے خوشی ہوئی کہ پیٹ بھرنے کو کچھ مل گیا۔ اس نے خوشی خوشی سارا قصہ اپنی والدہ کو سنایا۔ ان کی والدہ نے باتیں سنیں تو غصے میں آگئیں۔ انھیں زکوٰۃ اور خیرات لینا گوارا نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے مرزا شہ زور کو ڈانٹا اور انھیں غیرت دلائی۔

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ والدہ کی تلخ باتوں نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ پہلے ہی اپنی بے بسی اور مجبوری کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ والدہ کی غیرت بھری باتوں نے انھیں شرمندہ کردیا۔ ان میں بے بسی کا احساس اور شدید ہوگیا۔ ان کے ماتھے

پر پسینا آگیا اور شرم سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ وہ جانتے تھے کہ والدہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ان کے آباواجداد ہندوستان کے حکمران رہے تھے۔ وہ دوسروں کو نوازنے والے تھے لیکن وقت کی گردش نے انھیں دوسروں کا محتاج کردیا تھا۔ وہ دوسروں کے صدقہ وزکوٰۃ پر زندہ رہنے پر مجبور تھے۔ وہ دوسروں کے دست نگر تھے اور یہ حقیقت تھی۔ یہی حقیقت انھیں اندر سے جھنجھوڑ رہی تھی۔

مری عروج کی لکھی تھی داستاں جس نے　　مرے زوال کا قصہ بھی اُس کی کتاب میں تھا　　(وکاس شرما راز)

مرزا شہ زور کے دل میں شدید اضطراب پیدا ہوا۔ والدہ کی باتوں نے ان کے دل پر اثر کیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ چیزیں واپس کردیں۔ وہ یہ چیزیں واپس کرنے کے لیے اٹھنے لگے تو والدہ نے روک لیا۔ شاید ان کی والدہ کو بھی احساس ہوچکا تھا کہ محض جذبات اور غیرت سے پیٹ نہیں بھرے گا۔ بھوک مٹانے کے لیے کچھ کھانا پڑے گا۔ جس کا مطلب تھا کہ حالات کی سختی اور وقت کی ضرورت کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ انھوں نے بے بسی سے ایک آہ بھری اور کہا کہ:

''خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں۔ سب کچھ سہنا ہوگا۔''

یہ الفاظ ان کی بے بسی، صبر اور برداشت کے مظہر تھے۔ وہ سمجھ چکی تھیں کہ ماضی کی یادیں، غیرت اور وقار اپنی جگہ، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے محتاج تھے۔ ان کے پاس اس محتاجی کو جھیلنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ خیرات اور زکوٰۃ کے طور پر جو کھانا ملا تھا اسے روتو کیا جاسکتا تھا مگر اس کے بغیر زندہ رہنا بھی ناممکن تھا۔ چناں چہ مجبوراً انھوں نے وہ کھانا قبول کرلیا۔ سب نے مل کر روزہ افطار کیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ جو کھانا غیرت کے سبب زہر لگ رہا تھا، اسی کو کھا کر جسم میں کچھ طاقت آئی۔ چودھری کے آدمی نے زکوٰۃ کے طور پر جو پانچ روپے دیے تھے، ان کا آٹا منگوایا گیا۔ پانچ روپے سے اتنی مقدار میں آٹا مل گیا کہ رمضان کے باقی دن خیریت سے گزر گئے۔

مرزا شہ زور کہتے ہیں کہ چھے مہینے تک وہ اسی گاؤں میں رہے۔ وہ چھے مہینے شاید ان کی زندگی کے سب سے مشکل دن تھے۔ کیوں کہ ایسا صرف بھوک اور تنگ دستی کا نہیں بلکہ ایک سلطنت کی بربادی کا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب وہ دن رات اپنے ماضی کی عظمت کو یاد کرتے رہتے تھے۔ وہ ہر لمحہ اپنے حال کی بے بسی پر کڑھتے اور ایک غیر یقینی مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ اپنے حال کی حقیقت کو قبول کرنے لگے۔ ان کے احساسِ محرومی کے زخم بھی بھرنے لگے اور انھوں نے حالات کے ساتھ جینے کا سلیقہ سیکھ لیا۔

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں　　(غالب)

چھے مہینے اس گاؤں میں گزار کر وہ واپس دہلی چلے آئے۔ دہلی اُن کا آبائی شہر تھا۔ دہلی ان کے آبا کا پایۂ تخت تھا۔ وہی دہلی جسے انگریز فوج نے تباہ وبرباد کردیا تھا، جس کی رونق اور شان وشوکت کو خاک میں ملا دیا تھا، وہ دہلی پھر آباد ہونا شروع ہوچکی تھی۔ دہلی اگرچہ ان کا اپنا شہر تھا لیکن وہاں حکومت اپنی نہیں تھی۔ دہلی آکر آباد ہوئے تو کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کا انتقال مرزا شہ زور کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ والدہ ہی وہ واسطہ تھیں جو مرزا شہ زور کو ماضی کی عظمت کے ساتھ جوڑے ہوئے تھیں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ، کل ہماری باری ہے　　(مرزا شوق لکھنوی)

والدہ کے انتقال کے بعد بہن کی شادی کردی گئی اور وہ اپنے گھر کی ہوگئی۔

زندگی کے آخری موڑ پر مرزا شہ زور کو انگریز سرکار کی طرف سے پانچ روپے ماہانہ پنشن ملنے لگی۔ شاہی خاندان کے افراد کو انگریزوں کی طرف سے ملنے والی پنشن دراصل ایک خاموش معاہدہ تھا جس کا مقصد شاہی خاندان کے افراد کو سیاست سے دور رکھنا تھا۔ یہ پنشن کسی عزت واحترام کی علامت نہیں تھی بلکہ انگریزوں کی حکمتِ عملی کا حصہ تھی۔ وہ شاہی خاندان کو پنشن سے نوازتے تھے تاکہ وہ ہندوستان پر بغیر کسی مزاحمت کے حکومت کرسکیں۔

مرزا شہ زور کی داستان سے یہی سبق ملتا ہے کہ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ زوال ہمیشہ طاقت، عظمت اور عروج کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔ جو کسی بھی لمحے آ کر سب کچھ ختم کر سکتا ہے۔

مشقی سوالات

سوال نمبر:۱۔ مختصر جواب دیں۔

۱۔ ''جب دہلی زندہ تھی'' سے کیا مراد ہے؟

جواب۔ ''جب دہلی زندہ تھی'' سے مراد وہ زمانہ ہے جب دلی پر مسلمانوں کا راج تھا اور اس کی روایات زندہ تھیں۔

۲۔ ''خیر باشد! مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔'' اس جملے کی وضاحت کریں۔

جواب۔ ''خیر باشد! مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔'' اس جملے کا مطلب کہ خدا خیر کرے، جناب کے مزاج میں بے قراری واضح دکھائی دے رہی ہے۔

۳۔ مرزا سلیم بہادر کون تھے؟

جواب۔ مرزا سلیم بہادر آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ ظفر کے بھائی تھے۔

۴۔ جامع مسجد میں مرزا صاحب نے کیا منظر دیکھا؟

جواب۔ جامع مسجد میں مرزا صاحب نے بہت ایمان افروز منظر دیکھا۔ کوئی تلاوت کر رہا تھا۔ کوئی فقہی مسائل پر بحث کر رہا تھا۔ افطار کے وقت وہاں رنگ رنگ خوان آنے لگے اور رونق لگ گئی۔

۵۔ مرزا صاحب روزانہ مسجد کیوں آنے لگے؟

جواب۔ مرزا صاحب روزانہ مسجد آنے لگے کیوں کہ وہاں کے دینی چرچے اور شان و شوکت نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔

سوال نمبر:۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' خواجہ حسن نظامی کی کس تصنیف سے ماخوذ ہے؟

الف۔ غدر دہلی کے افسانے ب۔ سی پارۂ دل ج۔ بیگمات کے آنسو د۔ مضامین حسن نظامی

۲۔ سبق ''فاقہ میں روزہ'' اصناف ادب کے لحاظ سے ہے۔

الف۔ ناول ب۔ ڈراما ج۔ داستان د۔ افسانہ

۳۔ مرزا شہ زور رشتے میں ابوظفر بہادر شاہ کے تھے۔

الف۔ بھتیجے ب۔ بھانجے ج۔ بھائی د۔ رضاعی بھائی

۴۔ متن کے مطابق جامع مسجد دہلی بنوائی تھی۔

الف۔ شاہ جہان نے ب۔ اورنگ زیب عالمگیر نے

ج۔ ابوظفر بہادر شاہ نے د۔ نصیر الدین ہمایوں نے

۵۔ قلعہ چھوڑتے وقت مرزا شہ زور کے ساتھ تھی۔

الف۔ والدہ، بہن اور بیوی ب۔ بیٹی، بہن اور بیوی

ج۔ والدہ، بیٹی اور بیوی د۔ والدہ، بہن اور بیٹی

جوابات

۱	بیگمات کے آنسو	۲	افسانہ	۳	بھانجے	۴	شاہ جہان نے	۵	والدہ، بہن اور بیوی

سوال نمبر:۳۔ متن کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ ہم لوگ دو..... میں سوار تھے۔

۲۔ حضور ظل سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا،..... چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

۳۔ تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو..... کے ٹھوکریں مارتے تھے۔

۴۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے پر..... ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔

۵۔ اس غبوط اور ناتوانی کی حالت میں..... کا وقت آ گیا۔

۶۔ اس کے بعد چھے مہینے گاؤں میں رہے، پھر..... چلے آئے۔

جوابات

۱	رتھوں	۲	قلعہ	۳	تاجوروں	۴	نڈھال	۵	سحری
۶	دہلی								

سوال نمبر:۴۔ طلبہ سبق ''فاقہ میں روزہ'' کے متن کو غور سے پڑھیں اور اسے مختصر مگر جامع انداز میں ایک دوسرے کو سنائیں۔

جواب۔ عملی کام (راہ نمائی کے لیے سبق کا خلاصہ پڑھیں)

سوال نمبر:۵۔ طلبہ جماعت دہم تک مغلیہ حکمرانوں کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے احوال بھی ازبر ہیں۔ اپنی سابق واقفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے زوال کے اسباب اور نتائج ایک دوسرے کو بتائیں۔

جواب۔ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا زوال کسی ایک وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ مغلیہ سلطنت اپنی جنگی اقدار کو چھوڑ کر عیش و عشرت میں پڑ گئی تھی۔ شاہی خاندان میں حکومت کی خاطر خانہ جنگی ہونے لگی تھی۔ مغلیہ شاہی محلات میں ہندو عورتوں کا راج تھا۔ بادشاہت کی کمزوری کی وجہ سے ریاستوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ مرکز کمزور ہوا تو انگریزوں کو پاؤں جمانے میں آسانی ہو گئی۔ جب انگریز مضبوط ہو گئے تو انھوں نے مسلمانوں کی حکومت ختم کر کے بہادر شاہ ظفر کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ حکومت کے خاتمے سے مسلمانوں میں مایوسی پھیل گئی۔

سوال نمبر:۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

بدعنوانی انگریزی زبان کے لفظ کرپشن کا اردو ترجمہ ہے۔ ہر وہ برائی جو معاشرے میں کسی بھی قسم کے فساد کا باعث بنے ''کرپشن'' کہلاتی ہے۔ سود خوری، رشوت ستانی، سفارش، وعدہ خلافی، جھوٹ، ملاوٹ، تعصب، اقربا پروری، بد دیانتی، ہر طرح کی چوری اور دیگر تمام سماجی برائیاں کرپشن ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ اگر ہم ایک خوش حال، منظم اور پر امن معاشرہ چاہتے ہیں تو ان تمام برائیوں سے نجات ناگریز ہے۔ دین اسلام نہ صرف تمام قسم کی کرپشن کو ختم کرنے کی تاکید کرتا ہے بلکہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی سیرت اقدس ایسے تمام پہلوؤں سے بھی ہوئی ہے جس کی پیروی کر کے تمام معاشرتی برائیوں سے بچا جا سکتا ہے اور معاشرے کو خوش حال اور مثالی بنایا جا سکتا ہے۔ انسداد بدعنوانی کے لیے لازم ہے کہ تعلیم کو عام کر کے معاشرتی شعور کو بیدار کیا جائے۔ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے امتیاز کو لوگوں کے اذہان و قلوب میں بسایا جائے۔ اس کے لیے میڈیا کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم سچے اور پکے مسلمان بن جائیں اور حب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو یقیناً ہمارا معاشرہ اور ہمارا ملک تمام برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے۔

سوالات:

۱۔ بدعنوانی کے لیے انگریزی میں کون سا لفظ مستعمل ہے؟

جواب۔ بدعنوانی کے لیے انگریزی میں کرپشن کا لفظ مستعمل ہے۔

۲۔ عبارت کے مطابق کون کون سی سماجی برائیاں بدعنوانی میں شامل ہیں؟

جواب۔ عبارت کے مطابق سود خوری، رشوت، سفارش، جھوٹ، ملاوٹ، تعصب، چوری اور دیگر سماجی برائیاں بدعنوانی میں شامل ہیں۔

۳۔ اسلامی تناظر میں معاشرے کو خوش حال اور مثالی کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟

جواب۔ اسلامی تناظر میں معاشرے کو خوش حال اور مثالی بنانے کے لیے حضور خاتم النبیین ﷺ کی پیروی کر کے کرپشن کو ختم کیا جائے۔

۴۔ بدعنوانی کی روک تھام کے لیے معاشرتی شعور کیسے بیدار ہو گا؟

جواب۔ بدعنوانی کی روک تھام کے لیے معاشرتی شعور علم کے ذریعے بیدار ہو گا۔ اس کے لیے میڈیا بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

۵۔ اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

جواب۔ انسداد بدعنوانی

جملے کے اجزا:

مبتدا اور خبر: اردو جملے کے دو اجزا ہوتے ہیں

پہلے جز میں کسی شخص یا شے کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسرے جزو میں اس شخص یا شے کے بارے میں کچھ بتایا جاتا ہے۔ قواعد کی رو سے جملے کے اس پہلے جز کو مبتدا اور دوسرے جز کو خبر کہتے ہیں۔ درج ذیل مثالوں میں جملے کے اجزا کی وضاحت پیش کی جا رہی ہے۔

الف۔ بھیڑ اور بھیڑیا، ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ مبتدا: بھیڑ اور بھیڑیا خبر: ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں

ب۔ میں اور تم مل کر جائیں گے۔ مبتدا: میں اور تم خبر: مل کر جائیں گے

ج۔ اچھا آدمی، اچھی بات کہے گا۔ مبتدا: اچھا آدمی خبر: اچھی بات کہے گا۔

سوال نمبر:۷۔ اس سبق میں سے کوئی سے پانچ جملے منتخب کریں اور مبتدا اور خبر کے حوالے سے ان کے اجزا بیان کریں۔

جواب۔

۱۔ مرزا سلیم مروانہ مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مبتدا: مرزا سلیم خبر: مروانہ مکان میں بیٹھے تھے۔

۲۔ لونڈی نے ادب سے عرض کیا۔ مبتدا: لونڈی خبر: ادب سے عرض کیا۔

۳۔ اماں ناراض ہو جاتی ہیں۔ مبتدا: اماں خبر: ناراض ہو جاتی ہیں۔

۴۔ مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ مبتدا: مصاحب خبر: ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

۵۔ مرزا روزانہ مسجد آنے لگے۔ مبتدا: مرزا خبر: روزانہ مسجد آنے لگے۔

سوال نمبر:۸۔ درج ذیل تراکیب کی وضاحت جملوں میں استعمال کے ذریعے کریں۔

خواہ مخواہ، خوان پوش، لہو ولہب، بے تکلف، بے یار و مددگار، لق ودق، بہ ہزار دقت و دشواری، نازونعمت

جواب۔

الفاظ	جملے
خواہ مخواہ	خواہ مخواہ بحث نہ کریں اصل مدعا تا میں۔
خوان پوش	شاہی محل سے کئی خوان پوش مسجد جاتے تھے۔
لہو ولہب	انگریزوں نے دلی میں بہت لہو ولہب کیا۔
بے تکلف	آفاق میرا بے تکلف دوست ہے۔
بے یار و مددگار	دلی کے شہزادے گلیوں میں بے یار و مددگار پھرتے تھے۔
لق ودق	بہاول پور کے لق ودق صحرا میں جیپ ریلی ہوتی ہے۔
بہ ہزار دقت و دشواری	قافلہ بہ ہزار دقت و دشواری اپنی منزل پر پہنچ گیا۔
نازونعمت	نازونعمت میں پلے ہوئے شہزادوں پر غدر کی مصیبت بہت بھاری تھی۔

سوال نمبر:۹۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

ہاتھ جوڑنا، دل میں گھر کرنا، نوٹ پڑنا، ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، حالت غیر ہونا، دل میں بدی آنا، سناٹے میں آجانا

جواب۔

محاورات	جملے
خدا خدا کر کے	خدا خدا کر کے ہماری گاڑی منزل تک پہنچ گئی۔
دل میں گھر کرنا	عالم کی بات لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔
ڈٹ جانا	ہماری فوج دشمن کے سامنے ڈٹ گئی۔
دل پاش پاش ہونا	انگریزوں کے ظلم وستم سے برصغیر کے لوگوں کے دل پاش پاش ہو گئے۔
حالت غیر ہونا	شدید چوٹ کی وجہ سے روزینہ کی حالت غیر ہو گئی۔
دل میں بدی آنا	خزانہ دیکھ کر چور کے دل میں بدی آ گئی۔
سناٹے میں آجانا	استاد کی ڈانٹ سن کر سب بچے سناٹے میں آ گئے۔

سوال نمبر:۱۰۔ سبق "فاقہ میں روزہ" کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب۔ یکھیے سبق کا خلاصہ۔

سوال ۱۱۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں اور حوالہ متن بھی درج کریں۔

"والدہ کی ان باتوں سے۔۔۔۔۔۔ آج کل زندگی کا انحصار ہے۔"

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

درست جواب کا انتخاب کریں۔

(1) شاملِ نصاب سبق "فاقہ میں روزہ" کے مصنف کا نام ہے:
(الف) صلاح الدین (ب) خواجہ حسن نظامی (ج) محمد حسین آزاد (د) مہدی افادی (ب)

(2) خواجہ حسن نظامی پیدا ہوئے:
(الف) 1868ء میں (ب) 1870ء میں (ج) 1871ء میں (د) 1873ء میں (د)

(3) خواجہ حسن نظامی فوت ہوئے:
(الف) 1954ء (ب) 1955ء (ج) 1956ء (د) 1957ء (ب)

(4) خواجہ حسن نظامی کا پورا نام تھا:
(الف) سید اکبر حسن (ب) سید غلام حسن (ج) سید علی حسن (د) سید فدا حسن (ج)

(5) خواجہ حسن نظامی کو یہ نام دیا تھا:
(الف) علامہ اقبال نے (ب) بہادر شاہ ظفر نے (ج) مولانا حالی نے (د) مرزا غالب نے (الف)

(6) خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ کا دہلی سے فاصلہ ہے:
(الف) ایک میل (ب) دو میل (ج) تین میل (د) چار میل (ج)

(7) خواجہ حسن نظامی پیدا ہوئے:
(الف) بستی درگا دلال شاہ میں (ب) بستی درگاہ چن شاہ میں
(ج) بستی درگاہ شاہ ملوک میں (د) بستی درگاہ خواجہ نظام الدین اولیا میں (د)

(8) والدین کی وفات کے وقت خواجہ حسن نظامی کی عمر تھی:
(الف) نو برس (ب) دس برس (ج) گیارہ برس (د) تیرہ برس (ج)

(9) والدین کی وفات کے بعد خواجہ حسن نظامی کی پرورش کی، ان کے :
(الف) چچا نے (ب) خالو نے (ج) بھائی نے (د) تایا نے (ج)

(10) خواجہ حسن نظامی نے آنکھ کھولی:
(الف) تصوف کے ماحول میں (ب) غربت کے ماحول میں (ج) شاعری کے ماحول میں (د) ادب کے ماحول میں (الف)

(11) منشی غلام نظام الدین (تاجر کتب دہلی) کے فیضِ صحبت سے خواجہ حسن نظامی میں پیدا ہوا:
(الف) ادب وصحافت کا ذوق (ب) تصوف کا ذوق (ج) تجارت کا شوق (د) تجر وانکسار (الف)

(12) خواجہ حسن نظامی کے پہلے مضمون کا عنوان تھا:
(الف) انڈیا کی نازک حالت (ب) ہندوستان کی بربادی
(ج) بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی (د) مسلمانوں کی خستہ حالی (الف)

(13) خواجہ حسن نظامی کے مضامین جن رسالوں میں چھپتے تھے، ان کے نام ہیں:
(الف) ادبی دنیا، فنون (ب) نمک دان، سب رنگ (ج) پیسہ، وکیل، خزن (د) نقوش، زمانہ (ج)

(14) خواجہ حسن نظامی نے مصر، شام، فلسطین اور عرب کا سفر کیا:
(الف) 1911ء میں (ب) 1912ء میں (ج) 1913ء میں (د) 1914ء میں (الف)

(15) خواجہ حسن نظامی نے ماہنامہ رسالہ جاری کیا:
(الف) زمانہ (ب) نقوش (ج) نظام المشائخ (د) نظام الہند (ج)

(16) خواجہ حسن نظامی نے رسالہ "نظام المشائخ" جاری کیا:
(الف) 1918ء میں (ب) 1919ء میں (ج) 1920ء میں (د) 1921ء میں (ب)

(17) خواجہ حسن نظامی کا گھرانہ تھا:
(الف) خوش حال (ب) غریب (ج) صوفی (د) قدامت پسند (ج)

(18) خواجہ حسن نظامی کا اسلوب بیان ہے:
(الف) سادہ اور عام فہم (ب) مشکل اور ثقیل (ج) مسجع و مرصع (د) شاعرانہ (الف)

(19) خواجہ حسن نظامی نے انشاپردازی میں تقلید کی:
(الف) وزیر آغا کی (ب) مولانا حالی کی (ج) میر حسن کی (د) کسی کی نہیں (د)

(20) خواجہ حسن نظامی انشاپردازی میں ثقیل الفاظ استعمال کرنے کے خلاف تھے:
(الف) عربی اور فارسی کے (ب) عربی اور ہندی کے (ج) فارسی اور ہندی کے (د) عربی اور سنسکرت کے (د)

(21) بیگمات کے آنسو، سیہ پارۂ دل، دہلی کی آخری شمع: کے مصنف ہیں:
(الف) مولانا حالی (ب) محمد حسین آزاد (ج) خواجہ حسن نظامی (د) سرسید احمد خان (ج)

(22) دہلی کی سزا، مجرم نامہ، انگریزوں کی پنتا اور طمانچہ بر رخسار یزید: تصانیف ہیں:
(الف) سرسید احمد خان کی (ب) وزیر آغا کی (ج) غلام عباس کی (د) خواجہ حسن نظامی کی (د)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

درست جواب کا انتخاب کریں۔

(1) سبق "فاقہ میں روزہ" خواجہ حسن نظامی کی جس کتاب سے لیا گیا ہے، اُس کا نام ہے:
(الف) دہلی کی پنتا (ب) دہلی کی آخری شمع (ج) انگریزوں کی پنتا (د) بیگمات کے آنسو (د)

(2) شاملِ نصاب سبق "فاقہ میں روزہ" کی صنف ہے:
(الف) رپورتاژ (ب) داستان (ج) افسانہ (د) ناول (ج)

(3) جب دہلی زندہ تھی تو لال قلعہ پر آخری نشان لہرا رہا تھا:
(الف) تاتاریوں کا (ب) ساسانیوں کا (ج) غزنیوں کا (د) تیموریوں کا (د)

(4) مرزا سلیم تھا، بہادر شاہ ظفر کا:
(الف) بیٹا (ب) بھائی (ج) بھانجا (د) بھتیجا (ب)

(5) افطاری سے کچھ پہلے، گویے سے گانا سن رہا تھا:
(الف) مرزا شہ زور (ب) مرزا نوشہ (ج) مرزا سلیم (د) مرزا کلیم (ج)

(6) مرزا سلیم جس گویے سے گانا سن رہے تھے، اُس کا نام تھا:
(الف) تھمن خان (ب) تان سین (ج) اچھن خان (د) کالے میاں (الف)

(7) حضور بیگم، افطاری سے قبل پڑھا کرتی تھیں:
(الف) کتاب (ب) تسبیح (ج) نماز (د) قرآن (د)

(8) مرزا سلیم کو رمضان میں گانا سننے سے منع کر دیا:
(الف) ابا حضور نے (ب) اماں حضور نے (ج) بیوی نے (د) دوستوں نے (ب)

(9) مرزا سلیم کو پریشان دیکھ کر ایک مصاحب نے انھیں افطاری کے وقت جانے کا مشورہ دیا:
(الف) باغ میں (ب) جامع مسجد میں (ج) شہر کنارے (د) گاؤں میں (ب)

(10) جامع مسجد کی رونق اور دینی چرچے نے مرزا کے دل پر ڈالا:
(الف) معمولی اثر (ب) بڑا اثر (ج) نرالا اثر (د) خراب اثر (ب)

(11) مرزا شہ زور، مرزا سلیم کا تھا:
(الف) بھائی (ب) بیٹا (ج) بھتیجا (د) بھانجا (د)

(12) مرزا شہ زور اکثر صحبت میں رہا کرتے تھے:
(الف) اپنے والد کی (ب) اپنی والدہ کی (ج) چچا کی (د) ماموں کی (د)

(13) دہلی زیر و زبر ہو گئی، قلعہ برباد ہو گیا تو بیگمات کرنے لگیں:
(الف) ماما گیری (ب) خبر گیری (ج) جہاں گیری (د) گداگری (الف)

(14) دہلی کی بربادی کے بعد ایک بار مرزا شہ زور جامع مسجد گئے تو سپاہی تھے:
(الف) لڑ رہے (ب) کھانا کھا رہے (ج) صفائی کر رہے (د) روٹیاں پکا رہے (د)

(15) جامع مسجد تعمیر کرائی تھی:
(الف) بہادر شاہ ظفر نے (ب) ہمایوں نے (ج) شاہ جہاں نے (د) جہاں گیر نے (ج)

(16) دہلی کی بربادی کے بعد مرزا شہ زور جب جامع مسجد گئے تو مسجد نظر آئی:
(الف) جانوروں کا باڑہ (ب) گھوڑوں کا اصطبل (ج) ویران جنگل (د) قبرستان (ب)

(17) مصنف کے اصرار پر اپنی دردناک کہانی سنائی:
(الف) مرزا سلیم نے (ب) مرزا شہ زور نے (ج) بہادر شاہ ظفر نے (د) مرزا نوشہ نے (ب)

(18) جب انگریز فوج نے حملہ کیا تو قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے:
(الف) ظل سبحانی بہادر شاہ ظفر (ب) شاہ جہاں (ج) شاہ عالم (د) جہاں گیر (الف)

(19) شہ زور اور اس کے اہلِ خانہ غازی آباد کی جانب جاتے ہوئے سوار تھے:
(الف) بیل گاڑی پر (ب) اونٹ پر (ج) رتھوں پر (د) گھوڑے پر (ج)

(20) مرزا شہ زور اور اس کا خاندان انگریزی لشکر کے خوف سے واپس لوٹ گیا:
(الف) قطب صاحب سے (ب) غازی آباد سے (ج) شاہدرہ سے (د) گورداس پور سے (ج)

(21) شاہدرہ سے واپس ہو کر مرزا شہ زور اور ان کا خاندان چلے گئے:
(الف) قطب صاحب (ب) گورداس پور (ج) نواب شاہ (د) راج گڑھ (الف)

(22) چھتر پور کے قریب شہ زور اور اس کے خاندان پر حملہ کر کے سامان لوٹ لیا:
(الف) ہندوؤں نے (ب) گوجروں نے (ج) مرہٹوں نے (د) سکھوں نے (ب)

(23) مرزا شہ زور کی ماں نے کہا کہ ہم نسل سے ہیں:
(الف) چنگیز خان کی (ب) محمود غزنوی کی (ج) محمد غوری کی (د) اکبر کی (الف)

(24) ہم چنگیز خان کی نسل سے ہیں، جس کی تلوار سے کانپتی تھی:
(الف) فوج (ب) رعایا (ج) زمین (د) دہلی (ج)

(25) مرزا شہ زور کی والدہ نے کہا کہ ہم اولاد ہیں:
(الف) تیمور کی (ب) سکندر کی (ج) غزنوی کی (د) غوری کی (الف)

(26) مرزا شہ زور کی والدہ نے کہا کہ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہر یاروں کا تھا:
(الف) دوست (ب) دشمن (ج) شاہ (د) وزیر (ج)

(27) ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی تھی:
(الف) بہادر شاہ ظفر نے (ب) جہاں گیر نے (ج) شاہ جہاں نے (د) شاہ عالم نے (ج)

(28) مرزا شہ زور اور اس کے خاندان کو پناہ دی:
(الف) سکھوں نے (ب) مرہٹوں نے (ج) میواتیوں نے (د) راجپوتوں نے (ج)

(29) میواتیوں نے مرزا شہ زور اور اس کے اہل خانہ کو ٹھہرایا:
(الف) مسجد میں (ب) چھپر میں (ج) اصطبل میں (د) چوپاڑ میں (د)

(30) مرزا شہ زور ہنر جانتا تھا:
(الف) تیغ زنی کا (ب) کھیتی باڑی کا (ج) بڑھئی کا (د) لوہار کا (الف)

(31) میواتیوں نے مرزا شہ زور کے ذمے کام لگایا:
(الف) فصل کی کٹائی (ب) جانوروں کی رکھوالی (ج) کھیت کی رکھوالی (د) گاؤں کی چوکیداری (ج)

(32) میواتیوں نے مرزا شہ زور کی خواتین کو کام دیا:
(الف) کپڑے سینے کا (ب) روٹیاں پکانے کا (ج) گھر کی صفائی کا (د) کھیتی باڑی کا (الف)

(33) میواتیوں نے کام کے عوض مرزا شہ زور کو دینے کا وعدہ کیا:
(الف) فی یوم دو روپے (ب) سال بھر کا اناج (ج) مہینے بھر کا دودھ (د) روزانہ کی سبزی (ب)

(33) میواتیوں کے گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا:
(الف) ساون میں (ب) بھادوں میں (ج) جیٹھ میں (د) بیساکھ میں (ب)

(34) بارش کی وجہ سے ایک رات میواتیوں کے گاؤں میں آیا:
(الف) طوفان (ب) شیر (ج) زلزلہ (د) بادشاہ (الف)

(35) مرزا شہ زور کی بیوی فوت ہوگئی:
(الف) بخار سے (ب) ٹی بی سے (ج) کینسر سے (د) زکام سے (الف)

(36) گاؤں کے چودھری نے آٹا منگوادیا:
(الف) ایک روپے کا (ب) دو روپے کا (ج) تین روپے کا (د) چار روپے کا (الف)

(37) گاؤں کے چودھری نے ایک روپے کا آٹا منگوا کر دیا:
(الف) غازی آباد سے (ب) قطب صاحب سے (ج) شاہدرہ سے (د) چھتر پور سے (ب)

(38) رمضان میں تہجد کی نماز کے بعد مرزا شہ زور کی والدہ نے کی:
(الف) تسبیح (ب) تلاوت (ج) دردناک دعا (د) خیرات (ج)

(39) دوسرے دن شام کے قریب گاؤں کے چودھری کا آدمی لایا:
(الف) دال چاول (ب) گوشت اور روٹی (ج) پھل اور دودھ (د) دودھ اور میٹھے چاول (د)

(40) گاؤں کے چودھری نے زکوٰۃ بھجوائی:
(الف) تین روپے (ب) پانچ روپے (ج) سات روپے (د) دس روپے (ب)

(41) میواتیوں کے گاؤں کا چودھری ہر سال زکوٰۃ دیتا تھا:
(الف) اونٹوں کی (ب) بیلوں کی (ج) بکریوں کی (د) زیورات کی (ج)

(42) زکوٰۃ کے پیسے دیکھ کر مرزا شہ زور کی والدہ کا رنگ:
(الف) پھیکا پڑ گیا (ب) متغیر ہوگیا (ج) زرد ہوگیا (د) اُڑ گیا (ب)

(43) مرزا شہ زور اور اس کا خاندان گاؤں میں رہا:
(الف) دو مہینے (ب) چھ مہینے (ج) ایک سال (د) چھ سال (ب)

(44) مرزا شہ زور اور اس کے گھر والے گاؤں سے چلے آئے:
(الف) دہلی (ب) لکھنؤ (ج) مدراس (د) بنارس (الف)

(45) مرزا شہ زور کی والدہ کا انتقال ہوا:
(الف) گاؤں میں (ب) دہلی میں (ج) غازی آباد میں (د) بنارس میں (ب)

(46) انگریزی سرکار نے مرزا شہ زور کی ماہوار پنشن مقرر کردی:
(الف) دو روپے (ب) پانچ روپے (ج) سات روپے (د) دس روپے (ب)

سبق: ۵ مکاتیبِ غالب

مُصنف
اسداللہ خاں غالب
(1797-1869)

مصنف کا تعارف

اسداللہ خاں نام، گھر پر "مرزا نوشہ" پکارے جاتے تھے۔ پہلے "اسد" تخلص کیا پھر "غالب"۔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ نسلاً ایک تُرک تھے۔ والد عبداللہ بیگ سپاہی پیشہ تھے۔ غالب پانچ برس کے تھے کہ وہ ایک معرکے میں مارے گئے۔ غالب کی پرورش ان کے چچا نے سنبھالی لیکن چار سال بعد وہ بھی وفات پا گئے اور غالب اپنے نانا کی نگرانی میں آ گئے۔ عنفوانِ شباب بڑی بے فکری میں گزرا۔

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے اور اپنی فارسی شاعری پر فخر کیا کرتے تھے۔ ابتدا میں خط بھی فارسی میں لکھتے تھے لیکن بعد میں کچھ تو اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور کچھ اپنی جدت پسندی کے باعث اُردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بہت سے خط لکھے جن کے مجموعے "عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے۔

غالب اپنے عہد اور زمانے کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے، جو اپنے دور کے علمی و ادبی کمالات اور روایات کی عکاسی کرتی تھی۔ ان کی شخصیت اپنے تمام تر رچاؤ اور وسعت کے ساتھ ان کے خطوط میں بھی جھلکتی ہے۔ ان کے خطوط کی اہم خصوصیت ان کا اسلوبِ بیان اور زبان ہے۔ ان کے خطوط بے ساختگی، بے تکلفی، طنز و مزاح اور تازگی و شوخی کے عناصر سے بھرپور ہیں۔ ان کی عبارت سادہ، پُرکار اور جوش و ولولہ سے لبریز ہے۔ جس میں کہیں کہیں مشکل الفاظ و تراکیب بھی آتی ہیں لیکن وہ بھی غالب کی علمیت، ظرافت اور جدت پسندی کی جھلک کے طور پر۔ ان کے خطوط کی زبان و بیان کی روانی بے مثال ہے۔ غالب ان میں اکثر و بیشتر مکالمہ اور قافیہ کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن اس سے تصنع کے بجائے بے ساختگی اور ظرافت کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو بے تکلف عالم فاضل دوست دنیا اور اس کے معاملات پر گہری نظر رکھنے والے آمنے سامنے بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں **"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"**

لیکن اس بے تکلفی و سادگی کے باوجود ان کے خطوط میں علمی و ادبی شان پائی جاتی ہے۔ مرزا غالب کے دو خط شاملِ کتاب ہیں جو علاء الدین احمد خان علائی (۱) اور مرزا ہرگوپال تفتہ (۲) کے نام ہیں۔

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:
☆ طلبہ کے علمی اور ادبی ذوق کی تربیت کرنا۔
☆ غالب کے خطوط سے غالب کا تاریخی موقف، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور ثقافتی پہلوؤں کے بارے میں جاننا۔
☆ مکاتیب غالب کے توسط سے غالب کے ذہنی، فکری افق اور خیالات کو سمجھنا۔
☆ طلبہ کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں میں اضافہ کرنا۔
☆ طلبہ کو بتانا کہ نثر نگاری میں غالب کے خطوط کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ غالب نے خطوط نویسی میں منفرد اسلوب کی بنیاد رکھی۔

خط نمبر 1
مکتوب بنام علاء الدین علائی

مشکل الفاظ کے معانی

متن (30) **علاء الدین علائی:** (مرزا غالب کے شاگرد) **ثمر:** (پھل، میوہ، نتیجہ، انجام، حاصل) **نورس:** (نیا پھل، تازہ میوہ، نیا آیا ہوا)، **ثمر نورس:** (تازہ پکا ہوا پھل مجازاً نوجوان اولاد) **نہال:** (تازہ اگایا ہوا پودا، پھل دار درخت، خوش حال)، **نشوونما**

(پرورش پانا، پھلنا پھولنا)، ہوا خواہ: (خیر خواہ، بھلائی چاہنے والا)، سایہ نشیں: (سایہ میں بیٹھنے والا، مصاحب، شریک صحبت)، عزیز: (پیارا، دل پسند، دوست، رشتہ دار جمع اعزہ)، دید وادید: (میل ملاقات)، صورت: (طریقہ، ڈھنگ، شکل، چہرہ)، دلی: (بھارت کا دارالحکومت)، لوہارو: (برطانوی راج کے صوبہ پنجاب میں ایک نوابی ریاست تھی۔ مجبور: (بے بس، لاچار)، معذور: (مجبور، ناچار، بے بس، اپاہج)، عذر: (بہانہ، ٹال مٹول)، زنہار: (ہرگز نہیں)، مسموع: (سنا گیا، قبول کیا گیا)، ماجرا: (سرگزشت، واقعہ، معاملہ، حادثہ)، عالم: (دنیا، کائنات، کیفیت، حالت)، عالمِ ارواح: (روحوں کا جہاں، وہ دنیا جہاں روحیں رہتی ہیں)، عالمِ آب و گل: (پانی اور مٹی کا جہاں مُراد: دنیا)، حاکم: (حکم کرنے والا، حکمران، مالک، آقا)، لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ: (ترجمہ: آج کس کی بادشاہی ہے؟)، لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّار: (کسی کی نہیں) صرف خدائے واحد وقہار کی)، ہرچند: (اگرچہ، کتنا ہی، بہتیرا)، قاعدہ: (دستور، رسم، رواج، قانون)، مجرم: (جس نے جرم کیا ہو، خطا کار، گناہ گار)، سزا پانا: (برائی کا بدلہ پانا، جرمانہ یا قید بھگتنا)، گناہ گار: (مجرم، خطاوار)، رُوبکاری: (مقدمے کی پیشی)، واسطے: (واسطہ کی جمع، وجہ، خاطر، سبب)، حوالات: (قید، تحویل۔ وہ جگہ جہاں ملزم کو مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک نظر بند رکھا جائے)، حبسِ دوام: (عمر قید)، صادر ہونا: (نافذ ہونا، جاری ہونا)، بیڑی: (وہ خاص وضع کی زنجیر جو قیدی یا ملزم کے پاؤں میں ڈالتے ہیں تاکہ بھاگ نہ جائے، یہاں مراد بیوی ہے)، زندان: (قید خانہ)، فکر: (پریشانی سوچ بچار)، مشقت: (محنت، ریاضت، جاں فشانی)، جیل خانہ: (قید خانہ، زندان)، بلادِ شرقیہ: (مشرقی ممالک/شہر)، پایانِ کار: (آخر کار، الغرض)، کلکتہ: (بھارت کا ایک مشہور شہر)، محبس: (قید خانہ، زندان)، قیدی: (اسیر، مقید، گرفتار، سزا یافتہ، مجرم)، گریز پا: (بھاگنے کے لیے تیار، گریزاں)، ہتھکڑی: (لوہے کا کڑا یا زنجیر جو مجرم کے ہاتھوں میں ڈالتے ہیں،)، فگار: (زخمی، گھائل، عاجز)، زخم دار: (زخمی، مجروح، زخم خوردہ)، مشقت مقرری: (مقرر شدہ مشقت، طے شدہ دُکھ)، یک قلم: (یک لخت، فوراً)، زائل ہونا: (دور ہونا، معدوم ہونا)، بے حیا: (بہت ہی بے شرم، جس کے اندر حیا نہ ہو۔)، گزشتہ: (گزرا ہُوا، پچھلا، سابقہ، ماضی کا)، زاویہ زندان: (قید خانے کے کونے میں)، مع: (ساتھ، ہمراہ، سمیت)

نمبر 31 میرٹھ: (بھارت کا ایک ضلع جو اتر پردیش میں واقع ہے)، مرادآباد: (بھارت کا ایک معروف شہر)، رام پور: (بھارت کی ریاست اتر پردیش کا ایک ضلع ہے)، عہد کرنا: (وعدہ کرنا، قول و اقرار کرنا)، رہائی: (قید سے چھٹکارا، نجات، آزادی، یہاں مراد موت ہے)، ضعیف: (ناتواں، کمزور، بوڑھا)، احتمال: (اندیشہ، امکان)، تقدیر: (اندازہ، قسمت، مقدر)، سوائے: (سوا، علاوہ، بجز) نجات: (رہائی، چھٹکارا)، فرخ: (مبارک، خوش شکل، خوب صورت)، آں: (کسی بات کے اقرار کرنے کا کلمہ)، از: ("سے" کا ہم معنی، منبع، ملکیت)، خانہ زنداں: (قید خانہ، جیل خانہ)، سوائے شہر: (شہر کی طرف، شہر کی سمت)، وادی: (نیچی زمین، گھاٹی، دو پہاڑوں کے درمیان کی زمین)، ویران: (اُجڑا ہُوا، غیر آباد، بنجر، جس میں کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو)

توضیحات

علاءالدین علائی: نواب علاءالدین علائی مرزا غالب کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ غالب کو ان سے خاص انس تھا۔ رشتے میں غالب کی بیوی امراؤ بیگم کے بھتیجے تھے۔ علاءالدین علائی، نواب امین الدین خاں علائی والیٔ ریاست لوہارو کے بڑے بیٹے تھے۔ اپنے والد کے بعد وہ ریاست لوہارو کے وارث بھی تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

دلی: بھارت کا دارالحکومت ہے۔ دہلی دراصل دہلیز کا مخفف ہے یعنی ہندستان کے دروازے کی چوکھٹ، جسے فاتحین کے لیے عبور کرنا ضروری تھا۔ جو بھی ہندوستان پر حملہ کرتا وہ سب سے پہلے دہلی ہی کو اجاڑتا تھا۔ بعد ازاں اسے دلی کہا جانے لگا۔ انگریزوں نے بھی 1857ء میں جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو دلی میں خوب قتل و غارت کی۔

لوہارو: برطانوی راج کے صوبہ پنجاب میں ایک نوابی ریاست تھی۔ اس کا رقبہ 222 مربع میل کے علاقے 570 مربع کلومیٹر تھا۔ 1901 میں ریاست کی آبادی 15229 افراد پر مشتمل تھی۔ خاندان لوہارو سے غالب کی رشتہ داری تھی، غالب کی بیوی امراؤ بیگم نواب امین الدین کی چچیری بہن تھیں۔

لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ: ترجمہ: آج کس کی بادشاہی ہے؟

لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّار: (کسی کی نہیں) صرف خدائے واحد وقہار کی۔

حوالات: قید، تحویل۔ وہ جگہ جہاں ملزم کو مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک نظر بند رکھا جائے۔

بیڑی: وہ خاص وضع کی زنجیر جو قیدی یا ملزم کے پاؤں میں ڈالتے ہیں تا کہ بھاگ نہ جائے۔

کلکتہ: کلکتہ بھارت کی ریاست مغربی بنگال کا دارالحکومت ہے جو دریائے ہوگلی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ یہ مشرقی بھارت کا اہم تجارتی، ثقافتی اور تعلیمی مرکز ہے۔ کلکتہ بندرگاہ بھارت کی قدیم ترین اور واحد اہم دریائی بندرگاہ ہے۔

میرٹھ: بھارت کا ایک ضلع جو اتر پردیش میں واقع ہے۔

مُرادآباد: بھارتی ریاست اتر پردیش کا ایک تاریخی اور صنعت و حرفت کے نقطۂ نظر سے اہم شہر ہے۔ مُرادآباد گنگا ندی کے کنارے آباد ہے۔

رام پور: بھارت کی ریاست اتر پردیش کا ایک ضلع ہے۔

تقدیر: لغت کے اعتبار سے "اندازہ" کرنے کو کہتے ہیں، جب کہ شرعی اصطلاح کے اعتبار سے تقدیر اللہ تعالیٰ کے اس علم اور فیصلہ کو کہتے ہیں جو اس کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کے بارے میں اس کے وجود میں آنے سے پہلے طے کیا جا چکا ہے۔

خط نمبر 2

مکتوب بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر 31 مسودہ (وہ تحریر جس میں اصلاح کی گنجائش ہو) اصلاح (درستی) قصائد (تعریفی اشعار، کسی کی تعریف میں لکھی ہوئی نظم) میرا مکان گھر کا نہیں ہے (میرا ذاتی گھر نہیں ہے) مینہ (بارش، برسات) بالا خانہ (چوبارہ، دوسری منزل، بالائی منزل) دالان (بڑا کمرا، کھلا کمرا) محل ہے (جگہ ہے) چھت چھلنی ہو گئی (چھت بوسیدہ ہو کر ٹپکنے لگی) لگن (پیتل یا تانبے کی پرات جس میں عموماً آٹا گوندھا جاتا تھا) چلمچی (منھ ہاتھ دھونے کا برتن) اگال دان (پان کی پیک کا برتن، تھوک دان) توشہ خانہ (سٹور، وہ جگہ جہاں سامانِ خانہ داری رہتا ہے) متوجہ نہیں (توجہ نہیں دے رہا) کشتیٔ نوح (حضرت نوحؑ کی بنائی گئی کشتی جس میں وقتِ طوفان مومنین نے پناہ حاصل کی)، احسن اللہ خان (بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص)

نمبر 32 معالج (طبیب، علاج کرنے والا) فصد (نشتر لگا کر رگ سے خون نکالنا، یہ طریقہ اُس وقت استعمال کیا جاتا جب خون گندا ہو جاتا) جونک (ایک انسان دوست پیراسائٹ (PARASITE) جو گندا خون نکالنے کے لیے استعمال ہوتی ہے) مسہل (قبض دور کرنے والی دوا، دست لگانے کی دوا) ناتواں (کمزور) صاحبِ فراش (وہ بیمار جو بستر سے نہ اُٹھ سکے) تکلف (بناوٹ، تکلیف اٹھا کر کوئی کام کرنا)

توضیحات

خط نمبر 2

توشہ خانہ: وہ جگہ جہاں سامانِ خانہ داری رہتا ہے۔ وہ مکان جہاں امیروں کے لباس، پوشاک اور زیورات وغیرہ جمع رہتے ہیں۔

فصد: نشتر لگا کر رگ سے خون نکالنا، یہ طریقہ اُس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب خون گندا ہو جاتا ہے۔

جونک: ایک انسان دوست پیراسائٹ (PARASITE) جو گندا خون نکالنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

کشتیٔ نوحؑ: حضرت نوحؑ کی کشتی، حضرت نوحؑ کی بددعا سے دنیا میں پانی کا طوفان آیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو ہدایت کی تھی کہ ایک کشتی بنائیں۔ جب طوفان آئے تو اپنے بیوی بچوں اور ایمان دار لوگوں سمیت اس کشتی میں بیٹھ جائیں۔ جب طوفان آیا تب ساری دنیا غرق ہو گئی، لیکن نوحؑ کی کشتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ: جہانگیر آباد کے جاگیردار، اُردو و فارسی کے باذوق شاعر اور نقاد تھے۔ انھوں نے ہی الطاف حسین حالی کو مرزا غالب سے متعارف کرایا تھا۔ دہلی میں ایک بہت بڑی لائبریری ان کی ملکیت تھی، جسے 1857ء میں باغیوں نے لوٹا اور آگ لگا دی تھی۔ انگریزوں نے بغاوت کے شبہ میں 7 سال قید سنائی لیکن ہندوستان کے نامور عالم نواب صدیق حسن خان کی سفارش سے ان کا "جرم" معاف ہو گیا اور پنشن مقرر ہوئی۔

میر بادشاہ: پیشے کے لحاظ سے جج تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ غالب کے واقف کار تھے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ نے ان کا تعارف غالب سے کرایا تھا۔

میر قاسم علی: میر قاسم علی مرزا غالب کے واقف کار تھے اور پیشے کے لحاظ سے جج تھے۔

احسن اللہ خاں: دہلی کے معروف حکیم اور بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص تھے۔ انھیں علم و ادب سے خاص شغف تھا۔ 1857ء میں انگریزوں کے جاسوس ہونے کے شبہے میں ان کے مکان کو آگ لگا دی گئی تھی۔

نواب صاحب: رام پور کے نواب یوسف علی خان ناظم جو اپنی شاعری پر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ: مرزا تفتہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ مرزا تفتہ فارسی کے اہم شاعر اور غالب کے چہیتے شاگرد تھے۔ مرزا غالب کے سب سے زیادہ خطوط انھی کے نام ہیں، جن کی تعداد تقریباً 123 ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق و سباق

مرزا غالب علاء الدین کو لکھتے ہیں کہ ملاقات کی دو ہی صورتیں ہیں کہ تم دلّی آؤ یا میں لوہارو آ کر تم سے ملوں لیکن یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں عالمِ ارواح کا گناہ گار 1212ھ میں سزا کے لیے دنیا میں بھیجا گیا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال کر دلی کو زندان مقرر کر کے قید کر دیا گیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ جیل سے بھاگنے کی کوشش کی تو ٹھکتہ سے پکڑا گیا۔ دو ہتھکڑیاں بڑھا دی گئیں۔ گزشتہ سال ہتھکڑیوں سمیت بھاگا اور میرٹھ، مراد آباد گیا اور رام پور سے پھر پکڑا گیا۔ اب بھاگنے کی طاقت نہیں۔ امید ہے اسی سال قید سے چھوٹ کر سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

عبارت نمبر 1

تم تو ثمرِ نورس ہو، اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں، کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دید و ادید، اس کی دو صورتیں ہیں: تم دلّی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبورمیں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟

سنو! عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے۔"

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

سیاق و سباق

یہ خط کی پہلی عبارت ہے جس میں مصنف مکتوب الیہ سے اپنا تعلق واضح کر رہے ہیں۔ تشریح طلب عبارت کے بعد غالب کہتے ہیں کہ وہ عالمِ ارواح کے گناہ گار ہیں اور دنیا میں سزا کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اپنی پیدائش اور شادی کے بارے میں ایسے بتاتے ہیں جیسے کسی مجرم کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جیل سے بھاگا، پکڑا گیا اور قید میں سختی کر دی گئی۔ پھر اپنے میرٹھ، رام پور اور مراد آباد کے سفر کا بتاتے ہیں۔ آخر میں اپنی رہائی یعنی موت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اسی سال متوقع ہے۔

تشریح

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو اور فارسی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو خطوط بھی لکھے جو شگفتہ نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط بے تکلفی اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں سادگی، دل کشی اور ادبی حسن نمایاں ہے۔ ان کے خطوط میں سماجی معاملات اور ذاتی تجربات کا خوب صورت عکس ملتا ہے۔

تشریح طلب اقتباس غالب کے اس خط سے لیا گیا ہے جو انھوں نے علاء الدین علائی کے نام لکھا تھا۔ علاء الدین علائی مرزا غالب کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ غالب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ علاء الدین علائی، نواب امین الدین خاں علائی والئی ریاست لوہارو کے بڑے بیٹے تھے۔ اپنے والد کے بعد وہ ریاست لوہارو کے وارث بھی تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ لوہارو برطانوی دورِ حکومت میں پنجاب کی ایک ریاست تھی۔ اس کے حکمران نواب کہلاتے تھے۔ علاء الدین خاں علائی اس ریاست کے چوتھے نواب تھے۔ جس زمانے میں غالب نے یہ خط لکھا تھا اس وقت ریاست لوہارو کے والی، امین الدین خاں علائی تھے۔ امین الدین خاں علائی کے انگریز وائسرائے کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی جسے انگریز غدر کا نام دیتے ہیں، کے بعد دہلی پر انگریزوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے اس سے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ ریاست لوہارو میں بھی عوام نے نواب امین الدین کے خلاف بغاوت کی کوشش کی لیکن نواب نے اس پر قابو پا لیا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے نواب علاء الدین علائی کے والد نے انھیں دلی جانے سے روک دیا۔ دلی تباہ ہوئی اور مسلمانوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ غالب کے ملنے جلنے والے سب دلی سے چلے گئے۔ غالب اپنے دوستوں کے ساتھ صرف خطوط کے ذریعے ملاقات کر سکتے تھے۔ علاء الدین خان علائی غالب کے ہونہار اور عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے غالب کی نگرانی میں تعلیم پائی تھی۔ غالب نے انھیں سند سے نوازا تھا اور اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ غالب انھیں اپنا خلیفہ بھی کہتے تھے۔

تشریح طلب عبارت میں غالب اپنے شاگرد علاء الدین خاں علائی سے اپنے تعلق کی نوعیت اور گہرائی کا اظہار کر رہے ہیں۔ غالب علاء الدین خان علائی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمھارے والد امین الدین خان علائی ایک ایسے درخت کی مانند ہیں کہ جن کے پھل اور سائے سے میں نے فیض پایا ہے۔ تم اس درخت کے تازہ پھل ہو۔ تم نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے یعنی تمھاری تعلیم و تربیت میری نگرانی میں ہوئی ہے۔ اس لیے تم مجھے بہت عزیز ہو۔ تم سے میرا دوہرا تعلق ہے۔ ایک تو تمھارے آباؤ اجداد کی وجہ سے جو ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے ہیں۔ دوسرا اس وجہ سے کہ تم میرے عزیز شاگرد رہے ہو۔ اس دلی تعلق کی وجہ سے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ملاقات کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ تم لوہارو سے سفر کر کے دلّی آؤ اور مجھ سے ملو۔ ملاقات کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں دلی سے سفر کر کے لوہارو آؤں اور وہاں تم سے مل کر اطمینان حاصل کروں۔ لیکن یہ دونوں صورتیں ناممکن نظر آتی ہیں۔ تمھارا دلی آنا اس لیے ناممکن ہے کہ دلی کے حالات اور خود ریاست لوہارو کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ تم اپنی ریاست چھوڑ کر نکلو۔ اس لیے تم سیاسی اور خاندانی معاملات کی وجہ سے مجبور ہو۔ غالب کہتے ہیں کہ میں دلی چھوڑ کر لوہارو نہیں آ سکتا کیوں کہ میری صحت اور عمر سفر کی اجازت نہیں دیتی۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں (غالبؔ)

مرزا غالب مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحبِ فراش ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔"

اس لیے میں سفر سے معذور ہوں۔ چناں چہ ملاقات کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں خواہ مخواہ معذوری کا اظہار کر رہا ہوں۔ میں تمھاری مجبوری کو سمجھتا ہوں اس لیے مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری مجبوری کو بھی سمجھو اور مجھ پر یقین کرو۔ میرے عذر کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ تم یہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور میرا ماجرا کیا ہے؟ اب میرا حال غور سے سنو اور سمجھو۔ بات یہ ہے کہ عالم یعنی جہان دو ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ایک عالمِ ارواح ہے

جہاں تمام انسانوں کی ارواح جمع تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو دنیا میں بھیجنے سے قبل ان کی ارواح کو جمع کر کے اپنی اطاعت و بندگی کا عہد لیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ رسولوں پر ایمان اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا عہد و پیمان لیا تھا۔ خدا نے جب تمام ارواح سے بطور گواہی پوچھا تھا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے بیک زبان ہو کر اقرار کیا تھا کہ کیوں نہیں، بے شک آپ ہی ہمارے رب اور آقا و مالک ہیں۔ قرآن میں سورہ اعراف آیت 172 میں اس واقعہ کا تذکرہ موجود ہے:

ترجمہ: ''جب تمھارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور انھیں خود ان پر گواہ ٹھہرایا تھا اور پھر اس نے پوچھا تھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب میں کہا: کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ عہد ہم نے اس لیے لیا کہ قیامت کے دن کہیں تم یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو بے خبر رہے۔'' (سورہ اعراف: 172)

چوں کہ دنیا امتحان کے لیے ہے اس لیے دنیا میں انسان کو بھیجنے کے بعد اس واقعہ کی یاد انسان کے حافظہ سے مٹا دی گئی۔ البتہ اس کے باطن میں اس کا احساس اور حقیقت پیوست ہے۔ جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے اسی طرح انسان اپنے خالق کی جانب لپکتا ہے، جیسے وہ اسے پہلے سے جانتا تھا۔

آنحضور ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی ارواح کو لشکر کی صورت میں جمع کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ روحیں جو عالمِ ارواح میں اکٹھی تھیں وہ دنیا میں بھی ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرتی ہیں۔

دوسرا عالم، آب و گل کا جہان ہے۔ یعنی یہ جہان جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ عالمِ ارواح سے روحیں مادی جسم میں اس جہانِ آب و گل یعنی مادی جہان میں آتی ہیں۔ ان دونوں جہانوں کا خالق اور مالک ایک یعنی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ خود فرماتا ہے:

لِمَنِ الملک الیوم

ترجمہ: آج کس کی بادشاہی ہے؟

پھر وہ خود جواب دیتا ہے۔

للہِ الواحد القھار

ترجمہ: ایک اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عالمِ ارواح ہو یا عالمِ آب و گل، ہر جگہ اسی کی بادشاہی ہے اور وہی ہر جہان کا مالک ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الحمد للہِ رب العالمین

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔

عبارت نمبر 2

ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم، عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چناں چہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں رُوبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ حبسِ دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔

سیاق و سباق

یہ عبارت خط کے ابتدائی حصے سے لی گئی ہے۔ تشریح طلب عبارت سے پہلے غالب علاء الدین علائی کے ساتھ اپنے تعلق کی وضاحت کرتے ہیں۔ تشریح طلب عبارت کے بعد کہتے ہیں کہ چوں کہ وہ عالمِ ارواح کے گناہ گار ہیں۔ اور اس دنیا میں سزا کے واسطے بھیجے گئے ہیں اس لیے دلی کے قید خانے میں فکرِ نظم و سُخن کے لیے مشقت ٹھہرایا ہے۔ کئی سال بعد وہ جیل سے بھاگے لیکن بھٹکتے سے پکڑے

گئے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دی گئیں۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ گزشتہ سال فرار ہو کر میرٹھ، مراد آباد اور رام پور گئے اور دوبارہ گرفتار ہو گئے۔ اب بھاگنے کی طاقت نہیں۔ رہائی یعنی موت کا انتظار ہے جو اسی سال متوقع ہے۔ بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو جانے کا ارادہ ہے۔

تشریح

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو اور فارسی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو خطوط بھی لکھے جو شگفتہ نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط بے تکلفی اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں سادگی، دل کشی اور ادبی حسن نمایاں ہے۔ ان کے خطوط میں سماجی معاملات اور ذاتی تجربات کا خوب صورت عکس ملتا ہے۔

تشریح طلب اقتباس غالب کے اس خط سے لیا گیا ہے جو انھوں نے علاء الدین علائی کے نام لکھا تھا۔ علاء الدین علائی مرزا غالب کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ غالب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ علاء الدین علائی، نواب امین الدین خاں علائی والئی ریاست لوہارو کے بڑے بیٹے تھے۔ اپنے والد کے بعد وہ ریاست لوہارو کے وارث بھی تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

تشریح طلب عبارت میں غالب اپنے حالاتِ زندگی سے آگاہ کر رہے ہیں۔ ان کا انداز یہ بتاتا ہے کہ وہ دنیا کو ایک قید خانہ اور خود کو ایک قیدی کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عالم دو ہیں، ایک عالمِ ارواح اور دوسرا عالمِ آب و گل۔ آدمی عالمِ ارواح سے عالمِ آب و گل یعنی اس مادی جہان میں آتا ہے۔ اس دنیا میں زندگی گزار کر وہ دوبارہ عالمِ ارواح میں چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں وہ جو عمل کرتا ہے، اس کا نتیجہ اسے اگلے جہان میں ملتا ہے، یعنی آدمی اس جہان میں جو جرم کرتا ہے اس کی سزا عالمِ ارواح میں پاتا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے قاعدۂ عام یہی ہے۔ لیکن غالب کہتے ہیں کہ ان کے معاملے میں یہ قاعدہ الٹ ہو گیا ہے۔ عالمِ ارواح کے گناہ گار کو سزا دینے کے لیے اس دنیا میں بھیج دیا گیا۔ قاعدۂ عام یہ ہے کہ دنیا کے گناہ گاروں کو عالمِ ارواح میں سزا ملے گی لیکن میرے معاملے میں یہ ہوا ہے کہ مجھے سزا کے طور پر زندگی دی ہے اور اس دنیا کی تکلیفیں سہنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

غالب اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب کہتے ہیں کہ جس طرح مجرم عدالت میں پیش ہو کر اپنے مقدمے کا سامنا کرتا ہے، اسی طرح مجھے بھی مقدمے کی پیشی کے لیے آٹھ رجب 1212ھ میں دنیا میں بھیجا گیا۔ دنیا میں تیرہ برس میرا مقدمہ چلتا رہا اور میں حوالات میں رہا۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ ملزم جب تک اپنے مقدمے کا سامنا کرتا ہے، حوالات میں بند رہتا ہے۔ عدالت میں مقدمے کی تکمیل پر اسے رہائی مل جاتی ہے یا مجرم بنا کر سزا دی جاتی ہے۔ چناں چہ میرا مقدمہ چلتا رہا اور میں تیرہ برس تک حوالات میں رہا۔ آخر سات رجب 1225ھ میں میرے مقدمے کا فیصلہ ہوا اور مجھے عمر قید کی سزا ملی، مجھے قابو کرنے کے لیے ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ دلّی شہر کو میرے لیے قید خانہ مقرر کیا اور میری عمر قید کا آغاز ہوا۔

تشریح طلب عبارت میں غالب دراصل یہ بتا رہے ہیں کہ وہ آٹھ رجب 1212ھ میں پیدا ہوئے اور تیرہ برس کی عمر میں سات رجب 1225ھ میں ان کی شادی ہوئی۔ شادی کو وہ عمر قید سمجھتے ہیں اور بیوی کو پاؤں کی بیڑی قرار دے رہے ہیں۔ دلّی کو وہ اپنے لیے قید خانہ تصور کرتے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب آزاد منش، درویش صفت انسان تھے۔ ان کے مالی حالات اچھے نہیں تھے لیکن ان کا مزاج شاہانہ تھا۔ اس لیے وہ شادی کی ذمہ داریوں کو عمر قید سمجھتے تھے۔ ان کی کوئی اولاد زندہ نہ بچی تھی، اس لیے وہ اپنی بیوی کے غم خوار بھی تھے۔ یہ ذمہ داری بھی انھیں پاؤں کی بیڑی کی طرح محسوس ہوتی تھی کیوں کہ وہ بیوی کو چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔

اس عبارت میں غالب نے ایک انوکھے اور دل چسپ انداز میں اپنی ابتدائی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔

عبارت نمبر 3

فکرِ نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی حبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقِ مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں۔ سالِ گزشتہ بیڑی کو زادیۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہِ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں گا۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعدِ نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانہ بروم
سوئے شہرِ خود ازیں وادیٔ ویراں بروم

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت خط کی آخری عبارت ہے۔ اس سے پہلے بتایا گیا ہے کہ غالب علاء الدین خان علائی کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں عالمِ ارواح کا گناہ گار ہوں اور دنیا میں سزا کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ 1212ھ میں روبکاری کے واسطے آئے اور تیرہ سال حوالات میں رہے۔ 1225ء میں حکمِ حبسِ دوام ہوا اور دلی کو زنداں مقرر کر کے نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔

تشریح

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو اور فارسی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو خطوط بھی لکھے جو شگفتہ نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط بے تکلفی اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں سادگی، دل کشی اور ادبی حسن نمایاں ہے۔ ان کے خطوط میں سماجی معاملات اور ذاتی تجربات کا خوب صورت عکس ملتا ہے۔

تشریح طلب اقتباس غالب کے اس خط سے لیا گیا ہے جو انھوں نے علاء الدین علائی کے نام لکھا تھا۔ علاء الدین علائی مرزا غالب کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ غالب کو ان سے خاص انس تھا۔ علاء الدین علائی، نواب امین الدین خاں علائی والئی ریاست لوہارو کے بڑے بیٹے تھے۔ اپنے والد کے بعد وہ ریاست لوہارو کے وارث بھی تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

تشریح طلب عبارت میں غالب اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی گویا ان کے پاؤں میں بیڑی ڈال کر عمر قید کی سزا دی گئی۔ دلّی کو ان کے لیے قید خانہ مقرر کیا گیا اور مشقت کے طور پر نظم ونثر لکھنا مقرر ہوا۔ بعض مجرموں کو ان کے جرم کی سنگینی کے مطابق قید بامشقت کی سزا ملتی ہے۔ قید بامشقت کا مطلب ہے کہ قید خانے میں اس سے مشقت طلب یا مشکل کام لیے جاتے ہیں جو اس کی سزا کا حصہ ہوتے ہیں۔ غالب کو عمر قید ہوئی اور قید خانے میں نظم ونثر لکھنا مشقت کے طور پر سزا کا حصہ بنا دیا گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ کئی سال تک وہ قید اور مشقت برداشت کرتے رہے۔ پھر ان کو موقع ملا تو جیل خانے سے بھاگ نکلے۔ آخر کار سرکاری کارندے انھیں کلکتہ سے پکڑ لائے اور دوبارہ جیل میں ڈال دیا۔ یہاں غالب اپنے اس سفر کا ذکر کر رہے ہیں جو انھوں نے پنشن کی بحالی کے لیے کیا تھا۔ جو ان کے چچا کی وفات کے بعد انگریز حکومت سے ملتی تھی۔ غالب نے انگریز دربار میں پنشن کی بحالی کی درخواست کی لیکن پنشن بحال نہ ہو سکی۔ غالب مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دہلی سے کلکتہ پہنچے تھے۔ راستے میں انھوں نے بنارس اور پٹنہ میں بھی قیام کیا تھا۔ دراصل وہ دہلی کو مستقل طور پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دہلی میں ان کی قدر نہیں ہوئی۔ وہ فارسی کے اچھے شاعر تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں ان کی سخن وری کی قدر ہو۔ بدقسمتی سے دہلی چھوڑ کر جانے کے بعد دوسرے علاقوں میں انھیں وہ پزیرائی نہ ملی جس کی انھیں توقع تھی۔ چناں چہ تین سال بعد وہ کلکتہ سے

واپس دلی آ گئے۔ مرزا غالب اپنے ایک شعر میں کلکتہ کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے (مرزا غالب)

وہ کہتے ہیں کہ انھیں دوبارہ قید کر کے ان کی دو ہتھکڑیاں بڑھا دیں تا کہ قید میں سختی کی جا سکے۔ یہاں ہتھکڑیوں سے مراد غالب کے لے پالک بیٹے زین العابدین خاں عارف کے دو بچے باقر علی خان اور حسن علی خان ہیں۔ غالب کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کا لے پالک بیٹا تھا جو ان کی بیوی کا بھانجا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ عارف جوانی میں فوت ہو گیا اور اس کے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری غالب پر آ گئی۔ اس لیے غالب ان دو بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کو دو ہتھکڑیاں قرار دے رہے ہیں۔ غالب کے مالی اور معاشی حالات پہلے ہی بہت خراب تھے۔ انھیں اپنی ناقدری کا احساس بھی تنگ کرتا تھا۔ بلادِ شرقیہ کے سفر سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تھا اس لیے وہ بخت مایوس ہو گئے تھے۔ غالب اپنے میرٹھ، مراد آباد اور رام پور کے سفر کے بارے میں بتاتے ہیں۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ان کے مالی حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ مغل دربار کے خاتمے کے بعد ان کے روزگار کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ انھیں اپنے وظیفے کی بحالی اور کسی سرپرست کی تلاش تھی جو ان کی مالی مدد کر سکتا۔ چناں چہ وہ میرٹھ اور مراد آباد میں اپنے دوستوں اور شاگردوں سے ملاقاتیں کر کے رام پور پہنچے۔ رام پور کے نواب یوسف علی خان ادب دوست تھے اور شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ انھوں نے غالب کو ایک معقول ماہانہ وظیفہ دینا شروع کر دیا، جس سے ان کی گزر بسر میں بہتری آ گئی تھی۔ ان کو ان علاقوں میں پزیرائی بھی ملی تھی لیکن انھیں دہلی کی یاد ستانے لگی اور وہ واپس آ گئے۔ واپس آ کر ان کا دہلی دوبارہ چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بقول غالب:

ہاں یہی شاہراہِ دہلی ہے — مطبعِ بادشاہ دہلی ہے

اور بقول ابراہیم ذوق:

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن — کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

خط کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ اب اسی سال قید سے رہائی ملنے کا امکان ہے۔ حکمِ رہائی ملنے سے مراد مرنا ہے۔ یعنی زندگی کی قید سے رہائی ملنے والی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد یعنی رہائی کے بعد وہ سیدھے اپنے گھر، عالمِ ارواح کو چلے جائیں گے۔ خط کے آخر میں غالب نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے فارسی کا ایک شعر تحریر کیا ہے۔ جس کا مطلب کچھ یوں ہے:

"میرے لیے وہ دن کس قدر خوش قسمتی کا حامل ہوگا جس دن میں اس قید خانے (دنیا) سے یعنی اس ویران وادی سے اپنے (بستے) شہر (عالمِ ارواح) کی طرف جاؤں گا۔"

اس عبارت میں غالب نے اپنے حالاتِ زندگی اس طرح بیان کیے ہیں گویا وہ ایک قیدی ہیں۔ یہ غالب کا خوب صورت اور انوکھا انداز ہے جس سے انھوں نے زندگی کی تلخیوں کا ذکر کیا ہے۔

دوسرا خط

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق وسباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس خط کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق وسباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق وسباق

غالب اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ تمھارے قصائد کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں کے مسودات اصلاح کے لیے پڑے ہیں۔ لیکن برسات کی وجہ سے کسی کا مسودہ نہیں دیکھ سکا۔ میرا گھر کرایہ کا ہے جس کی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی ہے، اس لیے میں نے پڑھنے لکھنے کا سامان توشہ خانہ میں رکھوا دیا ہے۔ آخر میں غالب میر بادشاہ، میر قاسم علی اور نواب مصطفیٰ خان کی خیریت سے مطلع کرتے ہیں اور اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے میں لیٹے لیٹے خط لکھتے ہیں۔

عبارت نمبر 1

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب

کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اُگالدان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب اقتباس اُردو کی درسی کتاب کے سبق ''مکتوباتِ غالب'' سے لیا گیا ہے، جو مصنف کی مشہورِ زمانہ مرتب کردہ کتاب ''خطوطِ غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر'' سے منتخب کیا گیا ہے۔ تشریح طلب اقتباس درسی کتاب کے سبق کے خط نمبر دو کے (آغاز۔ درمیان۔ اختتام) سے لیا گیا ہے۔ سبق میں تشریح طلب عبارت سے پہلے اور بعد کے مقامات پر مصنف بتاتے ہیں کہ ہرگوپال تفتہ مرزا غالب سے شکوہ کرتے ہیں کہ ان کے مسودے نہیں دیکھے گئے۔ مرزا غالب نے بارشوں کے طویل سلسلے کا ذکر کیا ہے اور گھر کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ بارش کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے۔ پھر میر بادشاہ، میر قاسم علی اور نواب مصطفیٰ خان کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔

تشریح

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو اور فارسی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو خطوط بھی لکھے جو شگفتہ نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط بے تکلفی اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں سادگی، دل کشی اور ادبی حسن نمایاں ہے۔ ان کے خطوط میں سماجی معاملات اور ذاتی تجربات کا خوب صورت عکس ملتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں غالب نے اپنے دوست اور شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کے خط کا جواب دیا ہے۔ مرزا تفتہ نے غالب کے پاس اصلاح و درستی کی خاطر قصائد کا مسودہ بھجوایا تھا۔ لیکن غالب اپنی مصروفیات اور مسلسل برسات کی وجہ سے اصلاح کر کے نہ بھجوا سکے۔ جس کی وجہ سے مرزا تفتہ نے خط میں شکوہ کیا ہے کہ شاید آپ کے پاس بہت سے لوگوں کے مسودے آئے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے میرے قصائد کی اصلاح نہیں کی۔ مرزا تفتہ کا شکوہ بجا ہے کیوں کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ غالب نے اتنی تاخیر کی ہو۔ مرزا تفتہ نے تاخیر پر شکوہ کیا ہے اور شکوہ وہیں کیا جاتا ہے جہاں توقع ہوتی ہے۔

غالب برصغیر کے اُردو اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے اور برصغیر میں ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ غالب ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے اور ان کی اصلاح کا معیار بھی بہت اعلیٰ تھا۔ اس لیے دور دراز سے ان کے شاگرد اصلاح کے لیے اپنی شاعری بھجوایا کرتے تھے اور غالب بلا تاخیر اصلاح کر کے بھجوا دیا کرتے تھے۔ چناں چہ غالب مرزا تفتہ کا یہ شکوہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کے پاس بہت سے لوگوں کی تحریریں اصلاح کے واسطے آئی ہوئی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہ سمجھنا کہ صرف تمھارے قصیدے ہی برائے اصلاح پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد غالب نے اپنی بیوی کے چچازاد بھائی نواب ضیاء الدین خان نیر کا حوالہ دیا ہے کہ ان کی غزلیں بھی اصلاح کر کے نہیں بھجوا سکا، وہ بھی ویسے ہی رکھی ہیں۔ غالب نے اپنے قریبی عزیز نواب صاحب کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ مرزا تفتہ کے دل میں جو غالب کی طرف سے ملال پیدا ہوا ہے۔ اس کا تاثر ختم کر سکیں۔

؎ مرے طرف سے یہ بے خیالی نہ جانے ان کو خیال کیا ہے — کبھی نہ پوچھا ملال کیا ہے کبھی نہ دیکھا حال کیا ہے
(جلیل مانک پوری)

مرزا تفتہ کے قصائد کی اصلاح بروقت کیوں نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ غالب تفصیل سے بتا رہے ہیں کہ برسات مسلسل ہو رہی ہے۔ اس کا تمھیں بھی علم ہے۔ ہندوستان میں جولائی 1864ء میں موسلا دھار بارشیں ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے سیکڑوں

مکانات برسات کی نذر ہو گئے تھے۔ غالب بھی اپنے مکان کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ ان کا مکان ذاتی نہیں ہے بلکہ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور مالک مکان اصلاح کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ پھر غالب بارش کا حال بیان کرتے ہیں کہ بارش کی وجہ سے شہر میں سیکڑوں مکان مسمار ہو گئے ہیں۔ بارش کی حالیہ کیفیت یہ ہے کہ دن رات میں دو چار بار ضرور برستی ہے اور ہر دفعہ اتنی زوردار بارش ہوتی ہے کہ ندی نالے بہ نکلتے ہیں۔ ہر طرف پانی کی وجہ سے جل تھل ہو جاتا ہے۔ حدِ نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔

بارش کی وجہ سے غالب کا مکان بھی متاثر ہوا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرے دو منزلہ مکان کی بالائی چھت یعنی چوبارہ کا دالان ہی میرے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کی جگہ ہے۔ وہیں اپنے معمولات نمٹاتا ہوں، اگرچہ یہ کمرا گرا نہیں ہے، لیکن چھت میں مختلف جگہوں پر سوراخ ہو گئے ہیں۔ بقولِ شاعر:

؎ کتنے اچھے ہیں مرے گھر کے پُرانے برتن — چھت ٹپکتی ہے تو کیچڑ نہیں ہونے دیتے
(سرور خان سرور)

غالب نے چھت کو چھلنی سے تشبیہ دی ہے، جس سے پانی مسلسل ٹپکتا رہتا ہے۔ اس کا بندوبست یہ کیا ہے کہ جہاں جہاں سے پانی ٹپکتا ہے وہاں گھر میں استعمال کے برتن رکھ دیے ہیں۔ کہیں پرات رکھ دی ہے۔ کہیں ہاتھ منھ دھونے کا برتن، تو کہیں پیک دان رکھ دیا ہے۔ جب برتنوں میں چھت سے ٹپکنے والا پانی جمع ہو جاتا ہے تو اسے اُٹھا کر باہر پھینک دیتا ہوں، اس لیے میں نے لکھنے پڑھنے کا سامان اور کتابیں وغیرہ اُٹھا کر توشہ خانہ میں رکھ دیے ہیں۔ مکان کے مالک نے مکان کی مرمت سے خاصی لاپروائی کی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے طویل اور مسلسل بارش کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے نوحؑ کی کشتی میں تین ماہ سوار رہا ہوں۔ ایک اور خط میں غالب برسات کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے، دالان کا دروازہ گر گیا، سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔۔ چھتیں چھلنی ہو گئیں، مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے''

غالب نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے کشتی نوحؑ کی تلمیح استعمال کی ہے۔ حضرت نوحؑ اللہ تعالیٰ کے مقرب پیغمبر تھے۔ انھوں نے تقریباً ساڑھے نو سو سال تک اپنی سرکش و نافرمان بت پرست قوم کو تبلیغ کی، صرف اسی یا بیاسی لوگ مسلمان ہوئے۔ نوحؑ جب قوم سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے عذاب طلب کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم نوحؑ پر سیلاب کا عذاب آیا۔ زمین بھی پانی اُبل رہی تھی اور آسمان سے بھی پانی برس رہا تھا۔ نوحؑ کی بیوی اور بیٹا کنعان بھی غرق ہو گئے۔ یہ کشتی نوحؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنائی تھی۔ اہلِ ایمان کے ساتھ نوحؑ بھی اس کشتی میں سوار ہو گئے۔ اللہ کے حکم سے کشتی کی تمام مخلوق محفوظ رہی۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام مخلوق عذاب کی نذر ہو گئی۔ کشتی کے تین حصے بنائے گئے تھے۔ ایک میں انسان تھے، دوسرے حصے میں جانور اور تیسرے حصے میں پرندے تھے۔ کشتی تقریباً تین ماہ تیرتی رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ہوا چلائی جس سے تمام پانی خشک ہو گیا۔ جو اہلِ ایمان بچ گئے تھے انھی افراد سے دنیا کا سلسلہ رواں دواں ہوا۔ اسی وجہ سے نوحؑ کو آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ غالب مرزا تفتہ کو بتاتے ہیں کہ تین ماہ مسلسل بارش ہونے کے بعد اب نجات ملی ہے۔ چناں چہ اب نواب ضیاء الدین خان نیر اور تمھارے قصیدے دیکھوں گا۔

عبارت نمبر 2

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت اُن سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں، احسن اللہ خاں معالج ہیں، فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے، سو اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحبِ فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے غالبؔ اپنے دوست کو لکھتے ہیں کہ تمھارے قصائد ابھی اصلاح کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ صرف تمھارے قصائد ہی پڑے ہیں، نواب صاحب کی غزلیں بھی ابھی یوں ہی دھری ہوئی ہیں۔ برسات ایک عرصہ سے شروع ہے اور میرے گھر کا حال تو تمھیں معلوم ہی ہے۔ جگہ جگہ چھت میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے بارش کا پانی بہہ کر کمروں میں آ جاتا ہے۔ میں نے تمام کتابیں اٹھا کر توشہ خانہ میں رکھ دی ہیں۔ کچھ بارش سے نجات ملی ہے، اب اصلاح کا کام کروں گا۔

تشریح طلب عبارت خط کی آخری عبارت ہے اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو اور فارسی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو خطوط بھی لکھے جو شگفتہ نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط بے تکلفی اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں سادگی، دل کشی اور ادبی حسن نمایاں ہے۔ ان کے خطوط میں سماجی معاملات اور ذاتی تجربات کا خوب صورت عکس ملتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں غالبؔ نے اپنے دوست مرزا ہرگوپال تفتہؔ کو نواب مصطفیٰ خان کی آمد کی اطلاع دی ہے۔

غالب کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور خاص طور پر مسلمانوں کو بہت زیادہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور غالب کی مجلسی زندگی بھی تباہ ہو گئی اور ان کے دوست احباب دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ اب غالبؔ کے پاس جدائیوں کا غم غلط کرنے کے لیے واحد سہارا خطوط کا رہ گیا تھا۔

غالبؔ نے برصغیر اور خاص طور پر دہلی کے چشم دید واقعات دوستوں کو لکھے ہیں۔ چناں چہ غالبؔ کے خطوط دو حیثیتوں سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک ادبی لحاظ سے کیوں کہ غالبؔ سے قبل اُردو نثر میں بڑی بھاری، ثقیل، مسجع ومقفیٰ عبارت آرائی کا التزام کیا جاتا تھا۔ غالب نے نثر میں سادہ نویسی کو رواج دیا۔ دوسری غالبؔ کے خطوط کی تاریخی حیثیت ہے۔ غالب نے اپنے دور کے حالات وواقعات کو ہو بہو تحریر کیا ہے۔ کسی مبالغہ آرائی کا سہارا نہیں لیا۔ غالب اپنے دوست احباب کو زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھتے تھے، اس لیے ہر معمولی بات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ بقول ڈیل کارنیگی:

"سچے دوست دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتے ہیں۔"

تشریح طلب عبارت مرزا تفتہؔ کو تحریر کیے گئے خط کی آخری عبارت ہے۔ جس کے آغاز میں مرزا غالب نے تین اہم شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ میر بادشاہ پیشے کے لحاظ سے جج تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ غالب کے واقف کار تھے۔ میر قاسم علی بھی مرزا غالب کے جاننے والے اور پیشے کے لحاظ سے جج تھے۔ مرزا تفتہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ مرزا تفتہ فارسی کے اہم شاعر اور غالب کے چہیتے شاگرد تھے۔ میر بادشاہ مرزا تفتہ سے ملاقات کر کے آئے تھے۔ مرزا غالب تفتہ کو بتاتے ہیں کہ وہ میرے پاس آئے تھے جن سے تمھاری خیر وعافیت کی اطلاع ملی تھی۔ مرزا غالب تفتہ کو بتاتے ہیں کہ میر قاسم سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

تشریح طلب عبارت میں غالب نے مرزا تفتہ کو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ وہ بیمار ہیں اور دہلی میں علاج کرانے کی غرض سے آئے ہوئے ہیں۔ اُن سے ایک ملاقات ہوئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ابھی دہلی ہی میں قیام کریں گے۔ حکیم احسن اللہ خان ان کے طبیب خاص ہیں۔ وہ 1852ء سے قبل بہادر شاہ ظفر کے بھی طبیب رہے تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کو نشتر لگا کر رگوں سے خون نکالا اور پھر جسم کا فاسد خون چوسنے کے لیے جونکیں لگائی ہیں۔ پرانے زمانے میں اطبا نے اس طریقۂ علاج کو کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر جوڑوں کے درد کے مریض اس طریقۂ علاج سے شفایاب ہوتے تھے۔ اطبا مریضوں کے کسی بھی مرض کے علاج کا آغاز کرنے سے پہلے جلاب آور دوا دیا کرتے تھے تاکہ معدہ سے فاسد مواد خارج ہو جائے۔ حکیموں کا خیال تھا کہ معدہ کی صفائی کے بعد دوا زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

غالبؔ بتا رہے ہیں کہ نواب صاحب کو بھی جلاب آور دوا دی جا چکی ہے۔ اب اس بات کی فکر ہے کہ معدہ کی صفائی کب ہوتی ہے۔ نواب صاحب کی وجہ سے غالبؔ فکر مند ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ ہر طرح سے خیر وعافیت ہے۔ غالبؔ بتاتے ہیں کہ وہ کمزور بہت ہو گئے ہیں، کیوں کہ بڑھاپا غالب پر غالب آ گیا ہے۔ بڑھاپا بھی اپنے اثرات دکھاتا ہے۔ بڑھاپا جوانی کا جوش وجذبہ، طاقت اور ہمت سب کچھ چھین لیتا ہے۔ غالب کو بڑھاپے نے نڈھال کر دیا ہے۔ بقول فورڈ جیمس:

"ہر خرابی کا تدارک ہو سکتا ہے لیکن بڑھاپے کا کوئی تدارک نہیں"

دوسری وجہ یہ کہ بیمار ہونے کی وجہ سے بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ کوئی نیا شخص یا پر تکلف ملاقاتی آئے تو اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ ورنہ بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ مذکورہ خط بھی غالبؔ نے بستر پر لیٹے ہوئے تحریر کیا ہے اور لیٹے لیٹے لوگوں کی اصلاح کے لیے آئی ہوئی تحریریں دیکھتے رہتے ہیں۔ چناں چہ یہ غالبؔ کی ہمت ہے کہ بیماری اور بڑھاپے کے باوجود بھی دوست احباب کے خطوط کے جوابات لکھتے اور اُن کی نثر اور شاعری کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ بقول غالبؔ:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں

مشقی سوالات

سوال نمبر ۱: مختصر جواب دیں۔

(الف) علاء الدین علائی کے نام خط میں غالب نے کس کس عالم کا ذکر کیا ہے؟

جواب۔ علاء الدین علائی کے نام خط میں غالب نے عالمِ ارواح اور عالمِ آب وگل کا ذکر کیا ہے۔

(ب) غالب کے خیال میں عام قاعدہ کے مطابق عالمِ آب وگل کے مجرم کہاں سزا پاتے ہیں؟

جواب۔ غالب کے خیال میں عام قاعدہ کے مطابق عالمِ آب وگل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔

(ج) بیڑی اور ہتھکڑیوں سے غالب کیا مراد لیتے ہیں؟ وضاحت کریں۔

جواب: غالب نے بیڑی سے مراد بیوی اور ہتھکڑیوں سے مراد غالب کے لے پالک بیٹے زین العابدین خاں عارف کے دو بچے باقر علی خان اور حسن علی خان لیے ہیں، جو ان کی زیر کفالت تھے۔

(د) "کشتی نوح" قواعد کی رو سے کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب۔ "کشتی نوح" قواعد کی رو سے تلمیح ہے۔ حضرت نوحؑ کی بددعا سے دنیا میں پانی کا طوفان آیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو ہدایت کی تھی کہ ایک کشتی بنائیں۔ جب طوفان آئے تو اپنے بیوی بچوں اور ایمان دار لوگوں سمیت اس کشتی میں بیٹھ جائیں۔ جب طوفان آیا تب ساری دنیا غرق ہو گئی، لیکن نوحؑ کی کشتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

(و) مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے گئے خط میں مرزا غالب نے کن برتنوں کا ذکر کیا ہے؟

جواب۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے گئے خط میں مرزا غالب نے لگن، چلمچی اور اگال دان کا ذکر کیا ہے۔

(و) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی بیماری کی کیا صورت حال بیان کی گئی ہے؟

جواب۔ نواب مصطفیٰ خاں احسن اللہ خاں سے علاج کروا رہے تھے۔ فصد ہو چکی تھی، جونکیں لگ چکی تھیں، اب مسہل کی فکر باقی تھی۔

سوال نمبر ۲: درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ خط کا متبادل لفظ ہے:

الف۔ مراسلہ ب۔ خریطہ ج۔ قلم د۔ کاغذ

۲۔ **"جانِ غالب! تم تو ثمر نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو ونما پائی ہے۔" غالب نے یہ جملہ لکھا:**

الف۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ب۔ علاء الدین علائی کے نام

ج۔ نواب مصطفیٰ خاں کے نام د۔ میر قاسم علی کے نام

۳۔ خط کے مطابق علاء الدین علائی کا مسکن ہے:

الف۔ دہلی ب۔ لوہارو ج۔ لکھنو د۔ رام پور

۴۔ غالب نے اپنے آپ کو گناہ گار کہا ہے:
الف۔ عالمِ ارواح کا ب۔ عالمِ آب وگل کا ج۔ عالمِ برزخ کا د۔ عالمِ بالا کا

۵۔ مرزا ہرگوپال تفتہ نے غالب کو اصلاح کے لیے بھیجا:
الف۔ قصیدے ب۔ غزلیں ج۔ مرثیے د۔ حمدیں اور نعتیں

جوابات

۱	مراسلہ	۲	علاء الدین علائی کے نام	۳	لوہارو	۴	عالمِ ارواح کا	۵	قصیدے

سوال نمبر:۳۔ درج ذیل الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیں۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
زائل ہونا	دور ہونا، معدوم ہونا	احتمال	اندیشہ، امکان	حبس	قید خانہ، زندان	مسموع	سنا گیا
مسودہ	ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر	بلادِ شرقیہ	مشرقی علاقہ جات	فصد	نشتر لگا کر رگ سے خون نکالنا		

سوال نمبر:۴۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ میرا عذر..... مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو۔
۲۔ دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس..... میں ڈال دیا۔
۳۔ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں..... کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔
۴۔ میں بھی بعد نجات سید حاعالم..... کو چلا جاؤں گا۔
۵۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا..... ہوں۔

جوابات

۱	زنہار	۲	زندان	۳	روبکاری	۴	ارواح	۵	صاحب فراش

سوال نمبر:۵۔ کالم "الف" میں دیے گئے الفاظ کو کالم "ب" کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج) جوابات
ہجر	آواز	وصال
زمزمہ	نثر	پرواز
خوش	نالے	آواز
نظم	زندان	نثر
ندی	پرواز	نالے
ہتھکڑی	وصال	زندان

سوال نمبر:۶۔ طلبہ باہمی گفت وشنید سے درج ذیل بیانات میں سے درست اور غلط کی نشان دہی کریں۔

نمبر	جملے	درست	غلط
۱	غالب نے لکھا کہ میں تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔	درست	
۲	"جانِ غالب! تم تو ثمرِ نورس ہو۔" غالب کے یہ الفاظ مرزا تفتہ کے لیے ہیں۔		غلط
۳	نواب مصطفیٰ خاں، احسن اللہ خاں کے معالج تھے۔		غلط
۴	"خطوطِ غالب" مولانا غلام رسول مہر کی مرتبہ کتاب ہے۔	درست	

سوال نمبر:۷۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

جدید سائنسی ایجادات نے مواصلات کے نظام میں ان گنت تبدیلیاں برپا کر دی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیلی فون، موبائل فون،

فیکس اور انٹرنیٹ، وہ ایجادات ہیں جن کے سبب ہم ساری دنیا کو اپنے سامنے موجود پاتے ہیں۔ اب یہ ممکن ہو چکا ہے کہ ہم کسی بھی وقت اور کسی جگہ ہزاروں میل دور بیٹھے کسی بھی شخص کو براہِ راست دیکھ سکتے ہیں اور اس سے گفت گو کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پرائی میل کے ذریعے چند سیکنڈ میں ہزاروں کلو میٹر دور دوستوں کو پیغامات، مضامین، کہانیاں، اسباق اور اشعار وغیرہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں موبائل فون سے بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا کام لیا جا رہا ہے۔ طلبہ کمپیوٹر کو سامنے رکھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے کسی بھی تعلیمی ادارے، کسی بھی شعبہ تعلیم اور کسی بھی کتاب کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سہولیات نے ہمارے درس وتدریس کے نظام کو بہت مؤثر، علاج معالجے کی مستند معلومات کی فراہمی کو آسان اور معلومات عامہ تک عام آدمی کی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے۔

سوالات:

۱۔ **عبارت کے حوالے سے بتائیں کہ کن سائنسی ایجادات کا تعلق مواصلات کے نظام سے ہے؟**
جواب۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیلی فون، موبائل فون، فیکس اور انٹرنیٹ جیسی سائنسی ایجادات کا تعلق مواصلات کے نظام سے ہے۔

۲۔ **انٹرنیٹ کے کیا فوائد ہیں؟**
جواب۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ہم ہزاروں میل دور دوستوں کو پیغامات، مضامین، کہانیاں اور اشعار وغیرہ بھیج سکتے ہیں۔

۳۔ **موجودہ دور میں موبائل فون سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے؟**
جواب۔ موجودہ دور میں موبائل فون سے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

۴۔ **عبارت میں جدید مواصلاتی سہولیات سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے کن دو اہم شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے؟**
جواب۔ عبارت میں جدید مواصلاتی سہولیات سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے تعلیم اور صحت کے شعبے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۵۔ **اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں؟**
جواب۔ جدید ذرائع مواصلات

۱۔ حروف ندائیہ وفجائیہ (!): ندائیہ اور فجائیہ کے جملوں کے لیے اگرچہ ایک ہی علامت (!) استعمال ہوتی ہے لیکن دونوں کے جملے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲۔ ندائیہ (!): ندائیہ کا لفظ ندا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آواز دینا، پکارنا، مخاطب کرنا، بلانا وغیرہ۔ مثلاً:
الف۔ ارے لڑکے! میری بات سنو۔ ب۔ سبزی والے! ذرا رکنا۔
ج۔ حضرات! ایک ضروری اعلان سنیے۔ د۔ عزیز طلبہ! آج ہم حکایاتِ سعدیؒ کے متعلق گفت گو کریں گے۔

فجائیہ:(!) فجائیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں اچانک، فوراً اور یکا یک وغیرہ۔ اردو زبان میں جب کسی جوش، غم وغصے، حیرت و تعجب، نفرت، خوف، تمنا، تحسین یا تحقیر جیسے کسی جذبے کا اظہار کیا جائے تو ایسے جملے یا لفظ کے بعد (!) کی علامت استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً:
الف۔ حروف تاسف: افسوس! اس نے میری قدر نہ کی۔
ب۔ حروف تعجب: سبحان اللہ! کتنا سہانا موسم ہے۔
ج۔ حروف نفرین: لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ! میں نے آج یہ کس کی صورت دیکھ لی۔
د۔ حروف تمنا: کاش! تم نے محنت کی ہوتی۔
و۔ حروف تحسین: واہ واہ! کیا کارکردگی دکھائی آپ نے۔

سوال نمبر:۸۔ طلبہ مکاتیب غالب کے زیرِ عنوان دونوں خطوط توجہ سے پڑھیں اور ندائیہ وفجائیہ حروف تلاش کر کے اپنی نوٹ بک میں درج کریں۔
جواب۔ سنو! اللہ اللہ! جانِ غالب!

سوال نمبر:۹۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں اور حوالہ متن بھی درج کریں۔
۱۔ "فکر نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔۔۔۔۔۔ سیدحا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔"
۲۔ میر بادشاہ میرے پاس آئے۔۔۔۔۔۔۔۔ مسوّدات دیکھتا ہوں۔ اللہ! اللہ!
جواب۔ دیکھیے نثر پاروں کی تشریح

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1 مرزا غالب پیدا ہوئے:
(الف) 27 دسمبر 1795ء (ب) 27 دسمبر 1797ء (ج) 27 دسمبر 1799ء (د) 27 دسمبر 1800ء (ب)

2 مرزا غالب پیدا ہُوئے۔
(الف) دہلی میں (ب) لکھنؤ میں (ج) امرتسر میں (د) آگرہ میں (د)

3 مرزا غالبؔ کے والد کا نام ہے:
(الف) مرزا عبداللہ بیگ (ب) مرزا نصراللہ بیگ (ج) مرزا فرحت اللہ بیگ (د) مرزا عبیداللہ بیگ (الف)

4 مرزا غالبؔ کے والد کی وفات ہوئی، اس وقت غالب کی عمر تھی:
(الف) 3 سال (ب) 5 سال (ج) 7 سال (د) 9 سال (ب)

5 مرزا غالبؔ کے والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش کی:
(الف) مرزا عبیداللہ خاں نے (ب) مرزا نصیراللہ بیگ خاں نے (ج) مرزا نسیم اللہ بیگ خاں نے (د) مرزا نصراللہ بیگ خاں نے (د)

6۔ مرزا اسداللہ خاں کو گھر پر پکارتے تھے:
(الف) مرزا شہ زور کے نام سے (ب) مرزا نوشہ کے نام سے (ج) مرزا انوشہ کے نام سے (د) مرزا ببروز کے نام سے (ب)

7 مرزا غالبؔ پہلے نقص لکھتے تھے:
(الف) اسد (ب) غالب (ج) نوشہ (د) انوشہ (الف)

8 مرزا غالبؔ نسلاً تھے:
(الف) ایبک منگول (ب) ایبک ترک (ج) ایبک مغل (د) ایبک غوری (ب)

9 عبداللہ بیگ تھے:
(الف) سپاہی پیشہ (ب) تاجر (ج) کسان (د) فوجی (الف)

10 مرزا غالبؔ فخر کیا کرتے تھے:
(الف) اپنی اُردو شاعری پر (ب) اپنی اُردو نثر پر (ج) اپنی فارسی شاعر پر (د) اپنی اُردو اور فارسی شاعری پر (ج)

11 مرزا غالبؔ کے چچا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کی پرورش کی:
(الف) دادا (ب) ؟؟ (ج) ماموں (د) خالو (ب)

12 مرزا نصراللہ بیگ خاں صوبے دار تھے:
(الف) دہلی کے (ب) لکھنؤ کے (ج) کلکتہ کے (د) آگرہ کے (د)

13 مرزا نصراللہ بیگ نے وفات پائی:
(الف) 1806 میں (ب) 1807ء میں (ج) 1808ء میں (د) 1809ء میں (الف)

14 مرزا غالبؔ کی شادی الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی ہوئی، اس وقت اُن کی عمر تھی:
(الف) بارہ برس (ب) تیرہ برس (ج) چودہ برس (د) پندرہ برس (ب)

15 مرزا غالبؔ دربار دلی سے منسلک ہوئے:
(الف) 1840 میں (ب) 1845ء میں (ج) 1850ء میں (د) 1855ء میں (ج)

16۔ مرزا غالبؔ فوت ہوئے:
(الف) 15 فروری 1860ء میں (ب) 15۔فروری 1863ء میں
(ج) 15 فروری 1866ء میں (د) 15۔فروری 1869ء میں (د)

17۔ مرزا غالب فوت ہوئے:
(الف) آگرہ میں (ب) دہلی میں (ج) لکھنو میں (د) امرتسر میں (ب)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

خط نمبر 1

1۔ سبق "مکاتیب غالبؔ" کا ماخذ ہے:
(الف) قاطع برہان (ب) گل رعنا (ج) خطوط غالب (د) عود ہندی (ج)

2۔ مرزا غالب کا شامل نصاب پہلا خط ہے:
(الف) غلام مصطفیٰ شیفتہ کے نام (ب) مرزا تفتہ کے نام
(ج) علاء الدین علائی کے نام (د) میر مہدی مجروح کے نام (ج)

3۔ مرزا غالب نے علاء الدین علائی کو خط لکھا تھا:
(الف) جون 1860ء کو (ب) جون 1861ء کو (ج) جون 1862ء کو (د) جون 1863ء کو (ب)

4۔ مرزا غالب نے علاء الدین علائی کو مخاطب کیا ہے:
(الف) علائی صاحب (ب) بھائی صاحب (ج) نواب صاحب (د) جانِ غالب (د)

5۔ بقول غالب "ثمر نورس" ہے:
(الف) میر مہدی حسین مجروح (ب) علاء الدین علائی (ج) مرزا تفتہ (د) غلام مصطفیٰ شیفتہ (ب)

6۔ "ثمر نورس" کا معنی ہے:
(الف) موسم کا پھل (ب) تازہ کچا پھل (ج) تازہ پکا ہوا پھل (د) باسی پھل (ج)

7۔ "ثمر نورس" سے مجازاً مراد ہے:
(الف) نوجوان اولاد (ب) نوجوان بھائی (ج) نوجوان نسل (د) نوجوان لڑکے (الف)

8۔ نہال کے معنی ہے:
(الف) آم کا درخت (ب) مالٹے کا درخت (ج) انار کا درخت (د) پھل دار درخت (د)

9۔ "نہال" سے مجازاً مراد ہے:
(الف) بھائی (ب) والد (ج) چچا (د) ماموں (ب)

10۔ بقول غالب "نہال" ہے:
(الف) امین الدین احمد خاں (ب) ضیاء الدین احمد خاں نیر (ج) میر مہدی حسین مجروح (د) علاء الدین علائی (الف)

11۔ تم تو ثمر نورس ہو، اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے:
(الف) تعلیم حاصل کی (ب) ملازمت کی (ج) نشو و نما پائی (د) رہائی پائی (ج)

12۔ میں ہوا خواہ و سایہ نشین رہا ہوں:
(الف) گھر کا (ب) نہال کا (ج) درخت کا (د) سائبان کا (ب)

13۔ بقول مرزا غالب دید و ادید کی صورتیں ہیں:
(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ (الف)

14۔ مرزا غالب علائی کو بتاتے ہیں کہ دید و ادید کی دو صورتیں ہیں:
(الف) دلی آوَیا لکھنو (ب) دلی آوَیا کلکتہ (ج) دلی آوَیا لوہارو (د) دلی آوَیا اتر پردیش (ج)

15۔ بقول مرزا غالب عالَم ہیں:
(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ (الف)

16۔ عالمِ ارواح اور عالمِ آب و گل کا مالک ہے:
(الف) حضرت جبرائیل علیہ السلام (ب) حضرت میکائیل علیہ السلام
(ج) حضرت اسرافیل علیہ السلام (د) اللہ تعالیٰ (د)

17۔ قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم سزا پاتے ہیں:
(الف) عالمِ فانی میں (ب) عالمِ بالا میں (ج) عالمِ ارواح میں (د) عالمِ روحانی میں (ج)

18۔ غالب کہتے ہیں کہ عالمِ ارواح کے گناہ گار کو سزا دی جاتی ہے:
(الف) آخرت میں (ب) دنیا میں (ج) قبر میں (د) حشر میں (ب)

19۔ بقول غالب انھیں روبکاری کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا:
(الف) آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو (ب) نویں رجب ۱۲۱۳ھ کو
(ج) دسویں رجب ۱۲۱۴ھ کو (د) گیارھویں رجب ۱۲۱۵ھ کو (الف)

20۔ روبکاری کے معنی ہیں:
(الف) روبرو ہونا (ب) سزا پانا (ج) مقدمے کی پیشی (د) عمر قید ہونا (ج)

21۔ غالب بتاتے ہیں کہ وہ حوالات میں رہے:
(الف) دس سال (ب) گیارہ سال (ج) بارہ سال (د) تیرہ سال (د)

22۔ غالب کے لیے حکمِ حبسِ دوام صادر ہُوا:
(الف) ۷۔رجب ۱۲۲۰ھ کو (ب) ۷۔رجب ۱۲۲۵ھ کو (ج) ۷۔رجب ۱۲۳۰ھ کو (د) ۷۔رجب ۱۲۳۵ھ کو (ب)

23۔ حبسِ دوام کے معنی ہیں:
(الف) مقدمے کی پیشی (ب) مقدمے کا فیصلہ (ج) مقدمے کی کارروائی (د) عمر قید (د)

24۔ غالب حبسِ دوام یعنی عمر قید قرار دیتے ہیں:
(الف) ملازمت کو (ب) نظم ونثر کو (ج) زندگی کو (د) غلامی کو (ج)

25۔ غالب کے پاؤں میں بیڑی ڈال دی گئی:
(الف) ایک (ب) دو (ج) تین (د) چار (الف)

26۔ غالب پاؤں کی بیڑی قرار دیتے ہیں:
(الف) اولاد کو (ب) ملازمت کو (ج) بیوی کو (د) شاعری کو (ج)

27۔ بقول غالب ان کے لیے زندان مقرر ہوا:
(الف) کلکتہ (ب) دہلی (ج) لکھنو (د) میرٹھ (ب)

28۔ زندان کہتے ہیں:
(الف) قید خانے کو (ب) عمر قید کو (ج) زندگی کو (د) موت کو (الف)

29۔ غالب کے لیے نظم ونثر کو بطور سزا ٹھہرایا گیا:
(الف) آسان (ب) دشوار (ج) مشقت (د) مشکل (ج)

30۔ غالب بلاد شرقیہ میں پھرتے رہے:
(الف) دو برس (ب) تین برس (ج) چار برس (د) پانچ برس (ب)

31۔ آخر کار غالب کو پکڑ لائے:
(الف) لکھنو سے (ب) بنارس سے (ج) کلکتہ سے (د) بمبئی سے (ج)

32۔ دو جھڑیوں سے مُراد ہے:
(الف) عارف کے دو بچے (ب) شیفتہ کے دو بچے (ج) تفتہ کے دو بچے (د) نیّر کے دو بچے (الف)

33۔ غالب کے لے پالک بیٹے تھے:
(الف) شیفتہ (ب) نیّر (ج) علائی (د) عارف (د)

34۔ عارف کے بچوں کے نام ہیں:
(الف) علی نقی اور علی متقی (ب) باقر حسین اور سجاد حسین (ج) باقر علی خاں اور حسن علی خاں (د) احمد رضا اور حسن رضا (ج)

35۔ غالب میرٹھ اور مُرادآباد ہوتے ہوئے پہنچے:
(الف) لکھنو (ب) رام پور (ج) کلکتہ (د) دہلی (ب)

36۔ غالب نے عالمِ آب وگل سے عالمِ ارواح کی طرف روانگی بتائی ہے:
(الف) ذی الحجہ ۱۲۷۰ (ب) ۱۲۷۲ھ کو (ج) ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو (د) ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ کو (د)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

خط نمبر 2

1۔ غالب کا دوسرا خط نام ہے:
(الف) سید مہدی حسین مجروح (ب) مرزا ہرگوپال تفتہ (ج) نواب ضیاء الدین احمد خان نیر (د) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (ب)

2۔ ہرگوپال تفتہ نے غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھجوائے تھے:
(الف) غزلیں (ب) مرثیے (ج) قصیدے (د) نظمیں (ج)

3۔ غزلیات اصلاح کے لیے غالب کے پاس بھجوائی تھیں:
(الف) مرزا تفتہ نے (ب) میر مہدی حسین مجروح نے (ج) نواب شیفتہ نے (د) نواب ضیاء الدین نیر نے (د)

4۔ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر کا غالب سے رشتہ تھا:
(الف) بیوی کا بھتیجا بھائی (ب) بیوی کا ماموں زاد بھائی (ج) بیوی کا پھوپھی زاد بھائی (د) بیوی کا سگا بھائی (الف)

5۔ غالب رہتے تھے:
(الف) ذاتی مکان میں (ب) بھائی کے مکان میں رہتے تھے
(ج) کرائے کے مکان میں رہتے تھے (د) دوست کے مکان میں رہتے تھے (ج)

6۔ غالب کے مالک مکان کا نام تھا:
(الف) حکیم اجمل خان (ب) حکیم پٹیالے والے کا بھائی (ج) حکیم افضل خان (د) حکیم اختر خان (ب)

7۔ دلی میں بارشیں شروع ہوئی تھیں:
(الف) جولائی 1864ء (ب) جولائی 1866ء (ج) جولائی 1868ء (د) جولائی 1870ء (الف)

8۔ شہر میں سیکڑوں مکان گر گئے تھے:
(الف) آندھی کی وجہ سے (ب) سیلاب کی وجہ سے (ج) زلزلے کی وجہ سے (د) زیادہ بارش کی وجہ سے (د)

9۔ مکان کی اس حالت کو غالب نے تشبیہ دی ہے:
(الف) آتش نمرود سے (ب) کشتی نوح سے (ج) تختِ سلیمان سے (د) خانہ فرہاد سے (ب)

10۔ غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں تلمیح استعمال کی ہے:
(الف) تخت سلیمان (ب) آتش نمرود (ج) ابن مریم (د) کشتی نوح (د)

11۔ نواب مصطفیٰ خاں آئے تھے:
(الف) دہلی (ب) کلکتہ (ج) لکھنؤ (د) میرٹھ (الف)

12۔ نواب مصطفیٰ خان علاج کرا رہے تھے:
(الف) حکیم اجمل خان (ب) حکیم احسن اللہ خان (ج) حکیم سعید (د) حکیم پٹیالے والا (ب)

13۔ غالب نے مرزا تفتہ کو اپنے بارے میں بتایا ہے:
(الف) مصروف ہوں (ب) بیمار ہوں (ج) خط لکھ رہا ہوں (د) غزل لکھ رہا ہوں (ب)

14۔ سبق "مکاتیب غالب" کا ماخذ.....ہے:
(الف) گل رعنا (ب) اردوئے معلیٰ (ج) خطوط غالب (د) عود ہندی (ج)

15۔ صاحب فراش ہوتے ہوئے غالب مسودات دیکھتے:
(الف) لیٹے لیٹے (ب) بیٹھ کر (ج) کھڑے ہو کر (د) چل پھر کر (الف)

16۔ نواب صاحب نے غالب کو اصلاح کے واسطے بھیج رکھا تھا:
(الف) غزلیں (ب) نظمیں (ج) قصائد (د) مرثیے (الف)

17۔ غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کو خط لکھا:
(الف) بدھ کو (ب) جمعرات کو (ج) جمعہ کو (د) ہفتہ کو (ج)

18۔ غالب کو کشتی نوح میں رہنے کا اتفاق ہوا:
(الف) دو مہینے (ب) ایک ماہ (ج) پانچ مہینے (د) تین مہینے (د)

19۔ مرزا غالب نے اپنے خط میں مرزا ہرگوپال کو مخاطب کیا ہے:
(الف) مرزا صاحب! (ب) بھائی تفتہ! (ج) بھائی! (د) تفتہ صاحب (ج)

20۔ نصاب میں شامل "مکاتیب غالب" مرتب کردہ ہیں:
(الف) شیخ عقیل (ب) وارث علوی (ج) ڈاکٹر معین الرحمٰن (د) غلام رسول مہر (د)

سبق:٦

ایک استاد عدالت کہ کٹہرے میں

مصنف
اشفاق احمد
(1925-2004)

مصنف کا تعارف

اشفاق احمد خاں؛ المعروف بہ تلقین شاہ ہوشیار پور (مشرقی پنجاب، انڈیا) کے ایک چھوٹے سے گاؤں خان پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد خاں ہے جو محکمہ لائیو سٹاک میں ڈاکٹر تھے۔ میٹرک فیروز پور کے نواحی قصبے مکستر اور ایف۔ اے، بی۔ اے کے امتحانات فیروز پور سے پاس کیے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تو آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے اُردو کیا۔

اشفاق احمد بحیثیت پروفیسر، دیال سنگھ کالج لاہور، روم یونی ورسٹی اٹلی اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے بحیثیت ڈائریکٹر مرکزی اُردو بورڈ میں فرائضِ منصبی سنبھال لیے اور ادارے کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اس طرح انھوں نے علمی و ادبی سطح پر بھرپور زندگی بسر کی۔

اشفاق احمد؛ بیسویں صدی کے ادبی اُفق پر افسانہ نگار، ڈراما نویس، سفرنامہ نگار، نقاد، فیچر نگار، مترجم، محقق، شاعر، فلسفی اور دانش ور کی حیثیت سے اُبھرے۔ وہ بنیادی طور پر قصہ گو ادیب اور کہانی نویس تھے۔ اُن کی مختلف النوع تخلیقی جہات میں کہانی کی مختلف اشکال ظہور پذیر ہوئیں۔ اُن کی قصہ گوئی اور جادو بیانی کا مظہر اُن کا مقبول ٹیلی وژن پروگرام ''زاویہ'' تھا جس میں وہ بصیرت افروز گفتگو کرتے اور نوجوانوں کی فکری راہ نمائی کا فرض نبھاتے۔ انھوں نے پچاس کے قریب کتابیں تصنیف کیں جو ان کے سہل، رواں اور بے تکلف اندازِ بیان کی عکاس ہیں۔ ان کا لب و لہجہ منفرد اور شیرینیِ گفتار سے بھرپور ہے۔ انھیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ''تمغہ برائے حسنِ کارکردگی''، ''ستارۂ امتیاز'' اور ''ہلالِ امتیاز'' کے قومی اعزازات سے نوازا گیا۔

تصانیف:

اشفاق احمد کی معروف تصانیف میں ''ایک محبت سو افسانے''، ''سفرِ مینا''، ''اُجلے پھول''، ''من چلے کا سودا''، ''حیرت کدہ''، ''ننگے پاؤں''، ''تلقین شاہ''، ''تابلی تھلے''، ''اُچے بُرج لاہور دے''، ''توتا کہانی''، ''زاویہ'' (ٹیلی وژن سیریز)، ''کھٹیا وٹیا'' اور ''سفر در سفر'' وغیرہ ہیں۔

- ☆ طلبہ کو پاکستانی اور عالمی ثقافت سے متعارف کرانا۔
- ☆ طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا۔
- ☆ طلبہ کو اشفاق احمد اور ان جیسے مشاہیر کی زندگی کے تجربات سے سبق حاصل کرنے کی تربیت کرنا۔
- ☆ طلبہ میں اُردو ادب کے مختلف اور منفرد اسالیب بیان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- ☆ متشابہ الفاظ کی شناخت کرنا اور محاوروں سے جملے بنانا۔
- ☆ طلبہ کو تحریک دینا کہ وہ بھی اپنی تخلیقات پیش کریں۔

مشکل الفاظ کے معانی

تمبر 37 براڈ کاسٹنگ: (نشر کرنا، پھیلانا، عام کرنا)، قیلولہ: (کھانا کھانے کے بعد لیٹنا، دوپہر کو کھانے کے بعد آرام کرنا، دوپہر کا سونا)، کارپوریشن: (بڑے شہروں میں شہری انتظام کا ادارہ، میونسپلٹی یا میونسپل کمیٹی سے زیادہ بڑا اور با اختیار ادارہ)، حوض: (پانی جمع کرنے کی جگہ جو زمین میں بنائی جائے، چھوٹا تالاب)، خوش گوار: (دل کش، سہانا، خوب صورت، وہ چیز جس کے کھانے سے طبیعت خوش ہو، مزیدار، خوش ذائقہ)، اِکّا دُکّا: (اکیلا، تنہا، جس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو، کوئی کوئی، ایک آدھ، بہت کم)، دائرہ:

(حلقہ، مرکز، گھیرا، چکر)، بے ہودہ بات: (غیر مہذب گفتگو، فضول بات)، ولایت: (یورپ، انگلستان)، رواج: (کسی بات کا عام چلن، دستور، رائج یا جاری ہونا، رسم)، چالان ہونا: (قانون کی خلاف ورزی پر عدالت میں حاضر ہونے کا حکم ملنا)، تھر تھر کانپنا: (خوف یا غصے وغیرہ یا بخار یا سردی سے کپکپانا)

تمبر 38 منی آرڈر: (وہ روپیہ جو ڈاک کے ذریعے سے بھیجا جاتا ہے)، کچہری: (وہ جگہ یا عمارت جہاں حاکم بیٹھ کر انصاف کرتا ہے۔ عدالت)، دھکے کھانا: (مارا مارا پھرنا، دھکے سہنا، دکھ سہنا)، لینڈ لیڈی: (لینڈ لارڈ کی بیوی، زمیندارنی، زمین دار کی بیوی)، محلے داری: (ایک ہی محلے کا رہنے والا)، برخوردار: (بیٹا، اقبال مند، زندگی کا پھل کھانے والا)، لااُبالی: (بے پروا، بے فکر، غافل)، تار: (تار برقی، ٹیلی گراف، برقی تار کے ذریعے آنے والی خبر، ٹیلی گرام، برقی پیغام)، چوراہا: (وہ جگہ جہاں چاروں اطراف سے آنے والے راستے ملتے ہیں)، حکم عدولی: (فرمان سے سرتابی، حکم سے روگردانی، نافرمانی، کسی حکم کو ماننے سے انکار کرنا)، کوتاہی: (کمی، خامی، چھوٹا ہونا، بے پروائی، غفلت)، ہوش گم ہونا: (حواس باختہ ہونا، گھبرا جانا)، دیارِ غیر: (دوسرا ملک، انجان جگہ، پردیس)، حامی: (حمایتی، مددگار)، ناصر: (معاون، مدد کرنے والا، حامی، جمع انصار)، وکیل: (ایک ایسا شخص جو دوسرے شخص کی جگہ عمل یا اُس کی نمائندگی (وکالت) کرتا ہو)، پیچیدہ: (کٹھن، وقت طلب، اُلجھا ہوا، مشکل، دشوار گزار)، وسیع و عریض: (جو بہت لمبائی اور چوڑائی رکھتا ہو، بہت لمبا چوڑا، بہت وسیع، کشادہ)

تمبر 39 خوف زدہ: (ڈرا ہوا، سہا ہوا)، کانپنا: (خوف کھانا، لرزنا، تھرتھرانا، ٹھنڈ وغیرہ کی وجہ سے جسم میں کپکپی پیدا ہونا)، جرأت: (بہادری، دلیری، شجاعت، مردانگی، حوصلہ، ہمت)، تشنج: (ایک بیماری جس میں جسم اکڑ جاتا ہے)، ضائع: (اکارت، رائیگاں، برباد، بے فائدہ)، کڑی: (سخت، بہت زیادہ)، آداب: (دستور، قاعدہ یا قاعدے، طور طریقے)، واقف: (جاننے والا، شناسا، آگاہ)، پردیسی: (غیر ملک کا رہنے والا، اجنبی، غیر ملکی)، منشی: (ریکارڈ یا حساب کتاب رکھنے والا، محرر، کلرک)، عمل دار: (اہل کار، حاکم، عامل، تحصیل دار)، معزز: (عزت دار، باوقعت، بزرگ)، براجمان ہونا: (تشریف فرما ہونا، رونق افروز ہونا)، ضابطہ: (آئین، قاعدہ، اصول، دستور)، افسردہ: (بجھا ہوا، اُداس، نڈھال، بجھا بجھا سا)، تکلیف دہ: (تکلیف دینے والا، دکھ پہنچانے والا)، اَلم: (مصیبت، غم، ذہنی کرب جس کا اثر دل و دماغ دونوں پر ہو)، فائق: (فوقیت رکھنے والا، بڑھا ہوا، برتر، ممتاز، اعلیٰ، معزز)، عملہ: (کسی محکمے یا کارخانے وغیرہ کے کارکن یا اِسٹاف، کلرک، منشی)

تمبر 40 عزت افزائی: (آبرو زیادہ کرنا، قدر یا وقعت بڑھانا، مرتبہ زیادہ کرنا)، گریڈ: (درجہ، مرتبہ، تنخواہ یا امتحان میں کامیابی وغیرہ کی درجہ بندی)، ریکٹر: (ناظم، حاکم)، بیوروکریٹ: (افسران)، فیوڈل: (جاگیردارانہ نظام، جاگیریت کا نظام یا اصول)، کم تر: (حقیر، بہت تھوڑا، کم حیثیت)، سقراط: (ایک یونانی فلسفی کا نام)، کھنڈر: (ٹوٹا پھوٹا مکان، ویران مکان، ویرانہ، ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے نشان، کسی اُجڑی ہوئی بستی کے آثار)، فورم: (عوامی اجتماع، عوامی جرگہ، بحث مباحثے کی جگہ)، باس: (مالک، افسر)

توضیحات

کٹہرا: لکڑی کا وہ جنگلا جو عدالت میں ہوتا ہے اور دورانِ جرح ملزم کو اور گواہوں وغیرہ کو اس میں کھڑا کر کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ لکڑی کی بنی ہوئی جالی دار باڑ۔

قیلولہ: کھانا کھانے کے بعد لیٹنا، دوپہر کو کھانے کے بعد آرام کرنا، دوپہر کا سونا۔

کارپوریشن: بڑے شہروں میں شہری انتظام کا ادارہ، میونسپلٹی یا میونسپل کمیٹی سے زیادہ بڑا اور با اختیار ادارہ۔

تار: تار برقی، ٹیلی گراف، برقی تار کے ذریعے آنے والی خبر، ٹیلی گرام، برقی پیغام۔

وکیل: ایک ایسا شخص جو دوسرے شخص کی جگہ عمل یا اُس کی نمائندگی (وکالت) کرتا ہو۔

تشنج: ایک وبائی بیماری ہے جو کسی زخم کے ذریعے کیچڑ اور مٹی میں موجود بیکٹیریا جسم میں داخل ہونے کے باعث ہوتی ہے۔ یہ جرثومے اعصابی نظام کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اس سے متاثرہ شخص کو اپنا منھ کھولنے میں دشواری، جسم سُن پڑ جانے اور جسمانی درد کی تکلیف ہو سکتی ہے۔

بیوروکریٹ: اس اصطلاح کو اٹھارھویں صدی میں فرانس میں وضع کیا گیا، جب بعض افراد کو نوابی خطابات دے کر انھیں سرکاری عہدوں پر فائز کر دیا گیا تھا۔ نپولین کے دورِ حکومت میں سرکاری محکموں کو بیورو کہا جاتا تھا اور سرکاری عہدے داروں کو بیوروکریٹ۔ اردو میں اسے نوکر شاہی بھی کہا جاتا ہے۔

سقراط: دنیائے فلسفہ کا سب سے عظیم اور جلیل المرتبت معلم ہے جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں مغربی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ میلادِ مسیح سے 470 سال پہلے یونان کے معروف شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تحریری شواہد ناپید ہیں۔ تاہم افلاطون اور مابعد فلاسفہ کے حوالے بتاتے ہیں کہ وہ ایک مجسمہ ساز تھا، جس نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر کئی یونانی جنگوں میں حصہ لیا اور دادِ شجاعت پائی۔ تاہم اپنی علمی مساعی کی بدولت اُسے گھر بار اور خاندان سے تعلق نہ تھا۔ احباب میں اس کی حیثیت ایک اخلاقی و روحانی بزرگ کی سی تھی۔ فطرتاً سقراط، نہایت اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا حامل، حق پرست اور منصف مزاج استاد تھا۔ اپنی اسی حق پرستانہ فطرت اور مسلسل غور و فکر کے باعث اخیر عمر میں اس نے دیوتاؤں کے حقیقی وجود سے انکار کر دیا، جس کی پاداش میں جمہوریہ ایتھنز کی عدالت نے 399 قبل مسیح میں اسے موت کی سزا سنائی اور سقراط نے حق کی خاطر زہر کا پیالہ پی لیا۔ روایات کے مطابق اس نے ''پائزن آف ہام لاک'' نامی زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کی تھی۔

کھنڈر: ٹوٹا پھوٹا مکان، ویران مکان، ویرانہ، ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے نشان، کسی اُجڑی ہوئی بستی کے آثار۔

سبق کا خلاصہ

میں جس زمانے میں روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھا، میں وہاں کا سب سے کم عمر پروفیسر تھا۔ یونی ورسٹی میں چھٹیاں تھیں۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن پر مجھے اردو براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ روم میں دوپہر کے وقت سب قیلولہ کرتے تھے۔ اس لیے سڑکیں خالی تھیں اور کارپوریشن نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ دوپہر کے وقت سڑکیں پانی سے دھوئی جاتیں۔ سڑک پر رش نہ ہونے کی وجہ سے میں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور میرا چالان ہو گیا۔ سپاہی نے پہلے مجھے سلیوٹ مارا، پھر پرچی پھاڑ کر مجھے دی۔ وہاں چالان ادا کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ کسی بھی قریبی ڈاک خانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کروا دیں۔ وہاں کچہری نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔

میں جب چالان کروا کر آیا تو آ کر اپنی لینڈ لیڈی سے کہا کہ میرا چالان ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنی بیٹی اور ساس کو بتایا۔ سب روتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ انھوں نے مجھے منع کیا کہ میں اس کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ کیوں کہ روم میں اسے ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ مصروفیت اور لاپروائی کے باعث میں چالان وقت پر جمع نہ کرا سکا۔ ایک دن شام کے وقت مجھے ایک تار ملا کہ محترمی جناب پروفیسر صاحب! فلاں فلاں مقام پر آپ کا چالان ہوا تھا۔ براہِ مہربانی اسے جمع کروا دیں، نہیں تو ہمیں افسوس ہے کہ کورٹ میں پیش ہونا پڑے گا۔

میں پھر وقت کی تنگی کی وجہ سے چالان ادا نہ کر سکا۔ عدالت سے نوٹس آیا اور مجھے طلب کیا گیا۔ پیلس آف دی جسٹس پہنچے تو مجھے عدالت میں بلوا لیا گیا۔ جج نے قدرے تلخی سے مجھے کٹہرے میں بُلایا اور کہا آپ کا چالان ہوا۔ آپ کو ڈاک خانے میں جمع کرانے کی تاکید کی گئی۔ لیکن آپ نے جمع نہیں کروایا۔ آپ کو معلوم ہے آپ کی وجہ سے عملے کا کتنا وقت ضائع ہوا۔

مصنف لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ میں پردیسی ہوں اور یہاں کے قوانین سے صحیح طرح واقف نہیں۔ جج نے کہا کہ آپ زبان تو ٹھیک ٹھاک بولتے ہیں۔ عدالت پوچھتی ہے کہ آپ کون ہیں؟ آپ کا پیشہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں

استاد ہوں۔ روم یونی ورسٹی میں پروفیسر ہوں۔ یہ سنتے ہی جج نے کرسی چھوڑ دی اور اعلان کیا کہ استاد کٹہرے میں ہے، استاد کٹہرے میں۔ یہ سنتے ہی سب کھڑے ہو گئے اور میرے لیے کرسی لائی گئی۔ جج نے کہا کہ اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان!!! آپ نے ہی ہم کو عدالت اور عدل کا حکم دیا ہے۔ آپ اساتذہ کی بدولت ہم یہاں موجود ہیں۔ عدالت نہایت شرمندگی کے ساتھ، نہایت دکھ کے ساتھ، گہرے الم کے ساتھ آپ کے احترام کو برقرار رکھتے ہوئے فیصلہ سناتی ہے کہ مسلسل تاخیر کے سبب آپ کو چالان دگنا ادا کرنا ہوگا۔ جب میں کٹہرے سے نکل کر نہایت شرمندگی کے ساتھ کورٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو جج، اس کا عملہ، اس کے منشی سارے میرے پیچھے پیچھے "A teacher in the court" کہتے جا رہے تھے۔ وہ مجھے احترام سے رخصت کرنے آئے۔ میں کہوں، میری جان چھوڑ دیں۔ وہ مجھے آگے موٹر تک چھوڑنے آئے۔ جب میں لوٹ کر آیا تو میں سمجھا یا اللہ! میں بڑا معزز آدمی ہوں۔ مجھے لگا کہ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگا۔

میں نے اپنے ریکٹر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تنخواہ اتنی ہی ہے جتنی تمھارے پاکستان میں ہے۔ یہاں استاد کی عزت اس کے مال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے پیشے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہاں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم کے دنوں میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

مرکزی خیال

اس سبق کا مرکزی خیال یہ ہے کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے علم اور محنت بہت ضروری ہیں۔ محنت کے ذریعے انسان ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ استاد کا احترام بے حد ضروری ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جس بھی مقام پر پہنچتا ہے، اس میں اس کے اساتذہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو استاد کی عزت و تکریم کرتی ہیں اور انھیں اپنا آقا سمجھتی ہیں۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق و سباق

مصنف بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ یونی ورسٹی میں چھٹیاں تھیں۔ دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن پر انھیں براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ وہ کام سے واپس آ رہے تھے۔ دوپہر کے وقت سڑک پر رش نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ چالان وقت پر ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت میں بلایا گیا۔ وہ جج کے سامنے پیش ہوئے۔ جیسے ہی جج نے سنا کہ وہ استاد ہیں، اس نے اعلان کر دیا ''استاد کٹہرے میں ہے، استاد کٹہرے میں ہے۔'' جج اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ سب کھڑے ہو گئے، مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔ اب جج کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی اور اس نے کہا کہ نہایت شرمندگی، نہایت دکھ اور گہرے الم کے ساتھ آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ کا چالان دگنا ہو گیا ہے۔ نیز جج صاحبان اور ان کے منشی انھیں گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہاں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

اہم عبارات کی تشریح

عبارت نمبر 1

جس زمانے میں مَیں روم میں لیکچرر تھا، روم یونی ورسٹی میں، مَیں سب سے Youngest پروفیسر تھا۔ یونی ورسٹیوں میں چھٹیاں تھیں، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن مجھے اُردو براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ روم میں دوپہر

کے وقت سب لوگ قیلولہ کرتے تھے۔ چار بجے تک سوتے تھے اور روم کی سڑکیں تقریباً خالی ہوتی تھیں اور کارپوریشن نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ وہ وہاں پر پانی کے حوض لگا کر سڑکیں دھوتے ہیں، اور شام تک سڑکیں ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں، خوش گوار بھی ہو جاتی ہیں، صاف بھی ہو جاتی ہیں؛ تو وہ سڑکوں کو دھو رہے تھے۔ اکا دُکا کوئی ٹریفک کی سواری آجا رہی تھی تو میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا جا رہا تھا۔

حوالۂ متن

سبق کا عنوان: ایک اُستاد عدالت کے کٹہرے میں

مصنف کا نام: اشفاق احمد

ماخذ: زاویہ

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے، جس میں مصنف نے روم کے روزمرہ کے حالات کا ذکر کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ دوپہر کے وقت سڑک پر رش نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ چالان وقت پر ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت بلایا گیا۔ وہ جج کے سامنے پیش ہوئے اور اس کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ اس ملک کے نہیں، روم یونی ورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے یہاں کے قوانین سے واقف نہیں۔ جیسے ہی جج نے سنا کہ وہ استاد ہیں، اس نے اعلان کر دیا ''استاد کٹہرے میں ہے، استاد کٹہرے میں ہے'' جج اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔ اب جج کے لہجے میں نرمی آ گئی اور اس نے کہا کہ آپ کا چالان دگنا ہو گیا ہے۔ نیز جج صاحب اور عدالت کا عملہ انھیں گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ یہاں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں اشفاق احمد روم کے طرزِ زندگی کے ایک خوب صورت پہلو کو بیان کر رہے ہیں۔ وہ 1953ء میں روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے اور ساتھ ہی روم کے ریڈیو اسٹیشن پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔

روم جو آج اٹلی کا دارالحکومت ہے، دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ شہر تقریباً تین ہزار سال پرانی تاریخ رکھتا ہے۔ کبھی یہ شہر رومی سلطنت کا مرکز تھا۔ رومی سلطنت کا شمار دنیا کی طاقت ور ترین سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ رومی تہذیب نے سیاست، فنِ تعمیر، قانون اور شہری زندگی کے اصولوں میں دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ قدیم روم کی گلیاں اور عمارتیں آج بھی اپنے شان دار ماضی کی گواہی دیتی ہیں۔ مصنف اسی تاریخی شہر میں قیام پذیر تھے جہاں صدیوں پرانی تہذیب کے آثار، جدید زندگی کے ساتھ گھل مل چکے تھے۔

عصرِ نو مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

(مظہر امام)

مصنف بتاتے ہیں کہ جب وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے تو ان کا شمار وہاں کے سب سے کم عمر پروفیسرز میں ہوتا تھا۔ یہ ان کے علمی مقام اور قابلیت کی دلیل تھی کہ وہ ایک غیر ملکی یونی ورسٹی میں پڑھا رہے تھے اور وہاں ایک قابلِ عزت مقام بھی رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کے تعلیمی اداروں میں گرمیوں کی طویل چھٹیاں ہوتی تھیں اور پروفیسروں کو کچھ عرصے کے لیے دیگر سرگرمیوں میں مشغول ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔ مصنف کے پاس بھی ان دنوں ایک اضافی ذمہ داری تھی۔ وہ روم کے ریڈیو اسٹیشن پر اردو براڈ کاسٹنگ کیا کرتے تھے اور یہ کام دوپہر کے وقت ہوتا تھا۔

ان دنوں روم میں دوپہر کے وقت ایک خاص طرزِ زندگی اپنایا جاتا تھا۔ وہاں کے لوگ سخت گرمی کے باعث، دوپہر میں آرام کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ ایک عام روایت تھی کہ لوگ دوپہر کے وقت کھانے کے بعد قیلولہ یعنی تھوڑی دیر سو جایا کرتے تھے۔ دوپہر کے وقت کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرنا یا سونا قیلولہ کہلاتا ہے۔ قیلولہ کرنا نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارک ہے۔ احادیث مبارکہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بھی قیلولہ کرتے تھے۔ روم میں بھی لوگ قیلولہ کرتے تھے اس لیے تقریباً چار بجے تک پورا شہر ایک خاموشی میں ڈوبا رہتا تھا۔ یہ معمول محض گھروں تک محدود نہ تھا بلکہ دفتروں، بازاروں اور سڑکوں پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ اس وقت روم کی سڑکوں پر بہت کم لوگ اور گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ یہ ایک ایسا وقت ہوتا تھا جب شہری زندگی اپنی رفتار کم کر لیتی تھی۔

ہے عجیب شہر کی زندگی نہ سفر رہا نہ قیام ہے کہیں کاروبار سی دوپہر کہیں بدمزاج سی شام ہے (بشیر بدر)

دوپہر کے وقت جب روم کی سڑکیں تقریباً خالی ہوتی تھیں تو اس دوران میں شہر کی کارپوریشن ایک نہایت دل چسپ اور منظم کام انجام دیتی تھی۔ کارپوریشن روزانہ دوپہر کے وقت سڑکوں کو دھونے کا اہتمام کرتی تھی۔ یہ شہر کی سڑکوں کی صفائی کا بہترین طریقہ اور موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ اس سے شہر کی فضا بھی خوش گوار ہو جاتی تھی۔ صفائی کے لیے پانی کے حوض سڑکوں پر لگا دیے جاتے اور ان سے سڑکوں پر پانی بہایا جاتا تھا جس سے گرمی کی شدت کم ہو جاتی تھی۔ روم جیسے قدیم شہر میں جہاں گرمی شدید ہوتی تھی، وہاں یہ طریقہ سڑکوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے انتہائی مؤثر ثابت ہوتا تھا۔ اس معمول کے باعث شام کے وقت نہ صرف شہر کی سڑکیں صاف ستھری ہو جاتی تھیں بلکہ ان پر گرمی کی شدت بھی باقی نہیں رہتی تھی۔ ایک خوش گوار ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔

مصنف روزانہ دوپہر کے وقت اپنی گاڑی میں ریڈیو اسٹیشن کی طرف جاتے تھے۔ اس وقت شہر کی ویرانی، دھلتی ہوئی سڑکیں اور خاموشی ان کے لیے ایک منفرد تجربہ تھا۔ گاڑیوں کی آمد ورفت نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت پورا شہر ایک خاص سکون میں ڈوبا ہوتا تھا۔ یہ منظر ایک بڑے شہر کے لیے بہت غیر معمولی بات محسوس ہوتی تھی۔ مصنف جس ماحول اور طرزِ معاشرت کو چھوڑ کر گئے تھے، اس کے مقابلے میں روم کی تہذیب، ان کا صفائی کا نظام، لوگوں کی طرزِ زندگی، روزمرہ کے معمولات اور وقت اور قانون کی پابندی جیسے عناصر ان کے لیے واقعی حیران کن تھے۔ رومی معاشرت کی ترتیب وتنظیم کا یہ مشاہدہ ان کے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

دوپہر کے وقت جب مصنف ریڈیو اسٹیشن سے واپس اپنے گھر کی طرف جاتے تو روزانہ اس عمل کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اس مشاہدے سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ترقی صرف بڑی بڑی عمارتیں بنانے اور جدید ٹیکنالوجی اپنا لینے سے نہیں آتی بلکہ اس کے پیچھے ایک اجتماعی شعور ہوتا ہے، ایک قوم جب اپنی روزمرہ کی عادات میں صفائی، نظم وضبط اور وقت کی پابندی کو شامل کر لیتی ہے تو ترقی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے اجتماعی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔

اشفاق احمد کی یہ تحریر ایک سادہ مگر گہری سوچ پر مبنی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور بیان کرنے کا انداز سادہ اور دل نشیں ہے۔ وہ بظاہر روم کی ایک عام دوپہر کا منظر بیان کر رہے ہیں لیکن وہ اس سے بھی کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ وہ روم کی تہذیبی اقدار کو لطیف انداز میں اجاگر کر رہے ہیں۔ ان کی یہ خاصیت ہے کہ وہ عام سے واقعات میں بھی غیر معمولی سبق تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے روم کی دھلتی ہوئی سڑکیں محض صفائی کا ایک عمل نہیں تھا بلکہ ایک پوری تہذیب کی عکاسی کر رہا تھا۔ بقول ڈاکٹر غلام فرید:

''یہ بات تو بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ تہذیب یافتہ ہونے کی داستان ہزاروں سال پر مشتمل ہے۔''

عبارت نمبر 2

اب دیکھیے انسان کے ساتھ ساتھ ایک دیسی مزاج چلتا ہے، آدمی کہیں بھی چلا جائے، تو مَیں گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گول دائرہ ہے، اس کے اوپر سے میں چکر کاٹ کے آؤں گا۔ پھر میں اپنے گھر کی طرف مڑوں گا تو یہ بڑی بے ہودہ بات ہے۔ بیچ میں سے چلتے ہیں۔ اس وقت کون دیکھتا ہے، دوپہر کا وقت ہے، تو میں بیچ میں سے گزرا۔ وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا، اُس نے مجھے دیکھا، اور اُس نے پروا نہیں کی۔ جانے دیا کہ یہ جا رہا ہے۔ جب میں نے دیکھا شیشے میں سے گردن گھما کے، کچھ مجھے تھوڑا سا

یاد پڑتا ہے کہ میں طنزاً مسکرایا۔ کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر، کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔ میں نے خوشی منانے کے لیے ایک مسکراہٹ کا پھول اس کی طرف پھینکا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس نے میری یہ عزت کی ہے تو اس نے سیٹی بجا کے روک لیا۔ اب وہاں پر سیٹی بجنا موت کے برابر تھا اور رکنا بھی تھا۔ میں رُکا، وہ آگیا، اور آ کے کھڑا ہو گیا۔ پہلے سلیوٹ کیا۔ ولایت میں رواج ہے کہ جب بھی آپ کا چالان کرتے ہیں، آپ کو پکڑنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے آ کر سلیوٹ مارتے ہیں۔ تو اس نے کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جس زمانے وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کے موسم میں یونی ورسٹی بند ہونے کے باعث انھیں ریڈیو اسٹیشن پر اردو میں براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ روم میں دوپہر کے وقت سب لوگ کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے سڑکوں پر ایک اِکا دُکا لوگ ہی نظر آتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرنے پر اُن کا چالان ہو گیا۔ وقت پر چالان ادا نہ کرنے کی صورت میں انھیں عدالت میں بلایا گیا۔ وہ جج کے سامنے پیش ہوئے۔ جج کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ غیر ملکی ہیں اور یہاں روم یونی ورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی سب کھڑے ہو گئے اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔ عدالتی کارروائی کے بعد سب انھیں گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ روم میں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف اپنے اس تجربے کا ذکر کر رہے ہیں جو انھیں روم میں سڑک پر ٹریفک قانون توڑنے کے نتیجے میں ہوا۔ دوپہر کے وقت ویران سڑک دیکھ کر مصنف نے سڑک اس جگہ سے پار کی جہاں سے سڑک پار کرنا منع تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان جہاں بھی جائے، اس کے ساتھ اس کی عادتیں اور سوچنے کا انداز بھی جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی ترقی یافتہ ملک میں ہو یا کسی تہذیب کے مرکز میں، اس کی جبلت اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مصنف کا بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ روم کی صاف ستھری سڑکوں پر تھے مگر ان کے اندر کہیں نہ کہیں وہی دیسی سوچ موجود تھی جو اصول توڑنے اور موقع دیکھ کر فائدہ اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی سوچ اور دیسی مزاج کا اظہار یوں ہوا کہ وہ گاڑی چلا رہے تھے۔ راستہ سیدھا تھا مگر سامنے ایک گول دائرہ تھا۔ اصول یہ تھا کہ دائرے کا پورا چکر کاٹ کر راستہ اختیار کیا جاتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، سڑکیں سنسان تھیں اور کوئی دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ انھوں نے سوچا کہ پورا چکر کاٹ کر دوسری سڑک پر آنا فضول ہے۔ اتنی سنسان سڑک پر اصولوں کی سخت پابندی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ دیسی مزاج جو کئی نسلوں سے ان کے اندر منتقل ہوتا آ رہا تھا، ایک دم جاگ اٹھا۔ وہ مزاج چالاکیوں کے ذریعے چھوٹے فائدے حاصل کرنے کا عادی تھا۔ وہ مزاج مصنف کی سوچ پر حاوی آ گیا اور انھوں نے دائرے کا چکر کاٹے بغیر گاڑی دوسری سڑک کی طرف موڑ دی۔ بقول فلاسفر:

"سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو کرنے والے کی نظر میں چھوٹا ہو۔"

اور بقول شاعر:

ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں — آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی

(جون ایلیا)

وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا۔ اس نے مصنف کو دیکھا مگر اس کی قانون شکنی کو نظر انداز کر دیا۔ مصنف کو محسوس ہوا کہ یہ لمحہ ایک جیت کا لمحہ تھا۔ انھیں اصول توڑ کر سہولت حاصل کرنے میں بہت لطف محسوس ہوا۔ وہ اپنی چھوٹی سی کامیابی پر خوش تھے سپاہی نے انھیں دیکھ لیا تھا لیکن فوری طور پر کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا۔ مصنف کو سپاہی کو چکما دے کر اصول توڑنے پر کامیابی کا احساس ہوا

اور ایک ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر آ گئی۔ یہ مسکراہٹ ایک خود ساختہ خوشی اور اندرونی فخر کا اظہار تھی۔ اس میں قانون کے محافظ پر طنز بھی چھپا تھا کہ دیکھو میں نے راستہ نکال لیا اور سپاہی نے روکا بھی نہیں۔ بقول شاعر:

جو سننا چاہو تو بول اُٹھیں گے اندھیرے بھی — نہ سننا چاہو تو دل کی صدا سنائی نہ دے

(وحید اختر)

سپاہی نے جب مصنف کی خود پسندانہ مسکراہٹ دیکھی تو شاید اسے محسوس ہوا کہ اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ قانون کا محافظ ہے اور اس کی نظروں کے سامنے قانون توڑا گیا۔ صرف قانون نہیں توڑا گیا تھا بلکہ قانون کی شکست پر خوشی اور فخر کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔ چناں چہ اس نے قانون شکن کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا اور اسے روکنے کے لیے سیٹی بجا دی۔

ٹریفک کے سپاہی نے مصنف کو روکنے کے لیے سیٹی بجائی تو یہ بہت بڑی وارننگ تھی۔ وہاں سیٹی بجنا گویا موت کے برابر تھا۔ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ روم یا کسی اور یورپی ملک میں ٹریفک پولیس اہل کار اگر سیٹی بجا کر رو کے تو فوراً رک جانا چاہیے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ ایک سخت قانونی اور حفاظتی حکم ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز کرنے کی صورت میں جرمانہ، لائسنس ضبطی یا دیگر سخت قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر اگر کوئی سزا مل جائے تو یہ بھی معاشرے میں بہت بدنامی اور بے عزتی کا موجب ہوتا ہے۔ لوگ کسی پڑھے لکھے آدمی سے کسی قانون شکنی کی توقع نہیں رکھتے۔ اس لیے ایسے شخص کو لوگوں کی طرف سے بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ سپاہی کے اشارے پر مصنف کو رکنا پڑا اور نہ معاملہ بگڑ سکتا تھا۔

مصنف نے گاڑی روکی تو سپاہی آگے کر کھڑا ہو گیا اور سلیوٹ کیا۔ ولایت میں اصول ہے کہ اگر کسی کو قانون کے تحت روکا جائے تو سپاہی پہلے سلیوٹ مارتا ہے۔ یہ احترام اور قانون کی برتری کا اظہار ہوتا ہے۔ روم اور یورپ کے دیگر ممالک میں پولیس قانون کی خلاف ورزی پر بھی احترام اور وقار کا مظاہرہ کرتی ہے تاکہ معاشرتی نظم برقرار رہے اور لوگ قانون پر عمل کرنے کے لیے آمادہ رہیں۔ سلام یا سلیوٹ دراصل اختیار اور پیشہ ورانہ مہذب رویے کا اظہار ہوتا ہے جو پولیس اور عوام کے تعلقات کو بہتر بناتا ہے۔ سلام کرنے یا سلیوٹ کا مقصد یہ باور کرانا بھی ہوتا ہے کہ پولیس اہل کار اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہے نہ کہ کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی نکال رہا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگ فوراً تعاون پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ معذرت کر کے آئندہ قانون کی پابندی کا عہد کرتے ہیں۔

یہ واقعہ محض ایک ٹریفک قانون کی خلاف ورزی نہیں تھا بلکہ دو مختلف سوچوں کا تصادم تھا۔ ایک طرف وہ معاشرہ تھا جو اصولوں پر چلتا تھا۔ وہاں لوگ ہر حال میں سختی سے قوانین پر عمل کرتے تھے۔ دوسری طرف ایک دیسی ذہن تھا جو موقع دیکھ کر فائدہ اٹھانے کا قائل تھا۔ دیسی ذہن یہ سمجھتا تھا کہ اگر کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو اصول توڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن روم وہ جگہ تھی جہاں اصولوں کو لوگوں کی نظروں کی نہیں بلکہ قانون کی طاقت کا سہارا تھا۔ وہاں کوئی شخص قانون توڑ کر خوش نہیں رہ سکتا تھا بلکہ اسے غلط عمل کا جواب دینا ہوتا تھا۔

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ قومیں تبھی آگے بڑھتی ہیں جب ہر شہری قانون کی پاسداری کرے۔ تہذیب محض جدید عمارتوں اور سڑکوں کی تعمیر کا نام نہیں بلکہ اصولوں کی پاسداری اور شہریوں کے مثبت رویوں کا نام ہے۔ اگر ہم بھی روزمرہ زندگی میں قوانین کا احترام کریں اور اصولوں کو خود پر لاگو کریں تو ہم بھی ایک دن ترقی یافتہ اور مہذب قوم بن سکتے ہیں۔

عبارت نمبر 3

اب مَیں اندر تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ شیشہ مَیں نے نیچے کیا تو مجھے کہنے لگا کہ آپ کا لائسنس! تو مَیں نے اس سے کہا مَیں زبان نہیں جانتا۔ اس نے کہا، چنگی بھلی بول رہے ہو۔ میں نے کہا، میں نہیں جانتا تم ایسے ہی جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تو نہیں جانتا ہوں۔ اس نے کہا نہیں، آپ اپنا لائسنس دیں۔ تو میں نے کہا، فرض کریں جس کے پاس اس کا لائسنس نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے؟ اس نے کہا، کوئی بات نہیں! میں آپ کا چالان کر دیتا ہوں، پرچی پھاڑ کے تو یہ آپ لے جائیں اور جرمانہ جمع کروا دیں۔ مَیں تو ایسے ہی ہانک رہا تھا۔ میں نے کہا، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا غلطی ہو گئی تھی تو چلے جاتے۔ اس نے بغیر مجھ سے پوچھے کاپی نکالی اور چالان کر دیا۔ اور چالان بھی بڑا سخت، بارہ آنے جرمانہ۔ میں نے لے لی پرچی۔ میں نے کہا، میں اس کو لے کر کیا

کروں؟ اس نے کہا اپنے کسی بھی قریبی ڈاک خانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کروادیں۔ بس وہاں کچہری نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ بس آپ کا جرمانہ ہوگیا، آپ ڈاک خانے میں دیں گے تو بس۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کے موسم میں یونی ورسٹی بند ہونے کے باعث انھیں ریڈیو اسٹیشن پر اردو میں بَراڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ روم میں دوپہر کے وقت سب لوگ کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے سڑکوں پر ایک دو لوگ ہی نظر آتے تھے۔ ٹریفک قانون کی خلاف ورزی پر مصنف کا چالان ہوگیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرنے اور وقت پر چالان ادا نہ کرنے کی صورت میں انھیں عدالت میں بلایا گیا۔ وہ جج کے سامنے پیش ہوئے۔ جج کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ غیر ملکی ہیں اور یہاں روم یونی ورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی سب کھڑے ہوگئے اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی اور عدالتی کارروائی کے بعد سب انھیں گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہاں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

تشریح طلب اقتباس میں اشفاق احمد کے ایک ذاتی تجربے کا بیان ہے جو انھیں روم میں پیش آیا، اشفاق احمد روم کی ایک یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس کے ساتھ وہ روم کے ریڈیو اسٹیشن پر دوپہر کے وقت براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ روم میں دوپہر کے وقت لوگ قیلولہ کرتے تھے اور چار بجے تک سڑکوں پر ٹریفک بہت کم ہوتی تھی۔ اس دوران میں کارپوریشن کے کارندے سڑکوں پر چھڑکاؤ کرتے اور انھیں اچھی طرح دھوتے تھے۔ شام تک سڑکیں صاف اور ٹھنڈی ہوجاتیں اور ماحول خوش گوار ہوجاتا تھا۔

مصنف بتاتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کے وقت وہ ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس آرہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی اس طرف سے موڑ دی جہاں سے نہیں موڑنی چاہیے تھی۔ ٹریفک پولیس کا ایک اہل کار انھیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے انھیں نظر انداز کردیا۔ اصول کی اس کامیاب خلاف ورزی پر مصنف کو لطف محسوس ہوا۔ انھوں نے ٹریفک پولیس اہل کار کی طرف طنزیہ انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ پولیس اہل کار نے سیٹی بجا کر انھیں روکا۔ مصنف کو اندازہ ہوچکا تھا کہ ان سے سنگین غلطی ہوگئی۔ قانون توڑ کر وہ خوش تھے۔ انھیں لگا تھا کہ انھوں نے اپنی ذہانت سے ایک معمولی رکاوٹ کو پار کرلیا۔ لیکن جب سپاہی نے سیٹی بجا کر انھیں روکا تو احساس ہوا کہ وہ کسی ایسی جگہ موجود تھے جہاں قانون کو کھلونا سمجھ کر توڑا نہیں جاسکتا۔ انھیں بھی قانون کے سامنے جواب دینا تھا۔ بقول فلاسفر:

"خود پر یقین ہونا کامیابی کی ضمانت ہے، مگر خود کو ہمیشہ درست سمجھنے کا یقین انسان کو گمراہ کردیتا ہے۔"

مصنف کہتے ہیں کہ انھوں نے گاڑی روکی تو پولیس اہل کار نے آکر انھیں سلیوٹ کیا۔ لیکن ان کے اندر بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور وہ گاڑی میں بیٹھے تھر تھر کانپنے لگے۔ گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تو سپاہی نے لائسنس مانگا۔ سپاہی کا رویہ بہت نرم اور شائستہ تھا۔ مصنف کو حیرانی ہوئی کہ قانون نافذ کرنے والا اہل کار، اس کے قانون توڑنے پر نہ غصے میں تھا اور نہ ہی بدتمیزی کررہا تھا۔ مصنف جس ملک سے گیا تھا، وہاں عام طور پر پولیس کا رویہ کافی سخت ہوتا ہے، سپاہی کا نرم رویہ دیکھتے ہوئے مصنف نے وہی حربہ آزمانے کا سوچا جو اس کے ملک میں لوگ آزماتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے انجان بن کر کہا کہ وہ ان کی زبان نہیں جانتا۔ انھیں امید تھی کی

سپاہی ان کی بات مان لے گا اور معاملہ ٹل جائے گا۔ لیکن سپاہی بھی مصنف کی چالاکی سمجھ چکا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "چنگی بھلی بول رہے ہو، تو کیسے نہیں جانتے"؟ یہ سُن کر مصنف کو احساس ہوا کہ یہاں بہانے نہیں چلیں گے۔ انھوں نے دوسرا حربہ اختیار کیا اور سوال کیا کہ اگر کسی کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ سپاہی نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں جرمانہ بھرنا ہوگا۔ مصنف کو اندازہ ہوگیا کہ یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ اپنے ملک میں ایسی صورتِ حال میں لوگ بحث کرتے ہیں، جھگڑا کرتے ہیں، سفارش تلاش کرتے ہیں اور پولیس اہل کار کو رشوت دے کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ لیکن روم میں واضح تھا کہ قانون سب کے لیے برابر تھا۔ انھیں یقین ہوچکا تھا کہ چالان سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ آخرِ کار انھوں نے حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ انھوں نے کہا "مجھ سے غلطی ہوگئی"، غلطی کا اعتراف کرنے کا مقصد بھی صرف چالان سے بچنا تھا۔ سپاہی نے مسکرا کر جواب دیا "غلطی ہوگئی تھی تو چلے جاتے"۔ اس پر مصنف لاجواب ہوگیا۔ سپاہی نے مزید کچھ کہے بغیر کاپی نکالی اور چالان کاٹ دیا۔ چالان کی رقم بھی بہت زیادہ یعنی بارہ آنے تھی۔ یہ صرف جرمانے کی رقم نہیں تھی بلکہ روم میں قانون کی خلاف ورزی کرنے پر ایک سبق کی قیمت تھی۔ یہ 1953ء کا واقعہ ہے اُس وقت بارہ آنے جرمانہ ایک بڑی رقم تھی۔

سپاہی نے چالان کاٹ کر جرمانے کی پرچی مصنف کے ہاتھ میں تھما دی۔ مصنف کے پاس جرمانے کی پرچی وصول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کے ذہن میں اپنے ملک میں چالان ہونے کی تصویر گردش کرنے لگی۔ اپنے ملک میں چالان ہونے کا مطلب تھا عدالت کے چکر، لمبی قطاریں، سفارشیں، دفتروں کے دھکے اور پریشانی۔ چناں چہ انھوں نے پریشان ہوکر سپاہی سے پوچھا کہ اس پرچی کو لے کر وہ کیا کریں گے؟ یعنی جرمانہ جمع کروانے کے لیے اب کن کن مراحل اور پریشانیوں سے گزرنا ہوگا۔ سپاہی نے سادگی سے سمجھایا کہ وہ جرمانہ کسی بھی ڈاک خانے میں جمع کرایا جاسکتا ہے۔ مصنف بہت حیران ہوئے کہ وہاں جرمانہ جمع کرانے کا طریقہ کس قدر آسان تھا۔ جرمانہ کسی بھی قریبی ڈاک خانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کرایا جاتا تھا۔ نہ کچہری جانے کی ضرورت تھی اور نہ ہی جرمانہ جمع کرانے کے لیے دھکے کھانے پڑتے تھے۔ آپ کو جرمانہ ہوگیا تو بس آپ ڈاک خانے جا کر سہولت کے ساتھ جرمانہ جمع کرادیں۔ کسی قسم کی کوئی پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی تھی۔

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن یہ ایک مہذب ملک کے کئی معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ واقعہ دکھاتا ہے کہ مہذب معاشروں میں قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے اور اسے نرمی اور شائستگی کے ساتھ لاگو کیا جاتا ہے۔ غلطی ہوجائے تو طنز، بہانے بازی اور مذاق کسی کام نہیں آتا بلکہ بعض اوقات ان سے صورتِ حال مزید خراب ہوسکتی ہے۔ ایک شفاف اور آسان نظام شہریوں کے لیے سہولت پیدا کرتا ہے اور قانون کی پاسداری کو یقینی بناتا ہے۔

عبارت نمبر 4

میں جب چالان کروا کے گھر آگیا تو میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے کہا، میرا چالان ہوگیا ہے۔ کہنے لگی، آپ کا؟ میں نے کہا، میں کیا کروں۔ اب ان کو ایسے لگا کہ ہمارے گھر میں جیسے ایک بڑا مجرم رہتا ہے۔ اور اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہوگیا ہے۔ بڈھی مائی تھی۔ ان کی ایک ساس تھی، اس کو بھی بتایا، سارے روتے ہوئے میرے پاس آگئے۔ میں بڑا ڈرا کہ یا اللہ! یہ کیا۔ کہنے لگے تُو شریف آدمی لگتا تھا۔ اچھے خاندان کا اچھے گھر کا لگتا تھا۔ ہم نے تجھے یہ کرائے پر کمرہ بھی دیا ہوا ہے لیکن تُو ویسا نہیں نکلا۔ خیر! گھر خالی کرنے کو تو نہیں کہا۔ جو بڈھی مائی تھی، ان کی ساس، اس نے کہا، ہو تو گیا ہے برخوردار چالان، لیکن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ محلے داری کا معاملہ ہے۔ اگر ان کو پتا چل گیا کہ اس کا چالان ہوگیا ہے تو بڑی رسوائی ہوگی۔ لوگوں کو پتا چلے گا۔ میں نے کہا، نہیں، میں پتا نہیں لگنے دوں گا۔ میری لاابالی طبیعت، چھبیس سال کی عمر تھی۔ چالان جیب میں ڈالا اور نکل گیا دوستوں سے ملنے۔ اگلے دن مجھے جمع کروانا تھا، بھول گیا، پھر سارا دن گزر گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے اصولاً جمع کروا دینا چاہیے تھا تو میں نے کپڑے بدلے تو وہ پرانے کوٹ میں رہ گیا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں جس زمانے میں، وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کا موسم تھا،

یونی ورسٹی سے چھٹیاں تھیں، وہ دوپہر کو ریڈیو اسٹیشن پر براڈ کاسٹنگ کرتے تھے۔ سڑک پر بھیڑ نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ وقت پر چالان ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت میں طلب کیا گیا۔ جج کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ پردیسی ہیں، یہاں روم یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔ وقت کی قلت کی وجہ سے چالان ادا نہ کر سکا اور وہ یہاں کے قوانین سے واقف بھی نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی جج کھڑا ہو گیا اور اس نے اعلان کیا۔ استاد کٹہرے میں ہے، استاد کٹہرے میں ہے۔ جج نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔ مقدمے کی سماعت ختم ہونے کے بعد جج اور اس کے منشی مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ نیز وہ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں آقا کے پیچھے غلام چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

تشریح طلب اقتباس میں چالان ہونے کے بعد مصنف کی لینڈ لیڈی اور اس کے خاندان کا ردِ عمل دکھایا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصنف کی غیر ذمہ داری اور لاابالی پن بھی نظر آ رہا ہے۔

روم میں ایک دن مصنف نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ چالان کی پرچی لے کر مصنف اپنے گھر پہنچے اور اپنی مالک مکان کو چالان کے بارے میں بتایا۔ مصنف اسے روزمرہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ سمجھ رہے تھے لیکن ان کی لینڈ لیڈی (مالک مکان) کا ردِ عمل خلافِ توقع اور حیران کن تھا۔ مصنف نے جب لینڈ لیڈی کو بتایا کہ ان کا چالان ہو گیا ہے، تو وہ بہت حیرت سے دوبارہ پوچھنے لگی کہ کیا واقعی ان کا چالان ہوا ہے؟ مصنف نے جواب دیا کہ ان کا واقعی چالان ہوا ہے لیکن وہ اس پر زیادہ فکر مند نہیں تھے۔ لینڈ لیڈی کے چہرے پر شدید پریشانی اور حیرت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے لیے کسی کا چالان ہونا ایک نہایت سنگین جرم کے مترادف تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کسی خطرناک مجرم کا سامنا ہو۔ اس نے اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے لیا کہ پورے گھر میں یہ خبر پھیلا دی۔ اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہو گیا ہے۔ پھر اس نے اپنی بوڑھی ساس کو بھی یہ خبر اس انداز میں دی جیسے کوئی سنگین جرم ہو گیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے گھر میں ہلچل مچ گئی اور ہر شخص پریشان ہو گیا۔ مصنف حیران تھے کہ ایک چھوٹے سے چالان پر پورے گھر میں ایسا طوفان کیوں برپا ہو گیا ہے۔ لینڈ لیڈی کی بوڑھی ساس محلے کی عزت اور روایات کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ یہ خبر سن کر وہ بہت فکر مند ہو گئی۔ اس نے بہت خوف زدہ لہجے میں مصنف کو نصیحت کی کہ اس واقعے کا محلے میں کسی سے ذکر نہ کریں۔ اس نے کہا کہ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ ان کا چالان ہو گیا ہے تو محلے میں ان کی بڑی بے عزتی ہو گی۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ انھوں نے ایک مجرم کو مکان کرائے پر دے رکھا ہے۔ لینڈ لیڈی نے کہا کہ ہم تجھے شریف آدمی سمجھتے تھے، اسی لیے تمھیں کمرہ کرائے پر دے دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ تو ہماری توقعات کے مطابق قانون پر عمل کرنے والا شہری نہیں نکلا۔ تمھاری پروفیسری کی وجہ سے ہم تجھے ایک پڑھا لکھا اور قانون پسند فرد سمجھے تھے، تمھارا چالان ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تم قانون کے احترام سے غافل ہو۔ ایسے شخص کو کمرہ کرائے پر دینا ہمارے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان مبارک ہے:

"اگر انسان میں دس عادات ہوں اور ان میں سے نو عادتیں اچھی ہوں اور ایک عادت بُری ہو تو ایک بُری عادت نو اچھی عادتوں کو غارت کر دیتی ہے۔"

مصنف کی لینڈ لیڈی اور اس کے خاندان کے رویے کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ لینڈ لیڈی اور اس کے گھر والوں نے جب مصنف کو مکان کرائے پر دیا تھا تو انھیں لگا کہ وہ ایک شریف، تعلیم یافتہ اور ذمہ دار شخص ہے۔ لیکن چالان ہونے کے بعد ان کے ذہن میں شکوک شبہات پیدا ہو گئے کہ ان کا کرایہ دار شاید ویسا نہیں ہے جیسا وہ پہلے سمجھے تھے۔ ان کا یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہاں لوگ

دوسروں کے کردار کو ان کی روزمرہ زندگی کے معمولی اعمال سے جانچتے تھے۔ وہاں قانون توڑنے والے کو غیر ذمہ دار اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لینڈ لیڈی اور اس کے گھر والوں کو یہ احساس ہوا کہ شاید انھوں نے غلط شخص کو اپنے گھر میں جگہ دے دی۔

اس واقعے سے روم کے عمومی ماحول کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ روم ایک ایسا شہر تھا جہاں لوگ اپنے شہری فرائض کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہاں ٹریفک قوانین پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ اگر کوئی ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا تو اسے نہ صرف قانونی بلکہ سماجی نتائج کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہاں کے لوگ قانون شکنی کو بدتمیزی اور غیر شائستہ رویہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس پاکستان میں لوگوں کا عمومی رویہ قوانین پر عمل کے حوالے سے اتنا سخت نہیں ہوتا۔ لوگ عام طور پر قوانین کو ایک بوجھ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ موقع ملتے ہی لوگ قانون کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ اسی لیے مصنف کا رویہ غیر ذمہ دارانہ اور غیر سنجیدہ نظر آتا ہے۔

مصنف ایک پڑھے لکھے شخص تو تھے لیکن ابھی اپنی جوانی کے دن گزار رہے تھے۔ اس لیے ان کی طبیعت لاابالی اور غیر سنجیدہ تھی۔ ان کی عمر چھبیس سال تھی اور وہ جس معاشرے سے روم گئے تھے۔ اس میں بھی قانون کے احترام کی زیادہ پروا نہیں جاتی تھی۔ اس لیے وہ بے فکری سے چالان جیب میں ڈال کر دوستوں سے ملنے نکل گئے۔ اگلے دن چالان ادا کرنا تھا لیکن مصروفیات کی وجہ سے بھول گئے۔ ان کے نزدیک چالان جمع کروانا بہت اہم معاملہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ ان کے پاس موقع تھا کہ اس سے اگلے دن جمع کرا دیتے لیکن اگلے دن بھی انھوں نے جرمانہ ادا نہیں کیا۔ انھوں نے چالان کی پرچی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھی تھی، اگلے دن جب دفتر جانے کے لیے کپڑے بدلے تو وہ پرچی پرانے کوٹ کی جیب میں رہ گئی۔ اس طرح چالان اپنی مقررہ مدت میں جمع نہ ہو سکا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی دینی پڑی۔

یہ واقعہ روم کے ماحول اور پاکستان کے ماحول میں فرق کو بھی واضح کرتا ہے۔ پاکستان میں ٹریفک چالان ہونا عام سی بات ہے اور لوگ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کسی کا چالان ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ اسے جرمانہ سمجھ کر ادا کر دیتا ہے اور اپنی روزمرہ زندگی میں مگن ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں روم میں چالان کو صرف جرمانہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور سماجی مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ وہاں کے لوگ قانون کی خلاف ورزی کو اپنی تہذیب اور روایات کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس معاشرے میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کی عزت اور وقار متاثر ہوتا تھا اور اسے لوگوں کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

"گناہ پر شرمندگی کا احساس گناہ کو مٹا دیتا ہے مگر نیکی پر غرور نیکی کو برباد کر دیتا ہے۔"

اس واقعے سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے ملک میں جا کر رہے تو اسے وہاں کے قوانین اور سماجی روایات کو بھی اچھی طرح سمجھنا اور ان کا احترام کرنا چاہیے۔

عبارت نمبر 5

شام کے وقت مجھے ایک تار ملا کہ محترمی جناب پروفیسر صاحب! فلاں فلاں مقام پر فلاں چوراہے پر آپ کا چالان کر دیا گیا تھا، فلاں سپاہی نے۔ یہ نمبر ہے آپ کے چالان کا۔ آپ نے ابھی تک کہیں بھی چالان کے پیسے جمع نہیں کروائے۔ یہ بڑی حکم عدولی ہے۔ مہربانی فرما کر اسے جمع کروا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ تقریباً اکیس روپے کا تار تھا۔ میں نے سارے لفظ گنے۔ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ میں پھر بھول گیا، اور ان کا پھر ایک اور تار آیا۔ اگر آپ اب بھی رقم جمع نہیں کروائیں گے تو پھر ہمیں افسوس ہے کہ کورٹ میں پیش کر دینا پڑے گا۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی، نہیں جا سکا۔ تب مجھے کورٹ سے ایک سمن آ گیا کہ فلاں تاریخ کو عدالت میں پیش ہو جائیں، اور یہ جو آپ نے حکم عدولی کی ہے، قانون توڑا ہے، اس کے بارے میں آپ سے پورا انصاف کیا جائے گا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کی چھٹیوں میں یونی ورسٹی بند ہونے کے باعث وہ ریڈیو اسٹیشن پر اردو میں براڈ کاسٹنگ کرتے تھے۔ روم میں لوگ دوپہر کو سونے کے

عادی تھے جس کی وجہ سے سڑکوں پر رش نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن سڑک پر رش نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہوگیا۔ اپنی لاپرواطبیعت کے باعث وہ وقت پر چالان جمع کرانا بھول گئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ جہاں جج کے پوچھنے پر انھوں نے جواب دیا کہ وہ یہاں روم یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔ یہ سنتے ہی جج، دیگر عملہ اور وہاں موجود تمام لوگ کھڑے ہوگئے اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔ جج کے لہجے میں نرمی آگئی اور اس نے کہا آپ کا چالان دگنا ہوگیا ہے۔ نیز وہ سب مصنف کو گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہاں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ، استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مصنف جب روم کی ایک یونی ورسٹی میں پڑھاتے تھے تو ساتھ ریڈیو پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے واپسی پر انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی تو ان کا چالان ہوگیا۔ ٹریفک پولیس اہلکار نے انھیں چالان کی پرچی دی کہ قریبی ڈاک خانے میں جرمانہ جمع کرادیں۔ مصنف نے اپنی لینڈ لیڈی کو چالان کے بارے میں بتایا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ مصنف نے وہ جرمانہ اگلے دن ادا کرنا تھا لیکن اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے ادا نہ کرسکے۔ ان کے پاس اس سے اگلے دن بھی جرمانہ ادا کرنے کا موقع تھا مگر انھوں نے پھر نظر انداز کردیا۔ انھیں اس بات کا احساس نہ تھا کہ روم جیسے شہر میں قانون کی خلاف ورزی کو کتنی سنجیدگی سے لیا جاتا تھا۔ وہ چالان کو محض ایک جرمانہ سمجھ رہے تھے، جو کسی بھی وقت ادا کیا جاسکتا تھا۔ لیکن وہاں کا نظام اس سے کہیں زیادہ سخت اور اصولوں کا پابند تھا۔

مصنف کہتے ہیں کہ شام کے وقت ان کے نام ایک تار آیا جس میں یاددہانی کرائی گئی تھی کہ وہ چالان جلد ادا کردیں۔ تار میں بہت مؤدبانہ اور واضح انداز میں لکھا گیا تھا کہ انھوں نے فلاں تاریخ کو، فلاں مقام پر، فلاں وقت، فلاں سپاہی کے ذریعے چالان کروایا تھا۔ تار میں چالان کا نمبر اور رقم بھی درج تھی۔ انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ جرمانے کی رقم جلد جمع کرادیں۔ مقررہ وقت میں چالان ادا نہ کرنا حکم عدولی کے زمرے میں آتا تھا۔ تار میں حکم عدولی کا ذکر بھی تھا جو ظاہر کررہا تھا کہ وہاں قانون کو نظر انداز کرنا ایک سنجیدہ جرم تصور کیا جاتا تھا۔

مصنف نے تار پڑھ کر اس کے سارے الفاظ بھی گنے اور رقم کا اندازہ بھی لگایا۔ محکمے نے یاددہانی کے لیے بھیجے گئے تار پر جو رقم خرچ کی تھی اس کی مالیت اکیس روپے بنتی تھی جب کہ ان کو جو جرمانہ ہوا تھا اس کی مالیت صرف بارہ آنہ تھی۔ انھیں حیرت ہوئی کہ معمولی رقم ادا کرنے کی یاددہانی پر محکمے نے اتنی رقم خرچ کردی۔ پاکستان میں چالان کی یاددہانی کا کوئی تصور نہیں۔ اگر کسی کا کوئی چالان ہوجائے تو زیادہ تر لوگ اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے اور جب موقع ملتا ہے تب ادا کرتے ہیں۔ لیکن روم میں معاملہ بالکل مختلف تھا۔ حکومت اور ادارے اس بات کو یقینی بناتے تھے کہ ہر شخص وقت پر اپنے قانونی فرائض پورے کرے۔ اس کا اندازہ مصنف کو اس وقت ہوا جب وہ پھر سے چالان جمع کرانا بھول گئے اور انھیں ایک اور تار موصول ہوگیا۔ اُس زمانے میں تار پر بھاری اخراجات آتے تھے۔ ٹیلی فون اور تار بہت مہنگے تھے۔

دوسری مرتبہ جو تار موصول ہوا اس میں بھی انھیں جرمانہ جمع کرانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس مرتبہ بھی لہجہ نرم اور شائستہ تھا مگر اس میں ایک واضح تنبیہ بھی شامل تھی۔ انھیں صاف الفاظ میں بتایا گیا تھا کہ اگر انھوں نے مقررہ وقت تک رقم جمع نہ کرائی تو انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔ یہاں روم کی تہذیب اور قانونی نظام کی ایک اور جھلک ملتی ہے۔ روم میں لوگوں کو پہلے نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر وہ قانون کی پاسداری نہیں کرتے تو پھر ان کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی ہے۔ یاددہانی کے باوجود مصنف چالان کے معاملے کو سنجیدہ نہیں لے رہے تھے۔ انھوں نے کوتاہی کی اور دوسری مرتبہ یاددہانی اور تنبیہ کے باوجود

جرمانہ ادا نہیں کیا۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

"ذلت اٹھانے سے بہتر ہے کہ تکلیف اُٹھاؤ"

پھر وہ دن آیا جب مصنف کو عدالت سے باقاعدہ سمن مل گیا۔ اس سمن میں انھیں حکم دیا گیا تھا کہ فلاں تاریخ کو وہ عدالت میں حاضر ہوں اور اپنی حکم عدولی کا جواب دیں۔ اب یہ معاملہ محض ایک چالان کا نہیں رہا تھا بلکہ ایک قانونی کارروائی میں تبدیل ہوچکا تھا۔ انھیں یہ بات واضح طور پر بتائی گئی تھی کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرچکے اور اب ان کے خلاف مکمل انصاف کیا جائے گا۔

مہذب معاشروں کی ترقی کا راز قانون کے احترام میں ہے۔ قانون کو عزت دیے بغیر کوئی معاشرہ قابلِ عزت نہیں بن سکتا۔ ایک انگریز مفکر جان لاک (John locke) کا قول ہے:

"Where there is no law, there is no freedom"

"جہاں قانون نہیں ہوتا، وہاں آزادی بھی نہیں ہوتی"

روم ایک مہذب شہر تھا۔ وہاں قانون پر عملداری سب سے اہم کام سمجھا جاتا تھا۔ وہاں قانون کی سختی صرف سڑکوں تک محدود نہیں تھی بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی قانون پر سختی سے عمل کرایا جاتا تھا۔ اگر کوئی شہری قانون کی پاسداری نہیں کرتا تو اس کے خلاف فوری کارروائی کی جاتی تھی۔ کیوں کہ:

"بعض اوقات مجرم کو معاف کردینا مجرم کو زیادہ خطرناک بنادیتا ہے۔"

ایک دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ روم میں قوانین کی خلاف ورزی کو صرف قانونی جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی شخص پر حکم عدولی کا الزام لگ جاتا تو اس کی ساکھ متاثر ہوسکتی تھی۔ یہ سماجی رویہ بھی لوگوں کو قانون کے احترام کی ترغیب دیتا تھا۔

عبارت نمبر 6

اب میں ڈرا۔ میری سٹی گم ہوئی۔ پریشان ہوا کہ اب میں دیارِ غیر میں ہوں۔ کوئی میرا حامی و ناصر، مددگار نہیں ہے۔ میں کس کو اپنا والی بناؤں گا۔ میرا ڈاکٹر تھا۔ "ڈاکٹر بالدی" اس کا نام تھا، نوجوان تھا۔ مَیں نے اس سے کہا، مجھے وکیل کردو۔ اس نے کہا، میرا ایک دوست ہے۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا، یہ تھوڑا سا پیچیدہ ہوجائے گا، اگر میں گیا عدالت میں۔ بہتر یہی ہے پروفیسر صاحب جائیں، اور جاکر خود Face کریں۔ عدالت کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ میں چوں کہ اس قانون کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا۔ میں یہاں پر ایک غیر ملکی ہوں تو مجھے معافی دی جائے۔ میں ایسا آیندہ نہیں کروں گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چناں چہ میں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔

اگر آپ کو روم جانے کا اتفاق ہو تو "پالاس آف دی جسٹی" Palace of Justice وہ رومن زمانے کا بہت بڑا وسیع و عریض ہے، اُسے تلاش کرتے کرتے ہم اپنے جج صاحب کے کمرے میں پہنچے تو وہ وہاں تشریف فرما تھے۔ مجھے ترتیب کے ساتھ بلایا گیا تو میں چلا گیا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کی چھٹیوں میں یونی ورسٹی بند ہونے کے باعث وہ ریڈیو اسٹیشن پر اردو میں براڈ کاسٹنگ کرتے تھے۔ روم میں لوگ دوپہر کو سونے کے عادی تھے۔ جس کی وجہ سے سڑکوں پر رش نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن سڑک پر رش نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہوگیا۔ اپنی لاپرواطبیعت کے باعث وہ وقت پر چالان جمع کرانا بھول گئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ انھیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج کے پوچھنے پر انھوں نے جواب دیا کہ وہ یہاں روم یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔ یہ سنتے ہی جج، عدالت کے اہل کار اور وہاں موجود تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔ جج کے لہجے میں نرمی آگئی اور اس نے کہا آپ کا چالان دگنا ہو گیا ہے۔ نیز عدالتی کارروائی کے بعد وہ سب مصنف کو گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہاں کوئی جج ہو یا بیوروکریٹ، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ، استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

اشفاق احمد روم کی یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے اور ساتھ ہی ریڈیو پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس جاتے ہوئے انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ ٹریفک اہل کار نے انھیں جرمانہ کسی قریبی ڈاک خانے میں جمع کرانے کی ہدایت کی۔ انھوں نے چالان بروقت جمع نہ کرایا تو انھیں حکومت کی طرف سے یاد دہانی بھی کرائی گئی۔ یاد دہانی کے باوجود انھوں نے سنجیدگی کا مظاہرہ نہ کیا اور جرمانہ جمع کرانے میں کوتاہی کی۔ پھر انھیں عدالت سے سمن آگئے کہ عدالت میں آکر چالان جمع نہ کرانے اور حکم عدولی کی وجہ بتائیں۔

روم میں مصنف کے ساتھ پیش آنے والا یہ واقعہ صرف قانون کے سختی سے نفاذ کا ایک نمونہ ہی نہیں بلکہ اجنبی سرزمین میں ایک فرد کی بے بسی کا بھی مظہر ہے۔ مصنف بے فکری اور لاپروائی کے ساتھ چالان کو ٹالتے رہے لیکن وہی رویہ بعد میں ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔ شروع میں انھیں محسوس نہیں ہوا کہ ایک معمولی سا چالان وقت کے ساتھ ایک پیچیدہ قانونی مسئلے میں بدل جائے گا۔ مگر جب انھیں عدالت میں طلب کیا گیا تو انھیں اپنی غلطی اور اس کے نتائج کا شدت سے احساس ہوا۔ بقول شاعر:

غلطی کی کہ مروت میں مصیبت جھیلی　　ظلم برداشت ہی کرتا تھا نہ چپ رہتا تھا　　(راشد آذر)

اور بقول فلاسفر:

"غلطیاں تمھیں عقل مند بناتی ہیں اور مقصد تمھیں مضبوط کرتا ہے۔"

مصنف کہتے ہیں کہ جب انھیں عدالت سے سمن موصول ہوا تو وہ ڈر گئے اور ان کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ پریشان ہوئے اور اپنی بے بسی کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ روم میں وہ اجنبی تھے اور کوئی ان کی جان پہچان والا نہیں تھا۔ کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان کے لیے معاملات کو آسان کر سکتا۔ اپنے ملک میں ہوتے تو شاید کوئی دوست، کوئی ساتھی، کوئی بزرگ یا کوئی جاننے والا اس مشکل وقت میں سہارا دے سکتا۔ انھیں اس مشکل وقت میں کسی ہمدرد اور مددگار کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ کسی مفکر کا قول ہے:

"اندھیرے میں ایک چراغ کی روشنی لاکھ ستاروں سے بہتر ہوتی ہے، اسی طرح مشکل وقت میں ایک سچا ساتھی ہزاروں عام لوگوں سے بہتر ہوتا ہے۔"

جب عدالت سے باضابطہ سمن آگیا تو وہ سخت پریشان ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ روم میں قانون پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر عدالت نے کوئی سخت فیصلہ کر لیا تو نہ صرف مالی نقصان ہوگا بلکہ ان کی حیثیت اور وقار بھی متاثر ہوگا۔ روم میں جرمانہ یا سزا ایک بہت سنجیدہ اخلاقی اور سماجی مسئلہ تھا۔ وہاں لوگ محلے داری اور اپنی ساکھ کی بہت پروا کرتے تھے۔ اگر کسی کے بارے میں تاثر قائم ہو جاتا کہ وہ قانون سے سزا یافتہ ہے تو اس کے لیے بہت مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ ان کی لینڈ لیڈی نے انھیں منع کیا تھا کہ ان کے چالان کی محلے میں کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن اب تو معاملہ عدالت تک پہنچ گیا تھا۔ اب صورتِ حال ان کے لیے اور زیادہ پریشان کن ہو گئی تھی۔ چناں چہ وہ سوچنے لگے کہ کس سے مدد مانگیں اور اس مشکل سے کیسے نکلیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

"مصیبت میں گھبرانا کمال درجہ کی مصیبت ہے۔"

اس نازک وقت میں ان کے ذہن میں پہلا خیال ڈاکٹر بالدری کا آیا۔ ڈاکٹر بالدری ایک نوجوان تھے جس سے مصنف کی کچھ واقفیت تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر بالدری کو ساری صورت حال بتائی اور اسے وکیل تلاش کرنے کے لیے کہا۔ مصنف کا خیال تھا کہ اس پیچیدہ مسئلے سے نکلنے کے لیے وکیل سے مدد لینا ضروری تھا۔ ڈاکٹر بالدری نے انھیں تسلی دی کہ ان کا ایک دوست وکیل ہے۔ وہ انھیں اپنے وکیل دوست کے پاس لے گئے۔ وکیل سے ملاقات نے ان کی امید کو کچھ حد تک بحال کیا۔ وکیل نے ان کی رہنمائی کی اور کہا کہ یہ معاملہ وکیل کے جانے سے پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ مصنف خود عدالت میں پیش ہو کر اپنا موقف بیان کریں۔ وکیل کا مشورہ حقیقت پسندانہ تھا۔ وکیل نے مشورہ دیا کہ وہ عدالت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں کہ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے وہ اس ملک کے قانون کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ عدالت میں اپنی لاعلمی کا عذر پیش کریں اور معافی مانگ کر آیندہ قانون پر عمل کرنے کی یقین دہانی کرائیں۔ اجنبی دیس میں عدالت کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا کیوں کہ وہ وہاں کے عدالتی نظام سے واقف نہیں تھے۔ مگر کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا اس لیے مصنف نے فیصلہ کیا کہ وہ عدالت میں جا کر خود اپنا دفاع کریں گے۔

حضرت امام حسنؓ کا فرمان مبارک ہے:

"وہ شخص سب سے بہترین زندگی بسر کرتا ہے جو اپنی ضروریات کے لیے کسی غیر پر بھروسہ نہیں رکھتا۔"

جب وہ عدالت کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے دل میں خوف تھا کیوں کہ انھیں ایک ایسے ادارے کا سامنا تھا جہاں ہر چیز قانون کے مطابق چلتی تھی۔ جہاں ہر فرد کو اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔ چناں چہ وہ عدالت پہنچے جسے "پالاس آف دی جسٹی" (Palace of the Justice) کہا جاتا تھا۔ وہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی جو روی عدالتی نظام کی شان و شوکت کی مظہر تھی۔ یہ عمارت صرف ایک عدالت نہیں تھی بلکہ انصاف کی ایک تاریخی علامت تھی۔ جہاں انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے تھے اور قوانین کو سختی سے نافذ کیا جاتا تھا۔ جب وہ عمارت میں داخل ہوئے تو ہر چیز ترتیب سے چل رہی تھی۔ جج صاحب بھی اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مصنف کہتے ہیں کہ لوگوں کو باری باری بلایا جا رہا تھا اور ہر شخص کو دفاع کا موقع دیا جا رہا تھا۔ ان کی باری آئی، ان کا نام پکارا گیا تو وہ بھی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ وہ انتہائی خوف زدہ اور شرمندہ تھے تاہم عدالت نے ان کو صفائی کا پورا موقع دیا۔

اس واقعے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ قانون کا احترام اور اس کی پابندی کرنا صرف ایک ضرورت نہیں بلکہ خود کو مشکلات سے بچانے کا بھی ایک بہترین طریقہ ہے۔

عبارت نمبر 7

اب بالکل میرے بدن میں روح نہیں ہے اور میں خوف زدہ ہوں اور کانپنے کی بھی مجھ میں جرأت نہیں ہے۔ اس لیے کہ تشنج جیسی کیفیت ہو گئی تھی۔ انھوں نے حکم دیا: آپ کھڑے ہوں اس کٹہرے کے اندر۔ اب عدالت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا چالان ہوا تھا اور آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ یہ بارہ آنے ڈاک خانے میں جمع کروائیں۔ کیوں نہیں کروائے؟ میں نے کہا: جی مجھ سے کوتاہی ہوئی، مجھے کروانے چاہییں تھے۔ لیکن میں ۔۔۔۔ اس نے کہا، کتنا وقت عملے کا ضائع ہوا۔ کتنا پولیس کا ہوا، اب کتنا "جسٹیک کا" ہوا (جسٹس عدالت کا ہو رہا ہے) اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جب وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کی ایک دوپہر کو سڑک پر بھیڑ نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ وقت پر چالان ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت میں طلب کیا گیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ جج کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ پردیسی ہیں، یہاں روم یونی ورسٹی میں استاد ہیں اور یہاں کے قانون سے واقف نہیں۔ جج نے جیسے ہی سنا، وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "استاد

کٹہرے میں ہے، استاد کٹہرے میں ہے۔" ان کے لیے کرسی لائی گئی۔ مقدمے کی سماعت کے بعد جج اور اس کا دیگر عملہ مصنف کے پیچھے پیچھے انھیں گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ وہ استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف عدالت میں اپنی جج کے سامنے پیشی کا حال بتا رہے ہیں۔ اشفاق احمد روم میں ایک یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہاں وہ دن کے وقت ریڈیو اسٹیشن پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس جاتے ہوئے انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور پولیس اہلکار نے ان کا چالان کر دیا۔ وہ چالان مقررہ مدت کے اندر کسی قریبی ڈاک خانے میں جمع کرانا ضروری تھی۔ مصنف نے چالان کی پرچی جیب میں ڈالی اور بے فکری سے اپنے کاموں میں مشغول رہے۔ حکومت نے دو مرتبہ تار کے ذریعے انھیں یاد دہانی بھی کرائی کہ جرمانہ جمع کرادیں۔ اپنی لاابالی طبیعت اور غیر سنجیدہ رویے کی وجہ سے انھوں نے چالان جمع نہ کرایا تو انھیں عدالت میں طلب کر لیا گیا۔

جب انھیں عدالت میں طلب کیا گیا تو وہ انتہائی پریشان تھے۔ وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے جسم میں جان نہیں رہی۔ اپنے وطن میں چالان وقت پر جمع نہ کرانا کوئی بڑا جرم نہیں تھا لیکن روم میں اسے سنگین جرم اور قانون کی خلاف ورزی سمجھا جاتا تھا۔ روم کے قانونی اور سماجی نظام میں قانون کی پاسداری بہت اہمیت کی حامل تھی۔ مصنف چوں کہ مختلف سماجی پس منظر سے آئے تھے اس لیے وہ قانون کی سختی سے ناواقف تھے۔ انھوں نے چالان وقت پر ادا نہ کیا تو انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ عدالت میں جج کے سامنے آتے ہی وہ شدید خوف زدہ ہو گئے۔ خوف کے باوجود وہ کانپنے تک کی ہمت نہ کر سکے۔ جج نے انھیں کٹہرے میں کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ خوف اور شرمندگی سے ان پر تشنج جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے وہ خود کو مکمل طور پر بے بس محسوس کر رہے تھے۔ کٹہرا لکڑی کا وہ جنگلا ہوتا ہے جس میں عدالت میں دورانِ جرح ملزم اور گواہوں وغیرہ کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مصنف اپنی کوتاہی پر شرمندہ تھے کہ وہ مجرموں اور ملزموں کی طرح کٹہرے میں کھڑے تھے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے جیسے جسم میں جان نہ ہو۔ وہ ایک مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ کٹہرے میں کھڑے ہونا محض ایک رسمی کارروائی نہیں تھی بلکہ قانون کی طاقت کا اظہار تھا۔

جج نے ان سے سوال کیا کہ جب انھیں چالان جمع کرانے کا حکم دیا گیا تھا تو انھوں نے اسے کیوں نظر انداز کیا۔ جج نے یہ نہیں پوچھا کہ ان کی نیت کیا تھی یا انھیں چالان جمع کرانا یاد کیوں نہیں رہا۔ جج سیدھا یہ باور کرا رہا تھا کہ انھوں نے غلطی کی ہے اور اس کے کچھ نتائج ہیں۔ عدالت میں عمل کو دیکھا جاتا ہے، نیت کو نہیں۔ مصنف نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ انھیں واقعی چالان وقت پر ادا کر دینا چاہیے تھا۔ ان سے کوتاہی ہو گئی۔ جج نے ان کے جواب کو قبول کرنے کی بجائے مزید سخت سوالات کیے۔ جج نے ان کی بات کاٹ کر کہا کہ اس کوتاہی کی وجہ سے پولیس کا، عدالت کا اور عدالتی عملے کا وقت ضائع ہوا ہے۔ دراصل جج، مصنف کو قانون کے نفاذ میں تاخیر کے نقصان کا احساس دلا رہا تھا۔ کسی قانونی خلاف ورزی کی صورت میں ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کرنا کسی فرد کا ذاتی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ پورے نظام پر بوجھ بن جاتا ہے۔ اس معاملے میں بھی پولیس کو بار بار چالان کے بارے میں یاد دہانی کرانی پڑی تھی، جس پر بھاری اخراجات آئے تھے۔ عدالتی عملے کو فائلیں دیکھنی پڑی تھیں اور جج کو اپنا قیمتی وقت دینا پڑا تھا۔ اس سارے عمل میں کئی افراد کا وقت اور توانائی خرچ ہوئی تھی۔ یہ توانائی اور وقت معاشرے کے دیگر اہم کاموں میں بھی صرف ہو سکتا تھا۔ اس لیے جج نے مصنف کو ان کی کوتاہی پر غور کرنے کو کہا۔

جج کا کام عدل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی سماجی نظام میں جج کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ جج کا ہر فیصلہ عدل

وانصاف کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں بھی عدل و انصاف پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

ترجمہ: انصاف کرو، یہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ (المائدہ آیت:08)

اگر کسی معاشرے میں عدل کا نظام پائیدار ہو اور مجرموں کو ان کے جرائم کی قرار واقعی سزا ملے تو وہ معاشرہ ضرور ترقی کرتا ہے۔ عدل کے بغیر معاشرہ بدامنی اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ لوگ عدمِ اعتماد کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور معاشرہ پستی میں گر جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

"کفر کا نظام تو چل سکتا ہے لیکن ظلم کا نظام نہیں چل سکتا۔"

ظلم کا مطلب عدل و انصاف کا نہ ہونا ہے۔ عدل و انصاف کے بغیر معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے جج کو فیصلہ دینے سے پہلے معاملے کے ہر پہلو کا بغور جائزہ لینا چاہیے۔ اس واقعہ میں بھی جج نے پورے واقعے کا اچھی طرح جائزہ لے کر اس کے نتائج کا ذکر کیا ہے۔

یہ واقعہ صرف ایک فرد کے چالان نہ جمع کرانے کی کہانی نہیں بلکہ ایک وسیع تر قانونی اور سماجی پس منظر کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں عدالت، قانون، نظامِ انصاف اور افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک معمولی سی کوتاہی کیسے ایک بڑے قانونی معاملے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ قوانین کی پاسداری محض ایک بوجھ نہیں بلکہ ایک ضروری عمل ہے۔ قانون کی پاسداری سے ہی معاشرہ، مہذب اور مضبوط بنتا ہے۔

عبارت نمبر 8

ہم اس کے بارے میں آپ کو کڑی سزا دیں گے۔ میں نے کہا: میں یہاں پر ایک فارنر ہوں۔ پردیسی ہوں۔ جیسا ہمارا بہانہ ہوتا ہے، میں کچھ زیادہ آداب نہیں سمجھتا۔ قانون سے میں واقف نہیں ہوں تو مجھ پر مہربانی فرمائیں۔ انھوں نے کہا: آپ زبان تو ٹھیک ٹھاک بولتے ہیں۔ وضاحت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کرتے ہیں تو میں چپ کر کے کھڑا رہا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ عدالت آپ سے پوچھتی ہے کہ آپ کون ہیں اور آپ کا پیشہ کیا ہے؟ میں نے کہا: میں ایک ٹیچر ہوں، پروفیسر ہوں روم یونی ورسٹی میں، تو وہ جج صاحب کرسی کو سائیڈ پر کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے اعلان کیا:

"Teacher in th Court, Teacher in the Court."

جیسے اعلان کیا جاتا ہے، اور وہ سارے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ منشی، تھانے دار، عمل دار جتنے بھی تھے، اور اس نے حکم دیا کہ:

"A Teacher has come to the court,Chair should be brought for th teacher."

اب وہ کٹہرا چھوٹا سا، میں اس کو پکڑ کر کھڑا ہوں۔ وہ کرسی لے آئے۔ حکم ہوا کہ تو Teacher ہے، کھڑا نہیں رہ سکتا۔ جج نے کہا کہ اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان! اے محترمِ انسانیت! آپ نے ہی ہم کو عدالت اور عدل کا حکم دیا ہے، اور آپ ہی نے ہم کو یہ علم پڑھایا ہے اور آپ ہی کی بدولت ہم اس جگہ پر براجمان ہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ وہ جس زمانے میں روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے، گرمیوں کی ایک دوپہر کو سڑک پر رش نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ وہ چالان وقت پر ادا کرنا بھول گئے جس کی وجہ سے انھیں عدالت میں طلب کیا گیا۔ عدالت میں پہنچے تو وہ نہایت خوف زدہ ہو گئے۔ جج نے ان سے نہایت سختی سے بات کی اور کہا کہ آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی وجہ سے پولیس اور عدالت کا کتنا وقت ضائع ہوا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ جج اور دیگر عملہ انھیں گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہاں کوئی بیورو کریٹ

ہو یا کوئی جج، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ، استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم کے زمانے میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مصنف روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس کے ساتھ دن کے وقت وہ براڈ کاسٹنگ کرتے تھے۔ ایک دن گھر واپس جاتے ہوئے انھوں نے سڑک پر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی۔ پولیس اہلکار نے ان کا چالان کر دیا اور جرمانہ قریبی ڈاک خانے میں جمع کرانے کی ہدایت کی۔ مصنف نے لاپروائی کی اور بروقت جرمانہ جمع نہ کرایا۔ محکمے کی طرف سے انھیں دو مرتبہ یاد دہانی کرائی گئی لیکن انھوں نے کسی تنبیہ کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ مصنف کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے معاملہ قانونی کارروائی میں بدل گیا اور انھیں عدالت نے طلب کر لیا۔ ابتدا میں جج نے ان پر سختی کی، عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے پر ناراضی کا اظہار کیا اور سخت سزا دینے کی بات کی۔

مصنف نے عدالت میں بتایا کہ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے وہ اجنبی ملک کے قوانین اور آداب سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی مشکلات کا ذکر کیا اور عدالت سے درگزر کرنے کی درخواست کی۔ عدالت میں مصنف نے ساری گفت گو وہاں کی رومن زبان میں کی۔ جج نے فوراً ان کی زبان و بیان پر گرفت کی کیوں کہ وہ نہ صرف روانی سے مقامی زبان میں گفت گو کر رہے تھے بلکہ اپنے مؤقف کی وضاحت بھی بخوبی کر رہے تھے۔ اس لیے لاعلمی کا بہانہ بے بنیاد تھا۔ اس کے بعد جج نے ان سے ان کی شناخت پوچھی اور ان کا پیشہ دریافت کیا۔ مصنف کو اپنے بے بنیاد بہانے پر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا اس لیے خاموش کھڑے رہے۔ جج نے دوبارہ ان سے ان کی شناخت اور پیشے کے بارے میں استفسار کیا۔ مصنف نے بتایا کہ وہ روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔

جیسے ہی مصنف نے اپنا پیشہ بتایا، عدالت کا ماحول یکسر بدل گیا۔ جج نے فوراً اپنی کرسی کو ایک طرف ہٹایا اور بلند آواز میں اعلان کیا: **"ٹیچر ان دی کورٹ، ٹیچر ان دی کورٹ"** یعنی عدالت میں ایک استاد تشریف لائے ہیں۔ جیسے ہی یہ اعلان ہوا وہاں موجود تمام افراد کھڑے ہو گئے۔ عدالت میں جج، منشی، تھانیدار، عدالت کے اہلکار سب کے سب احتراماً کھڑے تھے۔ مصنف جو چند لمحے قبل ایک مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑے تھے، اچانک ایک معزز شخصیت میں تبدیل ہو گئے۔ جج نے حکم دیا کہ استاد کے لیے کرسی لائی جائے کیوں کہ استاد کھڑے نہیں رہ سکتے۔ استاد کے احترام کا تقاضا تھا کہ ان کو عدالت کے کٹہرے میں بھی بیٹھنے کے لیے ایک کرسی پیش کی جائے۔ یہ ایک بہت غیر معمولی لمحہ تھا۔ عدالت میں قانون جو کہ سب کے لیے یکساں ہوتا ہے، خود استاد کے احترام میں جھک گیا تھا۔ بقول فلاسفر:

"علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا"

مصنف کے لیے یہ ایک جذباتی منظر تھا۔ وہ چھوٹے سے کٹہرے کو تھامے کھڑے تھے۔ کٹہرے کی اس محدود جگہ میں ان کے لیے ایک کرسی رکھی گئی اور استاد کو احترام کے ساتھ اس پر بٹھایا گیا۔ اس سے اہلِ روم کی تہذیب کی ایک اور خوبی نمایاں ہوتی ہے۔ اہلِ روم قانون کی سختی کے لیے مشہور تھے لیکن علم اور اس کے وارثوں کو غیر معمولی عزت دیتے تھے۔ جج نے استاد کو نہ صرف کرسی پیش کی بلکہ باوقار لہجے میں استاد کی تعریف بھی کی۔ اس نے استاد کی عظمت، اس کے مقام اور اس کے کردار کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جج نے کہا:

"اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان! اے محترمِ انسانیت! آپ نے ہی ہم کو عدالت کا اور عدل کا حکم دیا ہے۔ آپ ہی نے ہم کو یہ علم پڑھایا ہے اور آپ ہی کی بدولت ہم اس مقام پر فائز ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے فرمان کے مطابق مجبور ہیں۔"

ان جملوں میں استاد کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے کہ وہ محترم ترین انسان ہے۔ وہ طلبا کو تعلیم دیتا ہے اور ان کے دل و دماغ کو علم کے نور سے منور کرتا ہے۔ وہ معاشرے میں اچھی اقدار کے فروغ کی جدوجہد کرتا ہے۔ وہ عدل، مساوات اور قانون کے احترام کا درس دیتا ہے۔ اسی کے دیے گئے علم کی بدولت جج عدالت میں عدل پر مبنی فیصلے کرتے ہیں۔ اسی عدل کی وجہ سے

معاشرے میں امن و سکون قائم رہتا ہے اور معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ جج نے استاد کے احترام میں جو کچھ کہا وہ الفاظ محض رسمی جملے نہیں تھے۔ یہ جملے اس پورے سماجی اور ثقافتی شعور کا عکس تھے جو اہلِ روم کے اندر موجود تھا۔ اس معاشرے میں قانون کے احترام کی روایت تھی۔ اس روایت کا شعور دینے میں استاد کا کردار سب سے اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے وہ استاد کو سب سے اعلیٰ مقام پر رکھتے تھے۔ جج کے الفاظ بھی اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ وہ استاد کو کسی عام فرد کے طور پر نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر میں استاد ایک ایسا انسان تھا جس نے اسے قانون اور عدل سکھایا اور اسے علم کی روشنی دی۔ آج اسی علم کے بل بوتے پر وہ عدالت میں فیصلے سنا رہا تھا۔

اسلام میں بھی استاد کے احترام پر بہت زور دیا گیا ہے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے اپنی ایک حیثیت معلم بھی بتائی ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً

ترجمہ: **بے شک مجھے معلم (استاد) بنا کر بھیجا گیا ہے۔**

اس حدیثِ مبارکہ سے استاد کے مقام و مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"جس نے مجھے ایک حرف سکھایا۔ میں اس کا غلام بن گیا۔"

استاد کا مقام بہت بلند ہے۔ استاد کے احترام میں کامیابی اور برکت ہے۔ جو قومیں استاد کا احترام کرتی ہیں وہ ضرور ترقی اور عروج حاصل کرتی ہیں۔ روم کی مثال اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

عبارت نمبر 9

اس لیے ہم آپ کے فرمان کے مطابق مجبور ہیں۔ عدالت نے جو ضابطہ قائم کیا ہے، اس کے تحت آپ کو چیک کریں، باوجود اس کے کہ ہمیں اس بات کی شرمندگی ہے، اور ہم بے حد افسردہ ہیں کہ ہم ایک استاد کو جس سے محترم، اور کوئی نہیں ہوتا، اپنی عدالت میں ٹرائل کر رہے ہیں، اور یہ کسی بھی جج کے لیے انتہائی تکلیف دہ موقع ہے کہ کورٹ میں، کٹہرے میں ایک استادِ مکرم ہو اور اس سے Trial کیا جائے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، گرمیوں کے موسم میں روم میں سب لوگ دوپہر کو سونے کے عادی تھے۔ لہٰذا دوپہر کے وقت سڑک پر رش نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ وقت پر چالان ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت میں طلب کیا گیا۔ جج نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ وہ پردیسی ہیں، یہاں کے قانون نہیں جانتے۔ پیشے کے لحاظ سے استاد ہیں۔ یہ سن کر وہاں موجود جج سمیت سب لوگ کھڑے ہو گئے اور مصنف کے لیے کرسی لائی گئی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے لوٹے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ معزز آدمی ہیں۔ ریکٹر سے پوچھنے پر معلوم ہوا یہاں کوئی بیوروکریٹ ہو یا جج، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ، سب استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم کے زمانے میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مصنف روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس کے ساتھ وہ دن کے وقت ریڈیو پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس جاتے ہوئے انھوں نے سڑک پر ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی۔ موقع پر موجود ٹریفک پولیس

اہلکار نے ان کا چالان کر دیا اور جرمانہ کسی قریبی ڈاک خانے میں جمع کرانے کی ہدایت کی۔ مصنف نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور مقررہ وقت پر جرمانہ جمع نہ کرایا۔ حکومت نے یاد دہانی کے طور پر انھیں دو مرتبہ تار کے ذریعے یاد دہانی بھی کرائی لیکن مصنف نے اسے نظر انداز کر دیا۔ مصنف کے اس رویے کی وجہ سے معاملہ قانونی کارروائی میں تبدیل ہو گیا اور انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ عدالت کا وقت ضائع کرنے پر جج نے برہمی کا اظہار کیا۔ مصنف نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ جج نے مصنف سے پوچھا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ جیسے ہی مصنف نے بتایا کہ وہ روم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، جج اور عدالت میں موجود تمام حاضرین احترام میں کھڑے ہو گئے۔ جج نے ان کے لیے کرسی منگوائی اور کٹہرے میں انھیں کرسی پر بٹھایا گیا۔ پھر جج نے ان کے لیے کچھ تعظیمی کلمات بھی ادا کیے۔ بقول فلاسفر:

"رشتے خون کے نہیں، احساس کے ہوتے ہیں۔ اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ اگر احساس نہ ہو تو اپنے بھی اجنبی ہو جاتے ہیں۔"

یہ منظر محض ایک شخص کے احترام کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ پورے معاشرتی رویے کا مظہر تھا کہ استاد کا مقام کتنا بلند ہے۔ علم، تربیت اور قوم کی تعمیر میں کردار کی وجہ سے استاد کو بہت عظمت دی جاتی ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو ہمیں اسلامی تعلیمات میں نظر آتا ہے۔ اسلام نے استاد کو معاشرے میں بہت بلند مقام عطا کیا ہے۔ حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

"مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔" (ابن ماجہ)

اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ تعلیم دینا اور لوگوں کی تربیت کرنا ایک مقدس عمل ہے۔ اس لیے اس کام کو انجام دینے والوں کا رتبہ سب سے بلند ہے۔

اسلامی تاریخ بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جہاں استاد کا مقام ہمیشہ بلند رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ بہت بڑے فقیہ اور عالم تھے۔ وہ اپنے استاد امام حمادؒ کے احترام میں کبھی ان کے گھر کی طرف پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ یہ ایک مثال ہے کہ کس طرح علم و ادب کے حقیقی قدر دان استاد کے مقام کو سمجھتے اور استاد کا احترام کرتے تھے۔ بقول فلاسفر:

"انسان کی پہچان علم سے نہیں بلکہ ادب سے ہوتی ہے۔"

جج نے استاد کے احترام میں تعظیمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہی نے ہماری تربیت کی ہے اور ہمیں انصاف کے اصولوں کے مطابق فیصلے کرنے کا درس دیا ہے۔ آپ نے ہی ہمیں عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ہی کے دیے گئے علم کی بدولت ہم اس منصب پر بیٹھے ہیں اور عدل کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ اب آپ عدالت میں ہیں تو آپ کی دی گئی تربیت کے مطابق ہم انصاف کرنے پر مجبور ہیں۔ چناں چہ عدالت نے جو ضابطے قائم کیے ہیں ہم انھی ضابطوں کے مطابق آپ کے مقدمے کا جائزہ لیں گے۔ معاشرے میں استاد سے زیادہ محترم کوئی نہیں ہوتا اس لیے ہم شرمندگی کے ساتھ عدالت میں آپ کا ٹرائل کریں گے۔ یہ ہمارے منصب کا تقاضا اور قانون کی مجبوری ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرحلے پر ایک کربناک حقیقت سامنے آتی ہے۔ جج عدلیہ کے ضوابط پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ وہ واضح کرتا ہے کہ وہ عدالتی اصولوں کے مطابق استاد کا ٹرائل کرنے پر مجبور ہے۔ وہ شرمندگی اور افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو علم و اخلاق کا نمونہ ہوتا ہے، عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور اسے قانونی کارروائی کا سامنا ہے۔ جج کہتا ہے کہ عدل و انصاف کرنا ایک بنیادی اصول ہے اور عدالت کو اس اصول کی پاسداری کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے استاد جیسے بلند مرتبہ شخص کے خلاف بھی اگر قانون کے مطابق کوئی مقدمہ درج ہوا ہے تو عدالت کو اس کا بھی ٹرائل کرنا ہوگا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ

قانون سب کے لیے برابر ہے، چاہے کوئی عام شہری ہو یا کوئی معزز و محترم استاد۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

ترجمہ: عدل کرو، وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

یہ واقعہ استاد کے احترام اور عدلیہ کی ذمہ داریوں کے درمیان ایک نازک توازن کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک طرف معاشرے میں استاد کا وقار اتنا بلند ہے کہ جج تک اس کا احترام کرنے پر مجبور ہے، دوسری طرف عدلیہ کو قانون کے دائرے میں رہ کر انصاف بھی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کو بھی نمایاں کرتی ہے کہ بعض اوقات قانون کے تقاضے اور انسانی جذبات ایک دوسرے سے متصادم ہو سکتے ہیں، لیکن ایک مہذب معاشرے میں عدل و انصاف کو ہمیشہ مقدم رکھا جاتا ہے۔ بقول علامہ محمد اقبال:

"عدل و انصاف قائم رکھنا لازم ہے، گویا اجتماعی سطح پر بھی اور انفرادی سطح پر بھی لازم اور ضروری ہے۔"

اس واقعے سے یہ درس بھی ملتا ہے کہ عدل کا معیار ہر شخص کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنے اساتذہ کی عزت و تکریم میں بھی کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔ ایک استاد محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک قوم کی تعمیر کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی عزت و احترام کو ہر سطح پر برقرار رکھنا ضروری ہے۔ معاشرے کو ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے کہ اساتذہ کو کبھی ایسے حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ انھیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے۔

عبارت نمبر 10

اب میں شرمندہ اپنی جگہ پر، یا اللہ! یہ کیا شروع ہو رہا ہے؟ میں نے کہا: حضور! جو بھی آپ کا قانون ہے، جیسے بھی آپ کا ضابطہ ہے، اس کے مطابق کریں، میں حاضر ہوں۔ تو انھوں نے کہا: ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ اور نہایت دکھ کے ساتھ اور گہرے الم کے ساتھ آپ کو ڈبل جرمانہ کرتے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپیہ ہو گیا۔ اب جب میں کرسی سے اٹھ کر کٹہرے میں سے نکل کر شرمندہ، باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جو جج، اس کا عملہ تھا، اس کے جتنے تھے، وہ سارے جناب میرے پیچھے پیچھے (A teacher in the court) کہتے جا رہے تھے کہ ہم احترام فائقہ کے ساتھ آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ میں کہوں، میری جان چھوڑیں۔ یہ باہر نکل کر میرے ساتھ کیا کریں گے۔ آگے تک میری موٹر تک مجھے چھوڑ کے آئے۔ جب تک میں وہاں سے سوار نہیں ہو گیا، وہ عملہ وہاں پر ایسے ہی کھڑا تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے، گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت سڑک پر رش نہ ہونے کے باعث انھوں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ وقت پر چالان ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت میں طلب کیا گیا۔ جج کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ پروفیسر ہیں اور روم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ یہ سنتے ہی عدالت میں موجود سب لوگ ان کی عزت و تکریم میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے لیے کرسی لائی گئی اور انھیں حکم ہوا کہ استاد کٹہرے میں کھڑا نہیں رہ سکتا، آپ کرسی پر براجمان ہوں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے لوٹے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ معزز آدمی ہیں۔ اپنے رجسٹرار سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کوئی بوڑھا کریٹ ہو یا جج، تاجر ہو یا فیوڈل لارڈ، سب استاد کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے قدیم روم کے زمانے میں غلام اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مصنف روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس کے ساتھ وہ دن کے وقت ریڈیو پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس جاتے ہوئے انھوں نے سڑک پر ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی۔ موقع پر موجود ٹریفک پولیس اہل کار نے ان کا چالان کر دیا اور جرمانہ کسی قریبی ڈاک خانے میں جمع کرانے کی ہدایت کی۔ مصنف نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور مقررہ وقت پر جرمانہ جمع نہ کرایا۔ حکومت نے یاد دہانی کے طور پر انھیں دو مرتبہ تار کے ذریعے تنبیہ بھی کی لیکن مصنف نے اسے نظر انداز کر دیا۔ مصنف کے اس رویے کی وجہ سے معاملہ قانونی کارروائی میں تبدیل ہو گیا اور انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ عدالت کا وقت ضائع کرنے پر جج نے برہمی کا اظہار کیا۔ مصنف نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ جج نے مصنف سے پوچھا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ جیسے ہی مصنف نے بتایا کہ وہ روم یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں، جج اور عدالت میں موجود تمام حاضرین احترام میں کھڑے ہو گئے۔ جج نے ان کے لیے کرسی منگوائی اور کٹہرے میں انھیں کرسی پر بٹھایا گیا۔ پھر جج نے ان کے لیے کچھ تعظیمی کلمات بھی ادا کیے۔ بقول فلاسفر:

"ہر انسان میں خوبی اور خامی دونوں موجود ہوتی ہیں بس فرق اتنا ہے کہ جو تراشتا ہے اُسے خوبی نظر آتی ہے اور جو تلاشتا ہے اُسے خامی نظر آتی ہے۔"

مصنف کہتے ہیں کہ جج نے استاد کے احترام کے ساتھ ساتھ اپنے منصب کے تقاضوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ اس نے واضح کر دیا کہ ان کا ٹرائل بھی عدالت کے ضابطوں کے تحت ہوگا۔ مصنف نے انھیں بتایا کہ وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں اور جج قانون کے مطابق جو فیصلہ کریں گے انھیں قبول ہوگا۔ جج نے کہا کہ ہم نہایت شرمندگی اور افسوس کے ساتھ آپ کے جرمانے کی رقم کو دوگنا کرتے ہیں۔ جرمانہ بارہ آنہ تھا۔ مصنف نے اپنی غیر سنجیدگی کی وجہ سے معاملہ بگاڑ لیا اور وقت پر جرمانہ ادا نہیں کیا تھا۔ اس لیے عدالت نے جرمانہ ڈیڑھ روپیہ کر دیا۔

عدل و انصاف کا یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ جج نے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے فیصلہ دیا۔ جج نے اگرچہ کھڑے ہو کر استاد کو عزت دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے قانون کی بالادستی کو فراموش نہیں کیا۔ قانون کے سامنے سب برابر ہوتے ہیں۔ اگر ایک عام شہری کو غلطی پر سزا دی جاتی ہے تو ایک استاد کو بھی قانون کے دائرے میں رکھنا عدالت کی ذمہ داری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جج نے مصنف کو شرمندگی کے باوجود جرمانے کی سزا دی، بلکہ ان کا جرمانہ ڈبل کر دیا۔ اس فیصلے میں ایک بڑی حکمت چھپی تھی۔ جج نے درحقیقت یہ ثابت کیا کہ عدل کا نظام شخصیات کے احترام سے مشروط نہیں ہوتا۔

معاشرے کی بقا کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہر فرد کو اس کی معاشرتی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر انصاف دیا جائے۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

"ریاست کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتی ہے، لیکن ظلم کے ساتھ نہیں۔"

انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرنا عدل نہیں، ظلم کہلاتا ہے۔ اگر جج مصنف کے استاد ہونے کی وجہ سے انھیں معاف کر دیتا ہے تو یہ عدل کے اصولوں کے خلاف اور ظلم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ان کا احترام اپنی جگہ برقرار رکھا مگر قانون کی بالادستی کو بھی مقدم رکھا۔ یہ وہی اصول ہے جو اسلامی تاریخ میں حضرت عمرؓ کے دور میں بھی نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے قریبی رشتہ داروں تک کو قانون کے مطابق سزا دی اور کبھی کسی کے مرتبے یا حیثیت کو عدل کے تقاضوں پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

مصنف کہتے ہیں کہ سزا سننے کے بعد وہ کرسی سے اٹھے اور کٹہرے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ عدالت میں جو کچھ ہوا وہ ان کی توقعات کے بالکل الٹ تھا۔ عدالت میں استاد کا احترام اور قانون کی پاسداری دیکھ کر وہ حیران اور شرمندہ تھے۔ جب وہ

عدالت سے باہر نکلنے لگے تو ایک حیران کن منظر سامنے آیا۔ جج، منشی اور دیگر عدالتی عملہ بھی ان کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ بار بار "ٹیچران دی کورٹ" کہہ رہے تھے۔ یہ ان کی طرف سے اعلان تھا کہ ہم آپ کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مصنف کو یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا لیکن وہ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ عدالت کے باہر وہ ان کے ساتھ اور کیا کریں گے۔ مصنف اپنی کار تک پہنچے اور کار میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ کر دیا۔ وہ عملہ وہاں ایسے ہی کھڑا رہا۔ وہ لوگ مصنف کو رخصت کرنے کے بعد وہاں سے واپس گئے۔ یہ اس عقیدت اور احترام کا اظہار تھا جو ایک مہذب اور باشعور معاشرہ اپنے استاد کے لیے رکھتا ہے۔ مصنف خود بھی حیران اور شرمندہ تھے کہ وہ ایک قانونی غلطی کے مرتکب ہوئے مگر اس کے باوجود انھیں وہ احترام دیا جا رہا تھا جو کسی عظیم شخصیت کو دیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کامیاب معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں احترام اور قانون ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں صرف عزت و احترام ہو اور قانون کمزور ہو جائے تو وہاں اقربا پروری اور بدعنوانی جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس اگر قانون مضبوط ہو لیکن لوگوں کی عزتِ نفس اور اخلاقیات نہ ہوں تو معاشرہ بنجر اور بے روح ہو جاتا ہے۔ حقیقی انصاف وہ ہے جو جذبات اور اصولوں کے درمیان توازن قائم رکھے۔

عبارت نمبر 11

اب میں لوٹ کے آیا تو میں سمجھا، یا اللہ! میں بڑا معزز آدمی ہوں، اور محلے والوں کو بھی آ کر بتایا کہ میں ایسے گیا تھا اور وہاں یہ یہ ہوا۔ وہ بھی جناب، اور میری جو لینڈ لیڈی تھی، وہ بھی بڑی خوشی کے ساتھ محلے میں چوڑی ہو کے گھوم رہی تھی کہ دیکھو ہمارا یہ ٹیچر گیا، اور کورٹ نے اتنی عزت کی۔ اس کی عزت افزائی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگا۔ دیسی آدمی جو ہے ناں وہ چاہے ٹیچر بھی ہو، وہ گریڈ کا ضرور سوچے گا۔ کتنی بھی آپ عزت دے دیں، کتنا بھی احترام دے دیں، وہ پھر بھی ضرور سوچے گا کہ مجھے کہیں سے چار پیسے بھی ملیں گے کہ نہیں، میں نے اپنے ریکٹر سے پوچھا، تو اس نے کہا: نہیں تنخواہ یہاں پروفیسر کی اتنی ہی ہے جتنی تمھارے پاکستان میں ہے۔ وہ کوئی مالی طور پر اتنے بڑے نہیں ہیں، لیکن عزت کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں۔ رتبہ ان کا بہت زیادہ ہے، اور کوئی شخص یہاں کوئی بیوروکریٹ ہو، یہاں کوئی جج ہو۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہاں کا تاجر ہو، یہاں کا فیوڈل لارڈ ہو، وہ استاد کے رتبے کے پیچھے اس طرح چلتا ہے، جیسے روم کے دنوں میں غلام اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چلتے تھے مالی طور پر وہ بھی بے چارے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے کہ مالی طور پر کمتر ہیں لیکن رتبے کے اعتبار سے بہت اونچے ہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ایک دن گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت سڑک پر رش نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے ٹریفک قانون کی پاس داری نہیں کی اور ان کا چالان ہو گیا۔ چالان وقت پر ادا نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ جج کے پوچھنے پر انھوں نے جواب دیا کہ وہ پردیسی ہیں، یہاں کے قوانین سے واقف نہیں۔ وہ روم یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ یہ سنتے ہی جج اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور عدالت میں موجود تمام لوگ ان کی عزت و تکریم میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے لیے کرسی لائی گئی۔ جج نے نہایت نرمی سے ان سے بات کی اور جب وہ کورٹ سے نکلنے لگے تو جج، اس کا عملہ، اس کے منشی انھیں گاڑی تک چھوڑنے آئے اور جب تک گاڑی چلی نہیں، وہ سب ان کی تعظیم میں وہیں کھڑے رہے۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے۔ اس لیے اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح

اشفاق احمد پاکستان کے ایک نامور ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی تحریریں زندگی کے گہرے مشاہدات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی تجربات قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مصنف روم یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس کے ساتھ وہ دن کے وقت ریڈیو پر براڈ کاسٹنگ بھی کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس جاتے ہوئے انھوں نے سڑک پر ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی۔ موقع پر موجود ٹریفک پولیس اہلکار نے ان کا چالان کر دیا اور جرمانہ کسی قریبی ڈاک خانے میں جمع کرانے کی ہدایت کی۔ مصنف نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور مقررہ وقت پر جرمانہ جمع نہ کرایا۔ حکومت نے یاد دہانی کے طور پر انھیں دو مرتبہ تار کے ذریعے تنبیہ بھی کی لیکن مصنف نے اسے نظر انداز کر دیا۔ مصنف کے اس رویے کی وجہ سے معاملہ قانونی کارروائی میں تبدیل ہو گیا اور انھیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ عدالت کا وقت ضائع کرنے پر جج نے برہمی کا اظہار کیا۔ مصنف نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ جج نے مصنف سے پوچھا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ جیسے ہی مصنف نے بتایا کہ وہ روم یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں، جج اور عدالت میں موجود تمام حاضرین احترام میں کھڑے ہو گئے۔ جج نے ان کے لیے کرسی منگوائی اور کٹہرے میں انھیں کرسی پر بٹھایا گیا۔ پھر جج نے ان کے لیے کچھ تعظیمی کلمات بھی ادا کیے۔

مصنف جب عدالت میں پیش ہوئے تو جو کچھ وہاں ہوا، وہ محض ایک عدالتی کارروائی نہیں تھی بلکہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ اس تجربے نے انھیں استاد کے مقام، عزت اور انصاف کے حقیقی مفہوم سے روشناس کرایا۔ اگرچہ عدالت نے قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے ان کے جرمانے کی رقم بڑھا دی تھی مگر انھیں جو احترام دیا وہ کسی سیاست دان یا بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ جج اور عدالتی عملے نے ان کے استاد ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ بے حد عزت و تکریم کا مظاہرہ کیا۔ جج نے ان کے بیٹھنے کے لیے کرسی منگوائی اور سب لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ عدالتی کارروائی کے بعد جب وہ عدالت سے رخصت ہو رہے تھے تو جج سمیت تمام عدالتی عملہ ان کے پیچھے پیچھے ''ٹیچر ان دی کورٹ'' کہتا ہوا چلتا رہا۔ قانونی خلاف ورزی کے باوجود اس قدر عزت ملنے پر مصنف خود بھی حیرت میں مبتلا تھے۔

مصنف عدالت سے واپس آئے تو دل میں ایک خوش گوار احساس تھا۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ بہت معزز آدمی ہیں۔ انھوں نے بہت فخریہ انداز میں محلے والوں کو بتایا کہ کس طرح عدالت میں ان کی عزت افزائی ہوئی۔ محلے کے لوگ بھی بہت خوش ہوئے۔ ان کی لینڈ لیڈی کو خاص طور پر بہت خوشی ہوئی۔ وہ بڑے فخر سے محلے میں گھومتی پھرتی اور سب کو بتاتی کہ مصنف کو ایک استاد ہونے کی وجہ سے عدالت میں کتنی عزت دی گئی۔ انھیں فخر محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا کرائے دار ایک معزز آدمی ہے۔

عدالت اور محلے میں اتنی عزت ملنے پر مصنف کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انھوں نے سوچا کہ عزت اپنی جگہ، مگر کیا اس عزت کا کوئی مالی فائدہ بھی ہوگا۔ ایک دیسی آدمی کو جب عزت ملتی ہے تو وہ ساتھ ہی مالی فائدے کا بھی سوچتا ہے۔ دیسی آدمی کو عزت و احترام کے ساتھ گریڈ اور تنخواہ میں اضافے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ سوچنے لگے کہ شاید اب ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ عزت اور احترام کا احساس اپنی جگہ مگر معاشی استحکام بھی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ انھوں نے اپنی یونی ورسٹی کے ریکٹر سے دریافت کیا کہ کیا عدالت میں ملنے والے اس غیر معمولی احترام کے بعد ان کی تنخواہ میں بھی کوئی اضافہ ہوگا؟ ریکٹر نے جواب دیا کہ نہیں، پروفیسر کی تنخواہ وہی رہے گی جو پہلے تھی۔ اس نے مزید بتایا کہ یہاں استاد کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہوتے اس کی عزت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ استاد کو کوئی بہت بڑی سہولتیں نہیں ملتیں مگر عزت میں وہ دوسرے شعبوں کے افراد سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کوئی شخص خواہ جج ہو، بیوروکریٹ ہو، تاجر ہو یا کوئی سیاستدان، استاد کے سامنے احترام سے جھکتا ہے۔ یہاں استاد کا رتبہ وہی ہے جو کبھی غلامی کے دور میں کسی آقا کا ہوتا تھا۔ ہر کوئی غلام کی طرح استاد کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس کے احترام میں جھکتا ہے۔ مگر اس عزت افزائی کے باوجود استاد کی مالی حیثیت ایک عام آدمی جیسی ہوتی ہے۔ استاد کا کمال یہی ہے کہ مالی طور پر کمتر ہونے کے باوجود رتبے کے اعتبار سے سب سے اونچا ہے۔

عزت و احترام کا یہ تصور ہمارے مشرقی معاشرے کے برعکس تھا۔ ہمارے ہاں عام طور پر کسی کے عزت دار ہونے کا مطلب اس کا مالی طور پر مستحکم ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص عزت دار ہے تو لوگ توقع کرتے ہیں کہ وہ دولت مند بھی ہوگا۔ لیکن

مغرب میں استاد کی عزت کا معیار دولت مندی نہیں بلکہ اس کی علمی حیثیت ہے۔ وہاں استاد کو کوئی شاہانہ طرزِ زندگی نہیں رکھتا مگر پھر بھی اس کے سامنے جج بھی کھڑا ہوتا ہے، تاجر بھی جھک جاتا ہے اور ایک عام شہری بھی اس کے احترام میں خاموش ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی استاد کا مقام بہت بلند ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

دراصل علم دینے کے لیے استاد ضروری ہے، علم فرض ہے تو علم دینے والا استاد کتنا مقدس اور عظیم ہوگا۔ استاد کی عظمت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ استاد کی عظمت اس کی علمی حیثیت اور کردار کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک متوازن معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں استاد کو عزت کے ساتھ ساتھ خوش حال زندگی بھی فراہم کی جائے۔ اگر استاد معاشی طور پر پریشان ہوگا تو وہ اپنی پوری توجہ تعلیم دینے پر مرکوز نہیں کر سکے گا۔ یہ چیز قوم کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ استاد کی مالی ضروریات کو نظر انداز کرنا بھی ناانصافی ہوگی۔ معاشرتی ترقی کے لیے استاد کو عزت و احترام کا اعلیٰ مقام دینا ضروری ہے۔

مشقی سوالات

سوال نمبر ۱: مختصر جواب دیجیے:

۱۔ **اشفاق احمد کی کتاب ''زاویہ'' کن موضوعات پر مشتمل ہے؟**

جواب۔ اشفاق احمد کی کتاب زاویہ میں بصیرت افروز اور نوجوانوں کی فکری راہ نمائی کے موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ **اشفاق احمد روم میں کون سے دو فرائض انجام دیتے تھے؟**

جواب۔ اشفاق احمد روم میں لیکچرر تھے اور اردو براڈ کاسٹنگ کرتے تھے۔

۳۔ **روم میں اکثر لوگ دوپہر کا وقت کیسے گزارتے ہیں؟**

جواب۔ روم میں لوگ دوپہر کے وقت قیلولہ کرتے ہیں۔ چار بجے سوتے ہیں اور سڑکیں خالی ہو جاتی ہیں۔

۴۔ **اشفاق احمد کا چالان کیوں ہوا؟**

جواب۔ اشفاق احمد کا چالان غلط جگہ سے سڑک پار کرنے کی وجہ سے ہوا۔ انھوں نے ایک تو قانون توڑا اور دوسرا وہاں کھڑے پولیس آفیسر پر طنزیہ انداز میں مسکرائے۔

۵۔ **جج نے اشفاق احمد کو بطور استاد کیسے مخاطب کیا؟**

جواب۔ عدالت میں جج نے مصنف سے مخاطب ہو کر کہا! ''اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے! اے محترم ترین انسان! اے محترم انسانیت! آپ نے ہی ہم کو یہ علم پڑھایا ہے اور آپ ہی کی بدولت ہم اس جگہ پر براجمان ہیں۔

۶۔ **اشفاق احمد کا باس کیا کہا کرتا تھا؟ اس جملے کی وضاحت بھی کریں۔**

جواب: اشفاق احمد کا باس کہا کرتا تھا کہ:

"You have changed your profession for a handful silver"

ترجمہ: ''تم نے اپنا پیشہ چند سکوں کے عوض بدل لیا۔''

یہ جملہ کسی کے اصولوں یا عزت کو معمولی مالی فائدے کے لیے ترک کر دینے پر طنز کرتا ہے۔ ''چند سکوں کے عوض'' سے مراد ہے کہ شخص نے اپنے پیشے یا مقصد کو بہت کم قیمت پر بیچ ڈالا، جیسے کوئی رشوت لے کر اپنی ذمہ داری سے منھ موڑ لے یا اپنے عقائد کو دنیوی فائدے کے لیے بدل دے۔ یہاں ''سکے'' محض پیسے نہیں، بلکہ اصل میں خودداری کی قیمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں ایک تلخ حقیقت بھی جھلکتی ہے کہ انسان کبھی کبھار دولت، شہرت، یا آسانی کے لیے اپنی شناخت تک کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ جملہ اکثر ان لوگوں پر تنقید کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اپنے نظریات یا پیشہ ورانہ اخلاقیات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ **سبق کے متن کے مطابق روم کی سڑکیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔**

الف۔ بارش سے ب۔ دھونے سے ج۔ موسم سے د۔ سائے سے

۲۔ ''میں ظفرا مسکرایا، کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر، کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔'' جملے میں ''فیٹ'' سے مراد ہے۔
الف۔قسمت ب۔شخصیت ج۔دولت د۔واقفیت

۳۔ روم میں چالان کے جرمانے کی رقم جمع کرانے کا عام ذریعہ تھا۔
الف۔آن لائن ب۔منی آرڈر ج۔چیک د۔دستی

۴۔ متن کے مطابق اس وقت مصنف کی عمر تھی۔
الف۔بائیس سال ب۔چوبیس سال ج۔چھبیس سال د۔اٹھائیس سال

۵۔ جج کا ''Teacher in the court'' کہ کر کھڑے ہونے کا سبب تھا۔
الف۔احترام ب۔خوف ج۔پریشانی د۔غصہ

جوابات

۱	دھونے سے	۲	قسمت	۳	منی آرڈر	۴	چھبیس سال	۵	احترام

سوال نمبر:۳۔ متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ فرض کریں جس کے پاس اس کا............نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے۔
۲۔ میں نے خوشی منانے کے لیے ایک............کا پھول اس کی طرف پھینکا۔
۳۔ بس وہاں.........نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔
۴۔ تقریباً............روپے کا تار تھا۔
۵۔ ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ، اور نہایت دکھ کے ساتھ آپ کو............جرمانہ کرتے ہیں۔

جوابات

۱	لائسنس	۲	مسکراہٹ	۳	کچہری	۴	ایکس	۵	ڈبل

سوال نمبر:۴۔ اس سبق میں سے انگریزی کے الفاظ تلاش کر کے ان کا مفہوم بتائیں۔

جواب: لیکچرر۔ یونی ورسٹی۔ پروفیسر۔ ریڈیو اسٹیشن۔ براڈ کاسٹنگ۔ کارپوریشن۔ ٹریفک۔ فیٹ۔ سیلوٹ۔ چالان۔ لائسنس، لینڈ لیڈی۔ ڈاکٹر۔ فیس۔ جج جینٹس۔ فارنر۔ ٹیچر۔ چیک۔ ٹرائل۔ ڈبل۔ موٹر۔ سٹارٹ۔ گریڈ۔ ریکٹر۔ بیوروکریٹ۔ فیوڈل لارڈ۔
(دیکھیے حصہ مشکل الفاظ کے معانی)

سوال نمبر:۵۔ تکریم اساتذہ کے موضوع پر ایک دوسرے سے گفت گو کریں۔

جواب: استاد روحانی باپ ہوتا ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کو علم سے روشناس کراتا ہے۔ وہ بچوں کی روحانی نشو و نما کرتا ہے۔ کسی فرد کی اخلاقی تربیت کا انحصار اس کے استاد پر ہوتا ہے۔ استاد قوم کا معمار ہوتا ہے۔ تربیت یافتہ افراد ہی تربیت یافتہ معاشرہ بناتے ہیں۔ عظیم معاشرے کی تشکیل عظیم استاد کے بغیر ممکن نہیں۔

مذہبی حوالے سے استاد کا مقام بہت بلند ہے۔ اسلام نے استاد کو بہت اعلیٰ مرتبہ عطا کیا ہے۔ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: "بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔" اس حدیث مبارکہ سے اسلامی معاشرے میں استاد کے مقام اور مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلام میں عظمت کا معیار علم اور تقویٰ ہے۔ عالم لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمانِ عالی شان ہے: "جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا وہ میرا مالک ہے، میں اس کا غلام ہوں۔" اسلامی معاشرے میں سب سے زیادہ تعظیم استاد کی ہے۔

اخلاقی لحاظ سے دیکھا جائے تو استاد معاشرے کا معمار ہوتا ہے۔ استاد معاشرے کے افراد کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ وہ بچے کو معاشرے کا مفید شہری بناتا ہے۔ وہ رواداری اور محبت کا درس دیتا ہے جس سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔ استاد کا احسان کسی طرح بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں وہی معاشرے ترقی یافتہ ہوتے ہیں جہاں استاد کو عزت اور وقار کا مقام دیا جاتا ہے۔ جو معاشرے استاد کو عزت نہیں دیتے وہ جاہل اور اکھڑ رہتے ہیں۔ وہاں تہذیب اور شائستگی جنم نہیں لے سکتی۔ دنیا میں ان لوگوں نے بلند مقام حاصل کیا جنھوں نے اپنے استاد کو عزت دی۔ جو لوگ استاد کی قدر نہیں کرتے وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہو

کر رہ جاتے ہیں۔ والدین کے بعد استاد ہی وہ ہستی ہے جو اپنے بچوں کو خود سے آگے دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ بچوں کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔ ہمیں اپنے اساتذہ کرام کا احترام کرنا چاہیے۔

سوال نمبر:۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

ہمیں پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور دیگر ذرائع سے آئے روز بچوں سے بدسلوکی، ان کے اغوا اور قتل کی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ اس کی روک تھام کے لیے بہت اقدامات اٹھانے کی فوری طور پر ضرورت ہے۔ بچوں کو ہوشیار کرنا ہوگا کہ اگر کوئی اجنبی انھیں کھانے کی کوئی چیز دے تو لے کر نہ کھائیں۔ اگر انھیں کوئی کسی چیز کا لالچ دے کر کوئی غلط حرکت کرے، بہانے سے ورغلائے یا اپنے ساتھ لے جانا چاہے، تو اس کے ساتھ ہرگز نہ جائیں بلکہ شور مچا دیں اور اپنی ہر بات اپنے والدین کو بتائیں۔ بچے اپنے والدین کو بغیر بتائے گھر سے باہر نہ نکلیں۔ اس سلسلے میں والدین اور بچوں کے بڑے بھائی بہنوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ماں اور باپ دونوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اپنے بچوں کو اسکول میں وقت سے پہلے نہ بھیجیں اور چھٹی کے بعد تنہا نہ چھوڑیں۔ بچوں کے ذرائع آمد و رفت کا محفوظ تر انتظام کریں۔ بچوں کے دوستوں پر نظر رکھیں اور بچوں سے یہ بھی کہیں کہ کسی پر اندھا اعتماد نہیں کرنا۔ کوئی بھی شخص چاہے وہ دوست یا رشتے دار ہو یا استاد ہی کیوں نہ ہو، اگر آپ کو ضرورت سے زیادہ رعایت یا بلاوجہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے تو اسے ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھیں۔ بچوں کو اس بات کا بھی اعتماد دیں کہ وہ بچے کی ہر بات غور سے سنیں گے اور اس کی ہر بات کا یقین بھی کریں گے۔ اسکول انتظامیہ کی بھرپور ذمہ داری ہے کہ بچوں کے تحفظ کے لیے باقاعدہ اور منظم پروگرام ترتیب دے اور بہرصورت ان کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے۔

سوالات:

۱۔ **بچے خود اپنی حفاظت کیسے کریں؟**
جواب۔ بچے اپنی حفاظت کے لیے خود ہوشیار رہیں۔ کسی اجنبی شخص سے کوئی چیز لے کر نہ کھائیں۔ اگر کوئی شخص ان کے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرے تو شور مچا دیں اور اس کے بارے میں والدین کو بتائیں۔

۲۔ **بچوں کی حفاظت کے سلسلے میں والدین کی کیا ذمہ داری ہے؟**
جواب۔ بچوں کی حفاظت کے سلسلے میں والدین کی بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ انھیں چاہیے کہ بچے کو اعتماد دیں۔ اس کی بات غور سے سنیں اور اس پر بھروسا کریں۔ انھیں اسکول وقت سے پہلے نہ بھیجیں اور چھٹی کے بعد وہاں اکیلا نہ رہنے دیں۔ ان کی سواری کا مناسب انتظام کریں۔

۳۔ **آپ کسی بچے کے بڑے بہن بھائی ہیں تو اس کی حفاظت کیسے کریں گے؟**
جواب۔ میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے دوستانہ تعلق قائم کروں گا تا کہ وہ اپنی ہر بات مجھے بتا سکیں۔ میں انھیں سمجھاؤں گا کہ کسی بھی شخص پر اندھا اعتماد نہ کریں۔

۴۔ **بچوں کی حفاظت کے لیے اسکول انتظامیہ کی کیا ذمہ داری ہے؟**
جواب۔ بچوں کی حفاظت کے لیے اسکول انتظامیہ کی بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے بچوں کی حفاظت کے لیے منظم پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔ بچوں کو اس حوالے سے مکمل تربیت دینا بھی انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ **اس اقتباس کا مناسب عنوان تجویز کریں؟**
جواب۔ اس عبارت کا مناسب عنوان ''بچوں کی حفاظت کے اقدامات'' ہے۔

سوال نمبر:۷۔ درج ذیل جملوں کی درستی کریں۔

الف۔ **اس جملے کی درستگی کرو۔** جواب۔ اس جملے کی درستی کرو۔
ب۔ **عارف نے دو من گیہوں خریدی۔** جواب۔ عارف نے دو من گیہوں خریدے۔
ج۔ **علی نے اخبار پڑھ لی ہے۔** جواب۔ علی نے اخبار پڑھ لیا ہے۔
د۔ **میں آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔**
جواب۔ میں آپ کی خیریت چاہتا ہوں۔
و۔ **یہ راستہ شارع عام نہیں ہے۔** جواب۔ یہ راستہ شاہراہِ عام نہیں ہے۔

د۔ دونوں بچوں کے قد میں اٹھارہ بیس کا فرق ہے۔

جواب۔ دونوں بچوں کے قد میں انیس بیس کا فرق ہے۔

محاورہ: محاورہ اہلِ زبان ہی کی بول چال سے رواج پاتا ہے۔ محاورہ اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً نیند حرام ہونا، نو دو گیارہ ہونا، تارے گننا، غم کھانا، غصہ پینا وغیرہ۔

سوال نمبر:۸۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

ہمہ تن مصروف ہونا، خوشی کی لہر دوڑ جانا، ہزار جتن کرنا، پروان چڑھانا، آفت ٹوٹ پڑنا، اوسان خطا ہونا، یورش ہونا، قضا سر پر کھیلنا

جواب:

محاورات	جملے
اپنا سا منھ لے کر رہ جانا	جھوٹ ثابت ہونے پر وہ اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔
آسمان سر پر اٹھانا	کلثوم نے آسمان سر پر اٹھالیا۔
ہوش کے ناخن لینا	ہوش کے ناخن لیں اس طرح کی حرکت سے آپ کی عزت خراب ہوگی۔
عقل پر پتھر پڑنا	اس کی عقل پر ایسا پتھر پڑا کہ اپنی ساری کمائی جوئے میں لٹادی۔
اوسان خطا ہونا	سڑک پر خوف ناک حادثہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

متشابہ الفاظ: متشابہ الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں، جو اپنی صوت یا شکل کے لحاظ سے تو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں لیکن اعراب، املا اور معنی کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ متشابہ الفاظ کی درج ذیل صورتیں ہیں۔

الف۔ وہ الفاظ جن کا املا تو ایک جیسا ہو لیکن اعراب کی تبدیلی کی وجہ سے ان کے معانی میں فرق ہو مثلاً: ذَر، ذُر، مَلک، مُلک، مِثل، مَثل وغیرہ۔

ب۔ وہ الفاظ جن کی آواز تو بظاہر ایک جیسی ہو لیکن ان کا املا اور معانی مختلف ہوں مثلاً: راضی، رازی، سفر، صفر، طاب، تاب وغیرہ۔

سوال نمبر:۹۔ سبقی متن کو غور سے پڑھیں اور متشابہ الفاظ تلاش کر کے ان کی فہرست بنائیں۔

جوابات: ۱۔ چلا۔ چلّا ۲۔ بیچ۔ بیچ ۳۔ اس۔ اُس ۴۔ تو۔ تُو ۵۔ چٹکی۔ چٹکی ۶۔ پھر۔ پُھر ۷۔ کس۔ کَس
۸۔ ملنے۔ ملنے ۹۔ تک۔ تک ۱۰۔ ہوا۔ ہُوا ۱۱۔ حامی۔ ہامی ۱۲۔ میں۔ میں ۱۳۔ بہتر۔ بہتّر ۱۴۔ عرض۔ ارض
۱۵۔ پر۔ پُر ۱۶۔ علم۔ عَلم۔ اَلم ۱۷۔ اُٹھ۔ اٹھ ۱۸۔ نکل۔ نَقل ۱۹۔ لوٹ۔ لُوٹ ۲۰۔ جو۔ جو۔ جُو ۲۱۔ پیسے۔ پیسے
۲۲۔ کہ۔ کہ ۲۳۔ طور۔ طُور ۲۴۔ چارا۔ چارہ

سوال نمبر:۱۰۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں اور حوالہ متن بھی درج کریں۔

"اب میں ڈرا ــــــــــــــــ میں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔"

جواب۔ دیکھیے نثر پاروں کی تشریحات

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

درست جواب کا انتخاب کریں۔

(1) **اشفاق احمد پیدا ہوئے:**
(الف) 1923ء میں (ب) 1924ء میں (ج) 1925ء میں (د) 1926ء میں (ج)

(2) **اشفاق احمد فوت ہوئے:**
(الف) 2003ء میں (ب) 2004ء میں (ج) 2005ء میں (د) 2006ء میں (ب)

(3) **اشفاق احمد پیدا ہوئے:**
(الف) خان پور (ب) بنارس میں (ج) جے پور میں (د) کشمیر میں (الف)

(4) **اشفاق احمد نے ابتدائی تعلیم حاصل کی:**
(الف) لاہور سے (ب) علی گڑھ سے (ج) لکھنؤ سے (د) آبائی علاقے سے (د)

(5) **قیامِ پاکستان کے بعد اشفاق احمد چلے آئے:**
(الف) لاہور (ب) کراچی (ج) اسلام آباد (د) پشاور (الف)

(6) **ایم۔اے میں اشفاق احمد کا مضمون تھا:**
(الف) اردو ادب (ب) انگریزی ادب (ج) فارسی ادب (د) عربی ادب (الف)

(7) **اشفاق احمد نے اُردو ادب میں ایم۔اے کیا:**
(الف) گورنمنٹ کالج بہاولپور سے (ب) اورینٹل کالج لاہور سے
(ج) گورنمنٹ کالج لاہور سے (د) ایمرسن کالج ملتان سے (ج)

(8) **اشفاق احمد کی اہلیہ کا نام ہے:**
(الف) بانو قدسیہ (ب) سکینہ بیگم (ج) بلقیس جہانی (د) نصرت بانو (الف)

(9) **بانو قدسیہ اُردو میں مشہور ہیں بطور:**
(الف) شاعرہ (ب) ناول نگار (ج) افسانہ نگار (د) نقاد (ب)

(10) **اشفاق احمد اردو پڑھاتے رہے:**
(الف) اسلامیہ کالج بہاولپور میں (ب) علی گڑھ کالج میں
(ج) گورنمنٹ کالج لاہور میں (د) دیال سنگھ کالج لاہور میں (د)

(11) **اشفاق احمد کس ملک کی یونی ورسٹی میں اُردو پڑھاتے رہے؟**
(الف) روم (ب) لندن (ج) فرانس (د) ایران (الف)

(12) **مختلف ممالک میں قیام کے دوران میں اشفاق احمد نے زبانوں کے ڈپلومے حاصل کیے:**
(الف) فارسی اور انگریزی (ب) انگریزی اور فرانسیسی (ج) چینی اور جرمن (د) اطالوی اور فرانسیسی (د)

(13) **اشفاق احمد نے نیویارک سے ڈپلوما حاصل کیا:**
(الف) فرانسیسی زبان کا (ب) ناول نگاری کا (ج) ڈراما نگاری کا (د) ریڈیو براڈ کاسٹنگ کا (د)

(14) **اشفاق احمد نے رسالہ جاری کیا:**
(الف) فنون (ب) ادبی دنیا (ج) داستان گو (د) بزمِ اطفال (ج)

(15) **اشفاق احمد کا ریڈیو پر مشہور پروگرام نشر ہوتا تھا:**
(الف) تلقین شاہ (ب) زاویہ (ج) بابا صاحبا (د) مسٹر کلین (الف)

(16) **اشفاق احمد کا ریڈیو پروگرام "تلقین شاہ" جاری رہا:**
(الف) 5 سال (ب) 10 سال (ج) 20 سال (د) 30 سال (د)

(17) **اشفاق احمد مرکزی اردو بورڈ (موجودہ نام اُردو سائنس بورڈ) میں فائز رہے بطور:**
(الف) جنرل سیکرٹری (ب) نائب سیکرٹری (ج) ڈائریکٹر (د) صدر (ج)

(18) **اشفاق احمد نے کچھ عرصہ خدمات سرانجام دیں:**
(الف) محکمہ انہار میں (ب) ریلوے میں (ج) وفاقی وزارتِ تعلیم میں (د) وفاقی وزارتِ صحت میں (ج)

(19) **اشفاق احمد کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں:**
(الف) ماہنامہ خواتین (ب) ماہنامہ سب رنگ (ج) ماہنامہ تعلیم و تربیت (د) ماہنامہ پھول (د)

(20) **زاویہ، گڈریا، حیرت کدہ، توتا کہانی کے مصنف ہیں:**
(الف) اشفاق احمد (ب) شوکت صدیقی (ج) الطاف فاطمہ (د) فرحت اللہ بیگ (الف)

(21) **ایک محبت سو افسانے، ایک محبت سو ڈرامے، من چلے کا سودا، سفر در سفر تصانیف ہیں:**
(الف) غلام عباس کی (ب) شوکت صدیقی کی (ج) مشتاق احمد کی (د) اشفاق احمد کی (د)

(22) اشفاق احمد کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے قومی اعزاز "ستارۂ امتیاز" سے نوازا گیا:
(الف) مارچ ۲۰۰۱ء میں (ب) ۲۰۰۲ء میں (ج) مارچ ۲۰۰۳ء میں (د) مارچ ۲۰۰۴ء میں (ج)

(23) اشفاق احمد کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے "ہلالِ امتیاز" سے نوازا گیا:
(الف) ۲۰۰۶ء میں (ب) ۲۰۰۷ء میں (ج) ۲۰۰۸ء میں (د) ۲۰۰۹ء میں (الف)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ سبق "ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں" کے مصنف کا نام ہے:
(الف) انتظار حسین (ب) اشفاق احمد (ج) احمد ندیم قاسمی (د) امجد اسلام امجد (ب)

2۔ سبق "ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں" کی صنف ہے:
(الف) مضمون (ب) سوانح عمری (ج) افسانہ (د) آپ بیتی (د)

3۔ سبق "ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں" کا ماخذ ہے:
(الف) من چلے کا سودا (ب) حیرت کدہ (ج) زاویہ (د) تو تا کہانی (ج)

4۔ مصنف کس ملک میں لیکچر رتھے؟
(الف) یمن (ب) روم (ج) شام (د) عراق (ب)

5۔ مصنف کو روم میں دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن پر براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی:
(الف) انگریزی زبان میں (ب) ترکی زبان میں (ج) فارسی زبان میں (د) اُردو زبان میں (د)

6۔ روم میں دوپہر کے وقت سب لوگ کرتے تھے:
(الف) سیر (ب) رقص (ج) قیلولہ (د) مطالعہ (ج)

7۔ بقول مصنف، روم میں لوگ دوپہر کو کھانے کے بعد سوتے تھے:
(الف) دو بجے تک (ب) تین بجے تک (ج) چار بجے تک (د) پانچ بجے تک (ج)

8 روم میں پانی کے حوض لگا کر دھوتے تھے:
(الف) کاریں (ب) ٹرک (ج) گلیاں (د) سڑکیں (د)

9 شام تک سڑکیں ہو جاتی تھیں:
(الف) ٹھنڈی (ب) صاف ستھری (ج) صاف شفاف (د) گرم (الف)

10 سڑکوں پر ٹریفک آ جا رہی تھی:
(الف) کوئی کوئی (ب) اِکا دُکا (ج) ایک دو (د) دو چار (ب)

11۔ مصنف بتاتا ہے کہ وہ گول دائرہ کا چکر کاٹنے کی بجائے بیچ میں سے گزرا تو وہاں ایک کھڑا تھا:
(الف) فوجی (ب) سارجنٹ (ج) فقیر (د) سپاہی (د)

12۔ سپاہی نے مصنف کو روک لیا:
(الف) ہاتھ کے اشارے سے (ب) ہارن بجا کر
(ج) سیٹی بجا کر (د) چھڑی کے اشارے سے (ج)

13۔ بقول مصنف، روم میں سیٹی بجنا برا تھی:
(الف) زندگی کے (ب) موت کے (ج) قضا کے (د) حیات کے (ب)

14۔ ولایت میں رواج ہے کہ جب بھی کسی کا چالان کرتے ہیں تو سب سے پہلے کرتے ہیں:
(الف) جرمانہ (ب) جھگڑا (ج) تنبیہ (د) سلیوٹ (د)

15۔ سپاہی نے قریب آ کر سلیوٹ مارا تو مصنف اندر سے تھے:
(الف) خوش (ب) کانپ رہے (ج) ناراض (د) مچل رہے (ب)

16۔ سپاہی نے مصنف کتنا جرمانہ کیا:
(الف) بارہ آنے (ب) چودہ آنے (ج) سولہ آنے (د) اٹھارہ آنے (الف)

17۔ سپاہی نے مصنف کو جرمانہ جمع کرانے کے لیے کہا:
(الف) بنک میں (ب) عدالت میں (ج) ڈاک خانے میں (د) دفتر میں (ج)

18۔ مصنف جب گھر آئے تو سب سے پہلے چالان کے بارے میں بتایا:
(الف) والد کو (ب) والدہ کو (ج) بیگم کو (د) لینڈ لیڈی کو (د)

19۔ مصنف کہتے ہیں کہ چالان کے بعد لینڈ لیڈی کو لگا کہ اُن کے گھر میں جیسے رہتا ہے:
(الف) ملزم (ب) مجرم (ج) چور (د) ڈاکو (ب)

20۔ لینڈ لیڈی نے پروفیسر کے چالان کے بارے میں بتایا:
(الف) شوہر کو (ب) بیٹے کو (ج) بہو کو (د) بیٹی کو (د)

21۔ لینڈ لیڈی نے بیٹی کے علاوہ کس کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہو گیا ہے؟
(الف) سسر کو (ب) ساس کو (ج) شوہر کو (د) بیٹے کو (ب)

22۔ لینڈ لیڈی نے مصنف سے کہا کہ چالان کے بارے میں کسی سے نہ کرنا:
(الف) مذاق (ب) بحث (ج) ذکر (د) معذرت (ج)

23۔ مصنف کہتے ہیں کہ میری لاأبالی طبیعت اور عمر تھی:
(الف) 26 سال (ب) 28 سال (ج) 30 سال (د) 32 سال (الف)

24۔ بقول مصنف، تار تقریباً تھا:
(الف) پندرہ روپے کا (ب) اٹھارہ روپے کا (ج) اکیس روپے کا (د) پچیس روپے کا (ج)

25۔ مصنف کو عدالت سے ایک _____ آ گیا کہ فلاں تاریخ کو عدالت میں پیش ہو جائیں:
(الف) نوٹس (ب) سمن (ج) چالان (د) مقدمہ (ب)

26۔ مصنف کہتے ہیں کہ میں پریشان ہوا کہ میں ہوں:
(الف) دوسرے ملک میں (ب) دیارِ غیر میں (ج) روم میں (د) عدالت میں (ب)

27۔ مصنف کے ڈاکٹر کا نام تھا:
(الف) ڈاکٹر بالدی (ب) ڈاکٹر آرنلڈ (ج) ڈاکٹر شیفر (د) ڈاکٹر جیٹر (الف)

28۔ "پیلس آف دی جسٹس" رومن زمانے کا بہت بڑا ہے:
(الف) محل (ب) وسیع و عریض عمارت (ج) یادگار (د) تاریخی مقام (ب)

29۔ ہم تلاش کرتے کرتے کمرے میں پہنچے تو وہاں تشریف فرما تھے:
(الف) پروفیسر صاحب (ب) وکیل صاحب (ج) جج صاحب (د) ڈی۔ایس پی صاحب (ج)

30۔ مصنف بتاتے ہیں کہ جب جج صاحب نے بلایا تو میری کیفیت ہو گئی تھی:
(الف) بخار جیسی (ب) تشنج جیسی (ج) بیماروں جیسی (د) مجرموں جیسی (ب)

31۔ جج صاحب نے مصنف سے کہا کہ آپ نے وقت ضائع کیا:
(الف) عملے اور عمل دار کا (ب) عملے اور فوج کا (ج) عملے اور وکیلوں کا (د) عملے اور پولیس کا (د)

32۔ جج نے مصنف سے کہا کہ اب وقت ضائع ہو رہا ہے:
(الف) پولیس کا (ب) وکیلوں کا (ج) عدالت کا (د) عملے کا (ج)

33۔ جج نے کہا ہم اس کے بارے میں آپ کو دیں گے:
(الف) انعام (ب) معافی (ج) کڑی سزا (د) جرمانہ (ج)

34۔ مصنف نے جج صاحب کو بتایا کہ وہ یہاں ہے:
(الف) فارنر (ب) وزیٹر (ج) لوکل (د) بزنس مین (الف)

35۔ جج صاحب کے پوچھنے پر مصنف نے بتایا کہ وہ پروفیسر ہے:
(الف) آکسفورڈ یونی ورسٹی میں (ب) ہیجنگ یونی ورسٹی میں
(ج) جی۔سی یونی ورسٹی میں (د) روم یونی ورسٹی میں (د)

36۔ جج نے مصنف سے کہا اے محترم ترین انسان! آپ ہی نے ہم کو حکم دیا ہے عدالت اور:
(الف) مساوات کا (ب) عدل کا (ج) انسانیت کا (د) قانون کا (ب)

37۔ جج صاحب نے مصنف سے کہا کہ اے معزز استاد! آپ ہی کی بدولت ہم اس جگہ پر:
(الف) براجمان ہیں (ب) ملازم ہیں (ج) بیٹھے ہیں (د) انتظار کر رہے ہیں (الف)

38۔ جج صاحب نے مصنف کو جرمانہ کیا:
(الف) ایک روپیہ (ب) ڈیڑھ روپیہ (ج) دو روپیہ (د) ازحائی روپیہ (ب)

39۔ جج صاحب اور عدالت کا عملہ مصنف کو چھوڑنے کے لیے آیا:
(الف) عدالت کے دروازے تک (ب) عدالت کے احاطہ تک
(ج) عدالت کے مین گیٹ تک (د) گاڑی تک (د)

40۔ مصنف عدالت سے واپسی پر اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا:
(الف) گھنیا آدمی (ب) معزز آدمی (ج) شریف آدمی (د) سزا یافتہ آدمی (ب)

41۔ مصنف نے اپنی لینڈ لیڈی کو عدالت کی کارروائی بتائی تو وہ ہوئی:
(الف) خوش (ب) ناراض (ج) پریشان (د) افسردہ (الف)

42۔ مصنف نے اپنی تنخواہ میں اضافے کے بارے میں پوچھا:
(الف) اپنے پرنسپل سے (ب) اپنے ریکٹر سے (ج) اپنے وائس چانسلر سے (د) اپنے شعبہ کے چیئرمین سے (ب)

43۔ بقول مصنف، روم میں استاد بہت بڑے ہیں:
(الف) مالی اعتبار سے (ب) کاروباری اعتبار سے (ج) عزت کے اعتبار سے (د) سفارتی اعتبار سے (ج)

44۔ روم والوں کا کمال ہے کہ یہاں استاد مالی طور پر کم تر ہیں، لیکن بہت اونچے ہیں:
(الف) رتبے کے اعتبار سے (ب) حسن اخلاق کے اعتبار سے
(ج) خدمتِ خلق کے اعتبار سے (د) انسانیت کے اعتبار سے (الف)

45۔ اپنے کھنڈروں اور فورم میں کھڑا ہو کے ننگے پاؤں بات کرتا تھا، لیکن احترام تھا:
(الف) ارسطو کا (ب) افلاطون کا (ج) سقراط کا (د) بقراط کا (ج)

46۔ یونانی فلسفی جو اپنے کھنڈروں میں ننگے پاؤں کھڑا ہو کے لوگوں سے بات کرتا تھا:
(الف) ارسطو (ب) افلاطون (ج) بقراط (د) سقراط (د)

مُصنف
رشید احمد صدیقی
(1892-1977)

سبق: ۷ چارپائی

مصنف کا تعارف

رشید احمد صدیقی قصبہ مزیا ہو، ضلع جون پور، (یو۔پی، انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور میٹرک تک تعلیم جون پور کے سکول سے حاصل کی۔ مالی حالات سے مجبور ہو کر ضلع کچہری جون پور میں کلرک بھرتی ہو گئے، مگر ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور ایم اے او کالج علی گڑھ سے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں طالب علمی کے زمانے سے ہی انشائیہ طرز کے مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کیے جنھیں تادم آخر لکھتے رہے۔ علاوہ ازیں وہ ۱۹۲۲ء میں شعبہ درس و تدریس سے منسلک ہو گئے اور جب علی گڑھ کالج، یونی ورسٹی بن گیا تو ترقی پا کر علی گڑھ یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کے منصب تک جا پہنچے۔ اسی طرح انھوں نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے علمی و ادبی طور پر ایک بھرپور زندگی بسر کی۔

رشید احمد صدیقی نے مضمون نگاری اور خطوط نگاری کے میدان میں بھی شہرت حاصل کی۔ وہ اپنے عہد کے ایک نامور انشا پرداز تھے۔

رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے خاص اُنس تھا۔ ان کی تحریروں میں علی گڑھ کی یادیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں اور ان کے مزاج میں شائستگی اور خوش طبعی کے وافر عناصر ملتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان نہایت خوب صورت ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات''، ''مضامینِ رشید''، ''گنج ہائے گراں مایہ''، ''ہم نفسان رفتہ''، ''ہمارے ذاکر صاحب''، ''آشفتہ بیانی میری''، ''جدید اُردو غزل''، ''اُردو در سمِ خط'' اور ''مکاتیب رشید احمد صدیقی'' شامل ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے علمی، ادبی اعزازات میں پدم شری ایوارڈ کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سمیت کئی دیگر ایوارڈ شامل ہیں۔

تصانیف

رشید احمد صدیقی کی تصانیف میں طنزیات و مضحکات، مضامین رشید، آشفتہ بیانی میری، گنج ہائے گراں مایہ
ہم نفسانِ رفتہ، جدید غزل، غالب کی شخصیت اور شاعری، اقبال کی شخصیت اور شاعری اور خنداں شامل ہیں۔

☆ طلبہ کو صنفِ انشائیہ کے بارے میں بنیادی باتیں بتانا۔
☆ انشائیہ نگاری کی روایت اور ارتقا کا جائزہ لینا۔
☆ رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات سے روشناس کرانا
☆ طلبہ کو بتانا کہ ''چارپائی'' میں حقیقت نگاری، ادبی لطافت، رنگِ مزاح اور متنوع کیفیات ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر (45) **اوڑھنا بچھونا**: (ہر وقت کا معمول، ہر وقت کام آنے والی چیز، وہ چیز جو اٹھتے بیٹھتے استعمال کی جائے) **گھٹی میں پڑنا**: (خمیر یا فطرت میں ہونا، عادت ہونا، بچپن سے کسی بات کا عادی ہونا) **فکرِ سخن**: (وہ غور و فکر جو شعر کہنے کے واسطے ہوتا ہے) **فاقہ**: (بھوکا رہنا محتاجی، مفلسی، حاجت) **غل غپاڑا**: (چیخ پکار، ہنگامہ، شور و غوغا) **ناموروں**: (بے جوڑ، جو موزوں نہ ہو، نازیبا)، **اُسامی**: (جگہ یا عہدہ، نوکری)، **سوجھ بوجھ**: (سوچنے سمجھنے کی قوت، سمجھ داری)، **اکتفا کرنا**: (کافی سمجھنا، کافی ہونا)، **بلچل**: (بے چینی، بے قراری)، **اتفاق سے**: (اچانک، غیر متوقع طور پر)، **تعینات**: (مقرر، مامور)، **ولی عہد**: (جانشین، وارث)، **مصاحب**: (دوست، ساتھی)، **کارآمد**: (مفید)، **حاجت**: (ضرورت)، **آش جو**: (پانی یا دودھ میں پکا ہوا دلیا)، **لب گور**: (مرنے کے قریب)، **ڈرائنگ روم**: (مُلاقات کا کمرا، بیٹھک، دیوان خانہ)

سبق (46) **بہ یک وقت:** (ایک وقت میں، ایک ساتھ)، **مینڈ:** (کھیت کی منڈیر، حد بندی، سرحد)، **نالی:** (پانی کی نکاسی کی نالی)، **باٹنا** (تقسیم کرنا، حصہ دینا، تھوڑا تھوڑا، متعدد افراد کو دینا)، **مع:** (ساتھ، سمیت، ہمراہ)، **اچکن:** (ایک قسم کا مردانہ پہناوا)، **کوٹ** کی ایک شکل، شیروانی)، **بغچی:** (گٹھری، پوٹلی)، **اناج:** (غلہ، گیہوں، جو، چاول، چنا، جوار، باجرہ، مکئی وغیرہ)، **پنشن:** (وظیفہ، امداد، سہارا، وہ رقم جو نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد ہر ماہ ملے) **خاکسار:** (حقیر، ناچیز، عاجز، خاک کی مانند، متکلم کسر نفسی سے اپنے آپ کو کہتا ہے)، **چودہ طبق روشن ہونا:** (بصیرت پیدا ہونا، عقل و فراست بڑھ جانا، حیران ہو جانا، ہکا بکا رہ جانا)، **اسٹیشنری:** (لکھنے پڑھنے کا سامان)، **جاڑا:** (سردی، خنکی، سردی کا موسم، موسم سرما)، **سمن:** (عدالت میں حاضر ہونے کا تحریری حکم، اطلاع نامہ، پروانۂ طلبی)، **مسودہ:** (لکھا ہوا، ابتدائی تحریر جس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہو)، **کرتا دھرتا:** (بااختیار، منتظم، مالک)، **براجمان ہونا:** (تشریف فرما ہونا، رونق افروز ہونا)، **توقف:** (ٹھہرنا، قیام کرنا، رُکنا)، **تاؤ:** (آنچ، تیز آگ، شدت، جوش)، **صاحبِ خانہ:** (گھر والا، گھر کا مالک، میزبان)، **دسترخوان:** (وہ چورس یا مستطیل کپڑا جسے کھانا کھاتے وقت بچھا کر اس پر کھانا چنا یا لگایا جاتا ہے، مُراد کھانا، طعام)، **تخصیص:** (خصوصیت، خاص کرنا، مخصوص کرنا یا ہونا، خاص طور پر)، **کھٹکا:** (آہٹ، نقصان، اندیشہ، شک، وہ ہلکی اور مدھم آواز جو چیزوں کے ٹکرانے یا کسی چیز کے گرنے سے پیدا ہو)، **پناہ لینا:** (حمایت میں آنا، پشت پناہی چاہنا، صدمے یا اذیت سے بچنے کے لیے کسی کے پاس ٹھہرنا یا رہنا)

سبق (47) **مچان:** (وہ لکڑیاں یا تختے جو کھیت یا باغ میں اونچی جگہ لگا دیتے ہیں تاکہ اس پر بیٹھ کر کھیت یا باغ کی رکھوالی کریں)، **شگفتہ:** (کھلا ہوا، کھلی ہوئی چیز، خوش، مسرور)، **شاداب:** (خوش و خرم، آباد، پررونق)، **جھمکنا:** (چمکنا، جھلکنا، رقص کرنا، اُچھلنا)، **آبی:** (پانی کا، پانی سے بنا ہوا، پانی کی خاصیت رکھنے والا)، **عملداری:** (عمل دخل، حکومت، سلطنت)، **آرائش:** (سجاوٹ، زیبائش، بناؤ سنگھار)، **آسائش:** (راحت، آرام، سکھ، سکون)، **کرشمہ:** (عجیب بات، انوکھی بات، شعبدہ، کرامت)، **مہاجن:** (سوداگر، ساہوکار، سودی کاروبار کرنے والا، بنیا، سیٹھ)، **دھوم مچانا:** (شور مچانا، ہنگامہ برپا کرنا، شہرت پیدا کرنا)، **ڈال:** (شاخ، ٹہنی، ڈنڈی)، **جھپٹنا:** (حملہ کرنا، دوڑنا، چھیننا)، **قابلِ التفات:** (توجہ کے قابل، دھیان دینے کے لائق)، **نیرنگی:** (انقلاب، تبدیلی، رنگ بدلنے کی کیفیت، شعبدہ بازی، جادوگری)، **نامور:** (مشہور، نام آور، معروف شخصیت)، **گمنام:** (غیر مشہور، غیر معروف، جسے کوئی نہ جانتا ہو یا جو اپنے نام کو چھپائے)، **نافرجام:** (جس کی عاقبت بخیر نہ ہو، جو آخرت میں سرخروئی سے ہم کنار نہ ہو، بدانجام)، **کھری:** (عمدہ، صاف ستھری، خالص)، **باغباں:** (باغ کی دیکھ بھال کرنے والا، مالی)، **تعجب:** (حیرت، حیرانی، انوکھا پن)، **کائنات:** (دنیا، جہاں، کل مخلوقات، جمع پونجی، سرمایہ)، **وہم:** (گمان، شک، وسوسہ، خیال، قیاس)، **اسیر:** (قیدی، گرفتار)، **چونک:** (خوف، وحشت، ڈر)، **اونگھنا:** (جھپکی لینا، نیند میں جھونکے لینا، غافل ہونا، سُست کام کرنا)

توضیحات

قافیہ: قافیہ کے لغوی معنی "پیچھے آنے والا" کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں ان معین حروف و حرکات کو قافیہ کہتے ہیں جو مختلف الفاظ کی شکل میں شعر یا مصرعے کے آخر میں ردیف سے قبل بار بار آئیں، قافیہ کہلاتے ہیں۔ غزل میں ردیف نہ ہونے کی صورت میں قافیہ مصرع کے آخر میں ہوتا ہے۔

قلعہ: وہ سنگین اور محفوظ عمارت جس میں بادشاہ یا فوج رہتی ہے۔ بہت اونچا اور بڑا مکان۔

خانقاہ: صوفیوں اور درویشوں کی عبادت گاہ۔ کسی عقیدت مند یا دوست کا گھر یا مکتبِ فکر۔

خیمہ: کپڑے کی موٹی اور مضبوط چادر یا چمڑے کا عارضی قیام کے لیے بنایا ہوا مکان، تنبو، ڈیرا۔

شفاخانہ: ایک ایسا ادارہ جہاں مریضوں کا ماہرینِ طب علاج کرتے ہیں۔ انھیں "دواخانہ" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ مریضوں کے علاج کی جگہ، ہسپتال۔

کال کوٹھری: قیدِ تنہائی، قید خانے کا اندھیرا کمرا، انتہائی چھوٹا اور تاریک جیل خانہ، جس میں خوف ناک جرائم کا ارتکاب کرنے والے قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔

نقشِ سلیمان: حضرت سلیمان علیہ السلام سے منسوب مُہر، حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی میں نقش مہر کے عکس کا تعویذ جس کے باندھنے سے (روایتاً) نہ جادو اثر کرتا ہے، نہ دیو اور پری سے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔

دستاویز: کوئی اہم تحریر، یادداشت، وہ کاغذ جو دو یا کئی شخصوں کے مابین کسی معاملے میں بطور سند لکھا جائے۔ اقرار نامہ، ثبوت۔

سُبک دوش: کسی امر یا ذمہ داری سے فارغ ہونے والا، نجات حاصل کرنے والا، جس کا کندھا بوجھ سے ہلکا ہو، بری الذمہ، فارغ۔ چھٹکارا پانے والا۔

سبق کا خلاصہ

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسے، آفس، جیل خانے، کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں۔ دعا اور بھیک مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیے پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرا، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، خیمہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ کی حیثیت حاصل ہے۔ کوئی مہمان آیا، چارپائی نکالی گئی۔ اس پر نئی دری بچھا دی گئی۔

چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا، کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر آلو چھیلے جائیں گے۔ اتنے کام سرانجام دینے کے بعد جس طرح پنشن یافتہ ملازم ہر کام سے سُبک دوش ہو جاتا ہے، اسی طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو کال کوٹھری میں داخل کر دی جاتی ہے اور اس پر سال بھر کی پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دیہات کے میزبان نے پیاز بنا کر میرے لیے بھی ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی اسی کال کوٹھری میں بچھا دی اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کر دیا۔ اس رات میرے اتنے ہی طبق روشن ہوئے جتنے ساری پیازوں میں چھلکے تھے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے۔ تکیہ کے نیچے ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہوتا۔ ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، تھوڑا بہت ناشتا، فہرست دواخانہ، سمن، جعلی دستاویز کے مسودے، سب چارپائی پر لیٹے لیٹے تکیے کے نیچے سے نکال لیجیے۔

حکومت بھی چارپائی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور ہر گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔

چارپائی ہی کھانے کا کمرا بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانے سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانچ سات چھوٹے بڑے بچے، اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتے، بلی اور بے شمار مکھیاں آ پہنچیں۔ کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو، کہیں گم ہوئی ہو، ہندوستانی اس کی تلاش کی ابتدا چارپائی سے کرتا ہے۔ اس میں ہاتھی، سوئی، بیوی، بچے، موزے، مرغی چور کسی کی تخصیص نہیں۔ رات کو کھٹکا ہوا، اس نے چارپائی کے نیچے نظر ڈالی۔ خطرہ بڑھا تو چارپائی کے نیچے پناہ لی۔ زندگی کی شاید ہی کوئی سرگرمی ہو جو چارپائی یا اس کے آس پاس نہ انجام پائی ہو۔

چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستانی چارپائی سے ہر کام نکلوا لیتے ہیں۔ بانوں کی ٹوٹی ہوئی چارپائی کو کئی کے کھیت میں بطور میچان باندھ دیا جاتا ہے۔ نیز چارپائی ہر نا موزوں کام کے لیے موزوں ہے۔

مرکزی خیال

اس سبق میں مصنف نے مزاحیہ انداز میں ہندوستانیوں کی ایجاد، ان کی پہچان، چارپائی کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ چارپائی جسے ہندوستانی، ہر کام کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چارپائی ہر نا موزوں کام کے لیے موزوں ہے۔ ہندوستانیوں کی زندگی

چار پائی سے شروع ہوتی ہے اور اکثر کی چار پائی پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ خالی ہاتھ چار پائی پر آئے تھے اور خالی ہاتھ ہی چار پائی سے جاتے ہیں۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق وسباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق وسباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق وسباق

چار پائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چار پائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں۔ دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں کبھی فکرِ قوم۔ ہم کو چار پائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیے پر اور طالب علم کو غل غپاڑے پر۔ ہندوستان میں چار پائی ہر کام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آیا، چار پائی نکالی گئی۔ اناج کو سکھانے کے لیے چار پائی پر بچھا دیا۔ چار پائی ہندوستان کی آب وہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا شان دار نمونہ ہے۔ یہ ہندوستان کی طرح ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروساماں لیکن ہر ناموزوں کام کے لیے موزوں ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں مختص کی ہیں۔ میرے نزدیک تو چار پائی ان تمام لوازم پر پورا اترتی ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

عبارت نمبر 1

چار پائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسہ، آفس، جیل خانے کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چار پائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں۔ دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم، اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم کو چار پائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیہ پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے۔ اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ چار پائی ہندوستانیوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہندوستانی گھرانوں میں چار پائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرا، غسل خانے، قلعہ، خیمہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفا خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہر ناموزوں کام کے لیے موزوں ہے۔ مہمان آ گیا تو چار پائی نکال لی اور اس پر نئی دری بچھا دی۔ چار پائی ہندوستان کی آب وہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھر پور نمونہ ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کی کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں۔ مثلاً: سچے دوست، شرافت اور فراغت، میرے نزدیک تو چار پائی ان تمام لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت ہندوستانی طرزِ زندگی میں چار پائی کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ مصنف چار پائی کو محض بیٹھنے اور سونے کا ذریعہ نہیں بلکہ ہماری معاشرت کا ایک لازمی حصہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں چار پائی اور مذہب ہندوستان کے رہنے والوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ زندگی کے ہر اہم موڑ پر یہ ہمارے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ مصنف کے مطابق ایک ہندوستانی کی زندگی کا آغاز بھی چار پائی سے ہوتا ہے اور اختتام بھی چار پائی پر ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف آرام وسکون کا ذریعہ ہے بلکہ انسان کی تقدیر

کے مختلف مراحل میں بھی شریک رہتی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا ہے، مدرسے جاتا ہے، جوان ہوتا ہے، فکر و خیال میں مبتلا ہوتا ہے، بیماری اور فاقہ سہتا ہے اور آخر کار اسی پر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر:

بزرگ رخصت ہوئے ہیں لیکن برآمدے میں　　پرانے وقتوں کی چار پائی پڑی رہے گی　　(کومل جوئیہ)

ہم ہندوستانیوں کی چار پائی سے گہری وابستگی ہے۔ یہ ہمارے لیے صرف جسمانی آرام کی جگہ نہیں بلکہ ذہنی اور روحانی سرگرمیوں کا بھی مرکز ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک ہر انسان چار پائی کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم آرام کرتے ہیں، سوچ بچار کرتے ہیں، دوا بھی کھاتے ہیں اور دعا بھی مانگتے ہیں۔ غربت اور بیماری جیسے حالات بھی زیادہ تر اسی پر جھیلے جاتے ہیں۔ ہمارے فکری، روحانی، جسمانی اور معاشرتی مسائل، سب کے سب چار پائی پر ہی طے ہوتے ہیں۔

مصنف نے ہندوستانیوں کے چار پائی پر غیر متزلزل اعتماد کو مزید واضح کرنے کے لیے چند نہایت دل چسپ تشبیہات سے کام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو چار پائی پر اتنا ہی اعتماد ہے، جتنا برطانیہ کو آئی۔ سی۔ ایس پر۔ انگریزوں کے لیے آئی۔ سی۔ ایس (انڈین سول سروس) ان کے نو آبادیاتی نظام کا ایک مضبوط ستون تھی۔ اسی کے ذریعے وہ ہندوستان پر حکمرانی کرتے تھے۔ آئی۔ سی۔ ایس کو جدید ہندوستانی بیوروکریسی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ یہ برطانوی راج کے دوران میں ہندوستان میں اعلیٰ انتظامی خدمات کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس ادارے کے افسران کو براہِ راست برطانیہ میں سخت امتحانات اور تربیت کے بعد منتخب کیا جاتا تھا۔ ان افسران کو ہندوستان میں عدلیہ، محصولات اور عام نظم ونسق جیسے اہم شعبوں میں تعینات کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ آئی۔ سی۔ ایس ان کے ہندوستان پر قبضے کو برقرار رکھے گی۔ مصنف نے ہندوستانیوں کے چار پائی پر اعتماد کو بھی برطانیہ کے آئی۔ سی۔ ایس پر اعتماد کے مترادف قرار دیا ہے۔ جیسے برطانوی حکمران آئی۔ سی۔ ایس کے بغیر حکومت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اسی طرح ہندوستانی چار پائی کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے۔

مصنف کہتے ہیں ہندوستانیوں کو چار پائی پر ایسا ہی اعتماد ہے جیسا ایک شاعر کو قافیے پر ہوتا ہے۔ یہ تشبیہ نہایت دل چسپ، برمحل اور معنی خیز ہے، شاعر کے لیے قافیہ محض الفاظ کا حسن نہیں بلکہ اس کی تخلیق کا بنیادی عنصر ہے۔ اسی پر اس کی شاعری کے حسن وجمال کا دارومدار ہوتا ہے۔ اچھے شاعر کے لیے قافیہ کا انتخاب ایک سنجیدہ معاملہ ہوتا ہے اور وہ اس میں اپنی مہارت ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی زندگی میں چار پائی کی موجودگی محض ایک اتفاق نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بغیر روزمرہ زندگی کا تصور بھی محال ہے۔ جس طرح شاعر قافیے کے بغیر اپنی شاعری کو نامکمل محسوس کرتا ہے اسی طرح ہندوستانی بھی چار پائی کے بغیر زندگی کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ بقول شاعر:

چند برتن ہیں چار پائی ہے　　یہی دولت، یہی کمائی ہے　　(توقیر چغتائی)

ایک شاعر کے لیے قافیہ صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی پہچان بھی ہے۔ اگر کوئی شاعر اپنی شاعری میں اچھے قافیوں کا استعمال نہ کرے تو اسے شاعر ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانیوں کے رہن سہن میں چار پائی اتنی گہری جڑیں رکھتی ہے کہ اس کے بغیر ان کے طرزِ زندگی کی شناخت ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ صبح بیداری سے لے کر رات سونے تک، بیماری سے لے کر خوشی کے مواقع تک، چار پائی، ہر موقع پر ساتھ نبھاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ جملہ درحقیقت ہندوستانی طرزِ زندگی کی ایک منفرد خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے۔ جس طرح قافیہ، شاعری کے وزن اور آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے اسی طرح چار پائی بھی ہندوستانی طرزِ زندگی کے حسن کو برقرار رکھتی ہے۔ شاعر اگر قافیے کے ذریعے اپنی شاعری میں حسن اور روانی پیدا کرتا ہے تو ہندوستانی فرد چار پائی کے ذریعے اپنی زندگی کو ترتیب اور آسانی فراہم کرتا ہے۔ یہ تشبیہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ چار پائی ہندوستانی معاشرت میں صرف ایک عملی ضرورت نہیں بلکہ ایک جذباتی وابستگی کی علامت بھی ہے۔ بقول شاعر:

کبھی گھٹنوں پڑے رہتے تھے ماں کی گود میں اس پر　　چلو ماں نام رکھتے ہیں وراثت اس چار پائی کا　　(وشنو وراٹ)

مصنف کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو چارپائی پر وہی اعتماد ہے جو طالب علم کو غل غباڑے پر ہوتا ہے۔ ''غل غپاڑا'' دراصل طالب علموں کی اس لاپروا فطرت کی طرف اشارہ ہے جس میں وہ پڑھائی سے زیادہ اِدھر اُدھر کے مشاغل میں مگن رہتے ہیں۔ عموماً طلبا اپنے رنگین مزاج، دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے مستقبل سے زیادہ تفریحات پر یقین ہوتا ہے۔ طالب علم انھی چیزوں میں زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں جو ان کے وقت کو خوش گوار بنا سکیں۔ انھیں غل غپاڑے میں مصروف رہنا زیادہ مرغوب ہوتا ہے، مصنف نے طالب علموں کے اس رجحان کو ہندوستانیوں کے چارپائی کے ساتھ تعلق کے برابر قرار دیا ہے۔ جیسے طالب علم کے لیے تفریح ناگزیر ہے اسی طرح ایک ہندوستانی کے لیے چارپائی ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

اس اقتباس میں ہندوستانی معاشرت کی ایک عام حقیقت کو دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی چاشنی اور دل کشی بھی موجود ہے۔ رشید احمد صدیقی کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ وہ ایک عام موضوع کو بھی فلسفیانہ وسعت دے دیتے ہیں اور قاری اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک چارپائی محض ایک مادی شے نہیں بلکہ ایک مکمل طرزِ زندگی کی علامت ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی عادات، رویوں اور روزمرہ زندگی میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں گہرے مشاہدے کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کا شگفتہ انداز قاری کو اپنی روزمرہ زندگی کے ایسے پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

عبارت نمبر 2

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے، اس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب ''ولایت پاس'' ہو کر آئے۔ ریاست میں کوئی اسامی نہ تھی جوان کو دی جا سکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے، راجا صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کر آئے ہیں۔ راجا صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہلچل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے، یہ ان کی جگہ پر تعینات کر دیے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینئر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہمیں چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیے پر اور طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ چارپائی ایک اچھے بکس کا کام بھی دیتی ہے۔ تکیے کے نیچے ہر قسم کی گولیاں۔ ایک آدھ روپیہ، رسالے، کتابیں، اسٹیشنری وغیرہ رکھے ہیں۔ نیز جو کام کوئی نہیں کر سکتا، وہ کام چارپائی سے لیا جاتا ہے۔ چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت و ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کی ہیں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چارپائی ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں وہ چارپائی کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک چارپائی صرف فرنیچر کی ایک قسم نہیں بلکہ ہندوستانی طرزِ زندگی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ ہندوستان میں اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ہندوستانی اسی پر پیدا ہوتے ہیں، اسی پر جوان ہوتے ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو اسی پر دوا کھاتے ہیں، اسی پر آرام کرتے ہیں، اسی پر دعا مانگتے ہیں

اور آخرِ کار اسی پر جان دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔

بزرگ رخصت ہوئے ہیں لیکن برآمدے میں پرانے وقتوں کی چارپائی پڑی رہے گی (کول جوئیہ)

مصنف کہتے ہیں کہ چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ جیسے چارپائی کو کسی بھی کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح ریاستی ملازم کو بھی کسی بھی عہدے پر بٹھایا جا سکتا ہے۔ مصنف طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ریاستی ملازم ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے اسی لیے اسے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لیے وہ ایک مثال دیتے ہیں۔ ایک ریاست میں کوئی آدمی ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آیا۔ وہ کسی مناسب عہدے کی تلاش میں تھا مگر ریاست میں اس کے لیے کوئی موزوں جگہ نہ تھی۔ وہ آدمی بھی چارپائی کی طرح ہر جگہ کھپ سکتا تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت بھانپ کر راجا صاحب تک یہ بات پہنچا دی کہ اگر اسے کہیں جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے بات کر کے راجا صاحب کی جگہ خود راجا بننے کی تیاری کر چکا ہے۔ راجا صاحب کو خطرہ محسوس ہوا اور ریاست میں ہلچل مچ گئی۔ فوری طور پر اس شخص کو ایک عہدہ دینے کی تدبیر کی جانے لگی۔

برطانوی دور کے ہندوستان میں کچھ آزاد ریاستیں تھیں جن کے سربراہ ''نواب یا راجا'' کہلاتے تھے۔ یہ راجا یا نواب اپنی ریاست کے سربراہ ہونے کے باوجود برطانوی حکام کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔

یہاں ''لاٹ صاحب'' کا ذکر آیا ہے۔ اردو زبان میں ''لاٹ'' دراصل انگریزی لفظ ''لارڈ'' (Lord) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لاٹ صاحب سے مراد وہ اعلیٰ انگریز افسر یا حاکم ہوتا تھا جو برطانوی حکومت کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہ اصطلاح خاص طور پر گورنر جنرل یا وائسرائے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس دور میں یہ اصطلاح مقامی حکمرانوں، ریاستی راجاؤں اور دیگر حکام کے لیے ایک خوف اور برتری کی نشانی بن چکی تھی۔ اس عبارت میں ''لاٹ صاحب'' کا ذکر اسی تناظر میں آیا ہے کہ اگر راجا صاحب نے اس شخص کو کوئی عہدہ نہ دیا تو وہ لاٹ صاحب کے ذریعے راجا صاحب کی جگہ حاصل کرے گا۔ اس زمانے میں یہ ناممکن بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ برطانوی حکام اپنی مرضی سے مقامی حکمرانوں کو معزول بھی کر دیتے تھے اور اپنی پسند کے افراد کو آگے لے آتے تھے۔ بقول شاعر:

آپ ہی کی ہے عدالت، آپ ہی منصف بھی ہیں یہ تو کہیے آپ کے عیب و ہنر دیکھے گا کون
(منظر بھوپالی)

اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے۔ چناں چہ سول سرجن کی جگہ اس آدمی کو تعینات کر دیا گیا۔ اس آدمی کا علاج معالجے سے دور دور تک واسطہ نہیں تھا مگر ہندوستانی چارپائی کی طرح اسے کسی نہ کسی طرح کام پر لگا کر ڈاکٹر بنا دیا گیا۔ کچھ دن گزرے تو ریاست کے انجینئر صاحب فالج کا شکار ہو گئے۔ اس آدمی کو انجینئر کی جگہ دے دی گئی حالاں کہ وہ نہ ڈاکٹر بننے کے لائق تھا، نہ انجینئر۔ جیسے ہندوستان میں چارپائی ہر حالت میں کام آتی ہے ویسے ہی اس شخص کو اہلیت نہ ہونے کے باوجود مختلف عہدوں پر لگا دیا گیا۔ بقول شاعر:

کچھ امیروں کی جی حضوری میں ایک مفلس کی چارپائی گئی

سول سرجن کے بعد وہ آدمی انجینئر بنا دیا گیا لیکن یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ ایک دن یہ خبر آئی کہ وہ صاحب ریاست کی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر براجمان ہو چکے تھے۔ ایسا شخص جو قانون سے ناواقف تھا، انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر فیصلے کرنے لگا۔ جس طرح چارپائی مہمانوں کے لیے بھی رکھی جاتی ہے، بیمار کے لیے بھی، کھانے پینے کے لیے بھی اور آخر میں وہی چارپائی میت کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے، اسی طرح وہ صاحب ہر منصب کے لیے موزوں قرار پاتے رہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ اب اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دیں تاکہ یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہے۔

یہ صورت حال ہندوستانی طرزِ حکومت اور نوکر شاہی پر ایک لطیف مگر چبھتا ہوا تبصرہ ہے۔ مصنف نے مزاحیہ انداز میں یہ دکھایا ہے کہ بعض لوگ محض اپنی چالاکی، حاضر دماغی اور موقع پرستی کے باعث ہر جگہ فٹ ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی صلاحیت اور اہلیت کو پرکھا نہیں جاتا۔ جیسے ہندوستان میں چارپائی ہر جگہ اور ہر موقع پر قابلِ استعمال ہوتی ہے، ویسے ہی کچھ لوگ کسی بھی

منصب پر تعینات کیے جاسکتے ہیں، خواہ وہ اس کام کے لیے موزوں ہوں یا نہ ہوں۔ چارپائی اور ریاست کے ملازم کا موازنہ بہت موزوں اور دل چسپ ہے۔

اس عبارت میں ہندوستانی سماج کی ایک گہری سچائی کو نہایت لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے طنز و مزاح کے پیرائے میں ایک ایسی حقیقت بیان کی ہے جو آج بھی زندہ نظر آتی ہے۔ یہ عبارت صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ہندوستانی طرزِ زندگی کی عکاسی ہے۔ یہاں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ ہر چیز کو ہر کام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، چاہے وہ چارپائی ہو یا کوئی سرکاری ملازم۔ یہاں منصب اہلیت سے نہیں بلکہ موقع پرستی، چالاکی اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت سے حاصل کیے جاتے ہیں۔

مصنف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک معمولی سے موضوع میں ایک گہرا سماجی تجزیہ چھپا دیا ہے۔ اس عبارت کو پڑھ کر قاری مسکراتے ہوئے ایک ایسی حقیقت پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جسے وہ اکثر نظر انداز کر دیتا ہے۔

عبارت نمبر 3

یہی حالت چارپائی کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ فرض کیجیے آپ بیمار ہیں، سفرِ آخرت کا سامان میسر ہو یا نہ ہو، اگر چارپائی آپ کے پاس ہے تو دنیا میں آپ کو کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پُڑیا تکیے کے نیچے، جوشاندے کی دیگچی سرہانے رکھی ہوئی، چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے، جھاڑو، آش جو، روئی کے پھاہے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھر، بھنگے، گھر یا محلے کے ایک دو بچے، جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا۔ اچھے ہو گئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کر کے غسل کرا دیا، ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لب گور لائے گئے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیے پر اور طالب علم کو غل غپاڑے پر۔ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک مہمانوں کے لیے سب سے موزوں چیز چارپائی ہے۔۔ پورا گھر چھوڑ کر اسے پرانی چارپائی پر نئی دری بچھا کر بٹھا دیا جاتا ہے اور اسی چارپائی پر سُلا بھی دیا جاتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کی ہیں اور مصنف کے نزدیک صرف چارپائی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف چارپائی کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ ہندوستانی اس سے کیا کیا کام لیتے ہیں۔ چارپائی محض ایک فرنیچر کا حصہ نہیں بلکہ پورے ہندوستانی طرزِ زندگی کا ایک لازمی جُز ہے۔ یہ صرف سونے اور بیٹھنے کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر ضرورت میں کام آتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے ہندوستانی ریاست کے ایک ایسے ملازم کا ذکر کیا ہے جسے ہر عہدے پر لگا دیا جاتا تھا۔ وہ کبھی سول سرجن، کبھی انجینئر اور آخر کار ریاست کے چیف جسٹس کی کرسی تک پہنچ گیا، حالاں کہ وہ ان میں سے کسی بھی منصب کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ مصنف نے اس ملازم کو ہندوستانی چارپائی سے تشبیہ دی ہے۔ چارپائی کو بھی کسی بھی حالت میں، کسی بھی کام کے لیے اور کسی بھی موقع پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چارپائی کا اس ملازم سے موازنہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ چارپائی اس ملازم سے کہیں زیادہ کارآمد ہے۔ ملازم تو محض عہدے بدلتا رہا اور ریاست میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتا رہا حالاں کہ وہ کسی عہدے پر براجمان ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں چارپائی واقعی ہر کام آتی ہے۔ کوئی بیمار ہو جائے تو چارپائی ہی اس کا سب سے پہلا سہارا بنتی ہے۔ پیدا

ہونے سے قبر میں دفن ہونے تک یہ زندگی کے ہر موڑ پر کام آتی ہے۔ سفرِ آخرت کا کوئی سامان میسر ہو یا نہ ہو، اگر چارپائی میسر ہے تو کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہتی۔ صحت کی حالت میں تو چارپائی کام آتی ہی ہے، بیماری کی حالت میں بھی یہ سب سے بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے۔ بیماری کی حالت میں مریض چارپائی پر لیٹا ہے۔ دوا کی پڑیا اس کے سرہانے رکھی جاتی ہے، گرم جوشاندہ بھی چارپائی کے قریب رکھا جاتا ہے اور تیمارداری کے تمام مراحل بھی یہیں مکمل ہوتے ہیں۔ قسمت اچھی ہوئی تو صحت مل جانے کے بعد چارپائی سے اٹھ گئے۔ اگر قسمت خراب ہوئی اور کسی دوا نے اثر نہ کیا تو اسی چارپائی پر دنیا سے کوچ کر گئے۔ یعنی چارپائی زندگی کے اخیر تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ زندگی اور موت دونوں میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔ کسی بیماری میں دوا ملے یا نہ ملے، ڈاکٹر میسر ہو یا نہ ہو، خوراک دستیاب ہو یا نہ ہو، اگر چارپائی میسر ہو تو بیمار کو کم از کم سکون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ بقول شاعر:

صحن میں چارپائی پر بیٹھا ہوں دیر سے لمحوں کا مسئلہ ہوں اور صدیوں سے ہوں ملا ہوا (شاہین عباس)

چارپائی کی موجودگی محض آرام یا بیماری کے دوران میں سہولت دینے تک محدود نہیں بلکہ اس کے نیچے ایک الگ دنیا بستی ہے۔ مصنف چارپائی کے نیچے رکھی گئی چیزوں کا ذکر دل چسپ انداز میں کرتے ہیں۔ چارپائی کے نیچے مختلف چیزوں کا جمع ہونا ایک عام ہندوستانی گھر کا منظر پیش کرتا ہے۔ چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے، جھاڑو، جو کے دلیے کی دیگچی، روئی کے پھاہے اور کاغذ کے ٹکڑے رکھے ہوتے ہیں۔ چارپائی کے اوپر آرام کیا جاتا ہے اور اس کے نیچے جو جگہ خالی ہوتی ہے وہاں کئی چیزیں سمیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں۔ بیمار آدمی کی چارپائی کے قریب اور نیچے خاص طور پر بہت سی چیزیں رکھی ہوتی ہیں۔ مریض کے کھانے پینے کی چیزیں اور وہ فالتو چیزیں جن کو چھپانا یا سنبھال کر رکھنا ضروری ہو، انھیں چارپائی کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوئی، ذرا جھک کر فوراً چارپائی کے نیچے سے نکال لی۔ صندوق یا الماری کھولنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے یہ جگہ بہت مناسب ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں گھر کا سامان چارپائی کے نیچے محفوظ کیا جاتا ہے، مچھروں اور مکھیوں کی بہترین آماج گاہ بھی یہی ہوتی ہے۔ مچھر، کھٹمل اور بھنگے دن بھر چارپائی کے نیچے چھپے رہتے ہیں اور رات کو اوپر سوئے ہوئے بندے کی خبر لیتے ہیں۔ بعض اوقات گھر یا محلے کے دو ایک بچے بھی چارپائی کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی نزلہ، زکام یا بخار میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔ زکام یا خسرے میں مبتلا بچے کے لیے بہترین پناہ گاہ چارپائی کے نیچے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا مشاہدہ ہے جس سے ہر ہندوستانی واقف ہے۔ بچے چارپائی کے نیچے کھیلتے ہیں، چھپ کر بیٹھتے ہیں اور اگر بیمار ہوں تو وہیں پڑے رہتے ہیں۔ اگر بیمار بچہ صحت یاب ہو گیا تو اس کی ماں چارپائی کھڑی کر کے اسے غسلِ صحت دے دیتی ہے۔ خدانخواستہ اگر بچہ صحت یاب نہ ہوا تو بھی چارپائی بہت اہم چیز بن جاتی ہے۔ بیماری سے مرنے والے کو چارپائی پر لٹایا جاتا ہے اور دفن کرنے کے لیے قبر تک لایا جاتا ہے۔ گویا چارپائی صرف بیماری اور آرام کے لیے نہیں بلکہ بچوں کی تفریح کا مقام اور بیماری کی حالت میں ان کا ایک غیر رسمی ہسپتال بھی ہے۔

اقتباس کے آغاز میں مصنف نے چارپائی کو اس ملازم سے بہتر قرار دیا ہے جو اہلیت نہ ہونے کے باوجود ہر عہدہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس ملازم کا معاملہ ہندوستانی معاشرت کی خاص سوچ کا عکاس ہے۔ ہندوستانی لوگوں کی سوچ ہے کہ ہر چیز کو ہر کام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح چارپائی کو ضرورت کے مطابق کبھی سونے کے لیے، کبھی بیماری میں آرام کے لیے، کبھی ساز و سامان رکھنے کے لیے اور کبھی میت اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ بھی ہر موقع پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ چارپائی واقعی ایک مفید چیز ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاستی ملازم کسی کام کا نہیں ہوتا تھا۔ چارپائی ہر حالت میں کارآمد ثابت ہوتی ہے جب کہ چالاکی سے کام لینے والا ملازم ہر جگہ بیکار ہی رہا۔ چارپائی دوسروں کے کام آتی ہے جب کہ ملازم صرف اپنے مفاد کے لیے راستہ بناتا ہے۔ اس لحاظ سے چارپائی زیادہ اہم اور کارآمد چیز ہے۔

مصنف نے طنز و مزاح کے انداز میں چارپائی کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا ہے۔ چارپائی ہندوستانی طرزِ زندگی کا ایک نمایاں حصہ ہے لیکن عام طور پر اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مصنف کے اسلوب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی عام چیزوں کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جن میں گہری معنویت چھپی ہوتی ہے۔ وہ ہنسی مذاق میں گہری باتیں کہہ دیتے ہیں

جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس اقتباس میں انھوں نے ہندوستانی طرزِ زندگی کے ایک پہلو کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی ایک مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ قاری اسے دیکھ کر محظوظ بھی ہوتا ہے، مسکراتا بھی ہے اور غور و فکر میں بھی کرتا ہے۔

مہارت نمبر 4

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرا، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، خیمہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ، سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے۔ کوئی مہمان آیا۔ چارپائی نکالی گئی۔ اس پر ایک نئی دری بچھادی گئی جس کے تہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی اراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب مع اچکن، ٹوپی، بیگ بغچی کے بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان بدنصیب! چارپائی ہی پر ان کا منھ ہاتھ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ سو رہیں گے۔ سو جانے کے بعد اُن پر سے مچھر مکھی اس طرح اُڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خوانچے پر سے جھاڑو نما مور چھل سے مکھیاں اُڑا رہا ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیے پر اور طالب علم کو غل غپاڑے پر۔ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک مہمانوں کے لیے سب سے موزوں چیز چارپائی ہے۔ پورا گھر چھوڑ کر اسے پرانی چارپائی پر نئی دری بچھا کر بٹھایا جاتا ہے اور اسی چارپائی پر سلا دیا جاتا ہے۔ چارپائی کو اچھے بکس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ تکیے کے نیچے ہر قسم کی گولیاں، ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، نقشِ سلیمانی رکھا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کی زندگی کی شاید ہی کوئی ایسی سرگرمی ہو جو چارپائی یا اس کے آس پاس انجام نہ پاتی ہو۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ باغ کسی اور کا ہوتا ہے، چارپائی باغبان کی ہے۔ نیز اس چارپائی پر اُچھلنے کودنے والے نا جانے بڑے ہو کر کیا بنیں۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

رشید احمد صدیقی اپنے مشاہدے کے ذریعے روزمرہ زندگی کے معمولی پہلوؤں کو غیر معمولی بنا دینے کا فن رکھتے ہیں۔ وہ سادہ الفاظ میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو بیک وقت مزاحیہ بھی ہوتی ہیں اور معنی خیز بھی۔ وہ ہندوستانی طرزِ زندگی، رویوں اور معاشرتی حقیقتوں کو بہت دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ چارپائی کے ذکر میں بھی وہ صرف سونے اور بیٹھنے کے ایک فرنیچر کی بات نہیں کرتے بلکہ ہندوستانی طرزِ زندگی کے عملی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ چارپائی ایک مہمان خانہ بھی ہے، بیڈ روم بھی ہے، غسل خانہ بھی ہے، اسٹور بھی ہے اور دواخانہ بھی ہے۔ چارپائی یہ سب کچھ کبھی کبھی ایک ساتھ بن جاتی ہے اور ان میں سے بہت کچھ کبھی کبھی بنتی ہے۔ ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو جو حیثیت حاصل ہے ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ سب کچھ بننے کی صلاحیت ہوتی ہے ایک چارپائی میں۔ ہندوستانی گھروں میں وسائل محدود ہونے کی وجہ سے ہر چیز کو ہر مقصد کے لیے استعمال کرنے کی روایت عام ہے۔ اسی روایت کے تحت چارپائی ہر وقت ہر ضرورت کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔

ہندوستانی گھروں میں اگر کوئی مہمان آجائے تو سب سے پہلے چارپائی نکالی جاتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی مہمان نوازی کی روایت کا یہ ایک لازمی جز ہے۔ ہمارے ہاں مہمانوں کی عزت اور خدمت کو ہمیشہ ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر چہ مہمان کے لیے

کوئی الگ کمرہ یا خاص اہتمام ممکن نہیں ہوتا مگر جو کچھ بھی دستیاب ہو، اسی میں اس کی خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ مہمان کے لیے صندوق سے نکال کر ایک نئی دری بچھائی جاتی ہے۔ وہ دری صرف مہمانوں کے استعمال کے لیے ہوتی ہے۔ اسے ہمیشہ نہ کر کے صندوق میں سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ جب کوئی مہمان آتا ہے تو میزبان بڑے شوق سے چارپائی پر وہی خاص دری بچھا دیتے ہیں۔ اس دری پر تہوں کے نشان واضح ہوتے ہیں۔ چارپائی پر بچھی دری کی تہوں کا منظر کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے کسی کھیت کو مختلف مینڈوں اور نالیوں سے الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔

مہمان آتا ہے تو ایک اور دل چسپ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ مہمان بھی اچھی طرح تیار ہو کر اور سج دھج کر آتا ہے۔ وہ اپنی اچکن، ٹوپی، بیگ اور بغچی کے ساتھ چارپائی پر براجمان ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان بدنصیب۔ یہ جملہ ہندوستانی مہمان نوازی کی ایک ایسی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے جو اکثر لوگوں کے مشاہدے میں آئی ہوگی۔ ہندوستان میں مہمان نوازی کی روایت بہت مضبوط ہے۔ یہاں لوگ مہمانوں کی عزت اور خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اکثر مہمان ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے تکلفی کی ساری حدیں پار کر جاتے ہیں۔ وہ بغیر اطلاع دیے آجاتے ہیں اور غیر ضروری طور پر لمبا قیام کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس انداز سے براجمان ہوتے ہیں کہ جیسے میزبان پر کوئی احسان کر رہے ہوں۔ دوسری طرف میزبان چاہے جتنا مجبور ہو، اسے ہر حال میں مہمان کی خدمت کرنی پڑتی ہے، بعض اوقات وہ اپنی ضروریات قربان کر کے اور گھر والوں کو تکلیف دے کر بھی مہمان کی خدمت کرتا ہے۔

مہمان اور میزبان دونوں تکلفات سے کام لیتے ہیں۔ اسی کشمکش کو مصنف نے لطیف اور مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ میزبان کو دیکھا جائے تو اس کے پاس وسائل محدود ہیں لیکن وہ اپنی روایت کی وجہ سے مجبور ہے کہ مہمان کی عزت کرے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس کی خدمت کرے۔ وہ اپنی چارپائی، اپنی دری اور اپنے گھر کے ماحول کو مہمان کے لیے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے مہمان کی خدمت ایک ذمہ داری بھی ہے اور ایک امتحان بھی۔ دوسری طرف مہمان کو دیکھیں تو وہ ایک عجیب بے فکری میں مبتلا ہے۔ وہ مزے سے بیٹھا ہے اور میزبان کی بے چینی کو نہ دیکھ رہا ہے اور نہ محسوس کر رہا ہے۔ ایسے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بے وقوف کون اور بدنصیب کون ہے؟ وہ مہمان جو بے تکلفی کی انتہا پر ہے، وہ بے وقوف ہے یا وہ میزبان بدنصیب ہے جو چاہتے ہوئے بھی اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار نہیں کر سکتا۔

اس عبارت میں چارپائی کی مزید ایک خوبی اور اہمیت سامنے آتی ہے۔ چارپائی صرف مہمان کے بیٹھنے اور سونے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے اور بھی کام لیے جائیں گے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مہمان کا منھ ہاتھ دھلوایا جائے گا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں کھانے کا اہتمام ہوگا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں کھانا کھا کر وہ آرام کرے گا۔ کھانا کھا کر جب سفر کی تھکاوٹ اتارنے کے لیے آرام کرے گا تو اس کا سونا بھی کسی تماشے سے کم نہیں ہوگا۔ جیسے ہی وہ لیٹے گا، مکھیاں اور مچھر اس پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اس وقت میزبان کے لیے ایک نیا امتحان شروع ہو جائے گا۔ اس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مہمان کو پریشانی سے بچانے کے لیے مکھیوں کو اڑاتا رہے۔ میزبان مکھیاں اڑانے کا کام اس طرح انجام دے گا جیسے کوئی پھیری والا اپنے خوانچے سے جھاڑو نما مور چھل کے ساتھ مکھیاں اڑا رہا ہو۔ مہمان کسی ریڑھی پر پڑے سامان کی طرح بے سدھ پڑا ہوگا اور میزبان اس سے مکھیاں اڑانے کی کوشش کرے گا۔

مصنف نے اس اقتباس میں ساری منظر کشی اس قدر شگفتہ انداز میں کی ہے کہ پوری تصویر قاری کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ مہمان کی بے فکری، میزبان کی بے بسی اور چارپائی کی ہمہ گیریت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستانی طرزِ زندگی کا خاکہ پوری جزئیات کے ساتھ ذہن میں بن جاتا ہے۔ قاری اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے اور مسکراتے ہوئے سوچنے پر مجبور بھی ہو جاتا ہے۔

مہارت نمبر 5

چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا، جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی، دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع

ہوئی رہتی ہے، اس کو لے کر ملازمت سے سبک دوش ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کردیتے ہیں اور اس پر سال بھر کی پیاز کا ذخیرہ جمع کردیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز بٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کردیا گیا تھا۔ اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہوگئے تھے، جتنی ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں تمام کاموں کے لیے چارپائی موزوں ہے۔ بیمار سے لے کر صحت مند، بچے سے لے کر بوڑھے نیز عام لوگ اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق چارپائی کو استعمال کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری قوم نے اپنی سستی وکاہلی کے پیش نظر چارپائی ایجاد کی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ ہندوستانی چارپائی سے سارے کام نکلوا لیتے ہیں۔ چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرا، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چارپائی ہندوستان کی آب وہوا، تمدن، معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا بھرپور نمونہ ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کی جو باتیں منتخب کی ہیں، مصنف کے نزدیک صرف چارپائی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف چارپائی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی طرزِ زندگی کے کئی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس اقتباس میں چارپائی کو ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ہر موقع پر کام آتی ہے۔ یہاں وہ چارپائی کے ایک اور عملی فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ نہ صرف سونے، آرام کرنے یا بیماروں کی دیکھ بھال کے لیے استعمال ہوتی ہے بلکہ یہ کسانوں اور دیہاتوں کے لیے اناج سکھانے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

دیہاتوں میں چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جاتا ہے۔ سارا دن چڑیوں کو اڑایا جاتا ہے مگر وہ بار بار آکر اس پر منڈلاتی ہیں اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے دانے چگتی رہتی ہیں۔ اس دوران میں گھر کے افراد، خاص طور پر بزرگ یا خواتین، چڑیوں کو بھگانے کے لیے مسلسل آوازیں نکالتے رہتے ہیں۔ وہ ہاتھ ہلا کر چڑیوں کو اڑاتے ہیں۔ بعض اوقات ہاتھ ہلانے کے ساتھ ساتھ انھیں بُرا بھلا بھی کہتے ہیں، مگر چڑیاں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ سارا دن چڑیاں اپنے فطری عمل میں مصروف رہتی ہیں اور انسان اپنی فطری جھنجھلاہٹ میں۔

اس کے ساتھ ہی وہ چارپائی کا ایک اور فائدہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ دیہاتی طرزِ زندگی کی یہ ایک دل چسپ روایت ہے۔ دیہاتوں میں شادی بیاہ یا دیگر تقریبات کے موقع پر چارپائیاں عام طور پر کھانے کی تیاری کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ گاؤں میں جب کوئی بڑی تقریب ہوتی ہے تو چارپائی کو باورچی خانے کے عارضی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر گوشت، چاول، سبزی اور کھانا بنانے کے دیگر اجزا رکھے جاتے ہیں۔ مصنف نے مزاحیہ انداز میں چارپائی کی افادیت کے کچھ اور پہلو بتائے ہیں۔

مصنف چارپائی کے زوال اور پرانی ہونے پر اس کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کو دل چسپ پیرائے میں بیان کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جیسے ایک سرکاری ملازم زندگی بھر کام کرتا ہے، مختلف محکموں میں خدمات انجام دیتا ہے۔ جب عمر کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو پنشنلے کر ملازمت سے سُبک دَوش ہوجاتا ہے۔ چارپائی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ چارپائی

بھی ایک سرکاری ملازم کی طرح طویل عرصے تک گھر کے افراد کی خدمت میں مصروف رہتی ہے۔ اسے کبھی آرام کے لیے، کبھی دوا خانے کے طور پر، کبھی مہمانوں کے لیے اور کبھی کھانوں کی تیاری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ پرانی ہوجاتی ہے، اس کا بان کمزور ہوجاتا ہے، اس کی رسیاں ٹوٹنے لگتی ہیں، اس کی لکڑی پرانی ہو کر چرچرانے لگتی ہے اور اس کے پائے ڈھیلے ہوجاتے ہیں تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا ہے جو ریٹائرڈ ملازم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی اسے کسی کال کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہاں کال کوٹھری میں داخل کردینے کا مطلب یہ ہے کہ پرانی اور کمزور ہوجانے کے بعد چارپائی کو کسی غیر اہم جگہ مثلاً: سٹور روم یا گھر کے کسی کونے میں رکھ دیا جاتا ہے، جہاں وہ بے مصرف ہو کر رہ جاتی ہے۔ جیسے ایک سُبک دوش ملازم کو گھر میں ایک الگ کونے میں بٹھا دیا جاتا ہے اسی طرح چارپائی بھی اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے اور گھر کے کسی کونے میں رکھ دی جاتی ہے۔ بقول شاعر:

مہینوں بھائی بندوں نے مرا ماتم کیا مضطر مہینوں روئے خالی چارپائی دیکھ کر (مضطر خیرآبادی)

پرانی چارپائی کو گھر کے ایک گوشے میں رکھ دیا جاتا ہے لیکن وہاں بھی اسے بے مصرف نہیں چھوڑا جاتا۔ اس پر سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کردیا جاتا ہے۔ پیاز کا ذخیرہ جمع کرنا دیہی اور شہری گھرانوں کی ایک عام روایت ہے۔ لوگ آلو، پیاز اور دیگر اشیا جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں چارپائی پر پھیلا دیتے ہیں تاکہ انھیں ہوا لگتی رہے اور وہ خراب نہ ہوں۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جنھیں گھروں میں لمبے عرصے تک استعمال کیا جاتا ہے۔ اس عبارت میں پیاز کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیوں کہ پیاز کی تیز بو پرانی چارپائی کی رسیوں میں اس طرح جذب ہوجاتی ہے کہ پیاز اٹھا لینے کے باوجود بھی ان کی بو چارپائی سے ختم نہیں ہوتی۔ مصنف ایسی ہی ایک چارپائی پر سونے کا تجربہ بیان کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ دیہات میں کسی سے ملنے گئے۔ رات کو میزبان نے ان کے سونے کا انتظام کیا اور ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر بستر بچھا دیا گیا۔ دیہات کے سادہ مزاج لوگ اپنے مہمانوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ دیہاتی میزبان نے کوٹھری میں پڑی چارپائی پر مصنف کے سونے کا انتظام کیا اور اس پر ذخیرہ شدہ پیاز اٹھا کر چارپائی کے نیچے رکھ دیے۔ کئی سالوں سے کسی کونے میں پڑی چارپائی پر بیٹھنا یا لیٹنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ پرانی چارپائی، پیاز کی تیز بو اور کال کوٹھری کے ماحول سے مصنف کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ''چودہ طبق روشن ہونا'' ایک محاورہ ہے جس کا مطلب صدمہ پہنچنا، تکلیف یا غیر معمولی صورت حال پیش آنا ہے۔ مصنف کہتے ہیں ''اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہوگئے تھے جتنے ساری پیازوں میں چھلکے تھے۔'' پیاز کے چھلکوں کی تہیں ہوتی ہیں۔ جب پیاز کو چھیلا جاتا ہے تو اس کی بے شمار تہیں اترتی چلی جاتی ہیں۔ کال کوٹھری کی گھٹن اور پیاز کی تیز بو سے مصنف کے چودہ نہیں بلکہ اتنے طبق روشن ہوگئے تھے جتنے پیاز کے چھلکوں کی تہیں تھیں۔ تکلیف یا غیر معمولی حالت کا سامنا کرنے سے کسی پر زندگی کی حقیقتیں روشن ہوتی ہیں اس بات کو آسمان کے چودہ طبق روشن ہونے سے واضح کیا گیا ہے۔ پیاز کے چھلکوں کو آسمان کے چودہ طبق سے تشبیہ دینا منفرد انداز ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیاز کی کثرت اور ان کی تیز بو نے مصنف کو رات بھر بے چین رکھا۔

اس عبارت میں ہندوستانی طرزِ زندگی، سرکاری ملازمین کی حالت اور دیہی طرزِ بود و باش میں مہمان نوازی کی روایت کو نہایت دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

عبارت نمبر 6

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے، تکیے کے نیچے ہر قسم کی گولیاں، جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی واقف نہیں ہوتا، ایک آدھ روپیا، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، تھوڑا بہت ناشتا، نقشِ سلیمانی، فہرست دواخانہ، سمن، جعلی دستاویز کے کچھ مسودے، یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو، اجالا ہو یا اندھیرا، اس صحت کے ساتھ آنکھ بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے، جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں تمام کاموں کے لیے چارپائی موزوں ہے۔ بیمار سے لے کر صحت مند، بچے سے لے کر بوڑھے نیز عام لوگ اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق چارپائی کو استعمال کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری قوم نے اپنی سستی وکاہلی کے پیش نظر چارپائی ایجاد کی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ ہندوستانی چارپائی سے سارے کام نکلوا لیتے ہیں۔ چارپائی کو ڈرائنگ روم ،سونے کا کمرا، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چارپائی ہندوستان کی آب وہوا، تمدن، معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا بھرپور نمونہ ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کی جو باتیں منتخب کی ہیں، مصنف کے نزدیک صرف چارپائی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی تحریر کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ عام اور معمولی چیزوں کو اپنے اندازِ بیان سے اہم اور دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ یہاں وہ چارپائی کو ایک سونے اور بیٹھنے کا فرنیچر ہی نہیں بلکہ ایک مکمل ذخیرہ خانہ، باکس یا پورا دفتر، دکان اور رازوں کی پٹاری قرار دیتے ہیں۔

ہندوستانی معاشرت میں چارپائی کا جو مقام ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ چارپائی نہ صرف سونے کے لیے استعمال ہوتی ہے بلکہ اس پر بیٹھ کر دنیا جہان کے کام کیے جاتے ہیں۔ یہ صرف ایک آرام گاہ نہیں بلکہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں روزمرہ کی ضروری اشیا رکھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ چھوٹے موٹے خزانے کا درجہ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ چارپائی کے تکیے کے نیچے مختلف قسم کی دوائیاں رکھی ہوتی ہیں جن کے استعمال اور ضرورت سے صرف وہی شخص واقف ہوتا ہے جو ان کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنی بیماریوں یا جسمانی کیفیات کو دوسروں سے چھپاتے ہیں اور اپنی دوائیاں خفیہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک طنز بھی ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ خود کو بیمار ظاہر کرتے ہیں اور چارپائی پر لیٹے رہنے کا بہانہ کرتے ہیں، جب کہ حقیقت میں ان کی دوا صرف ایک نفسیاتی سہارا ہوتی ہے۔

مصنف مزید کہتے ہیں کہ چارپائی پر اور اس کے اردگرد پیسے، دھیلے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، ناشتا، نقشِ سلیمانی، دواخانوں کی فہرست، عدالتی سمن اور جعلی دستاویزات کے مسودے وغیرہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چارپائی پر اکثر وہ چیزیں رکھی جاتی ہیں جن کی فوری ضرورت پیش آ سکتی ہے یا جنھیں محفوظ رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ اکثر گھروں میں تکیے کے نیچے یا چارپائی کے کناروں پر کچھ نہ کچھ ضرور رکھا ہوتا ہے۔ یہ چیزیں استعمال کرنے والے کے لیے بے حد اہم لیکن دوسروں کو بالکل غیر متعلقہ یا بیکار معلوم ہوتی ہیں۔

چارپائی پر موجود اشیا کی فہرست میں مصنف نے نقشِ سلیمانی کا ذکر کیا ہے۔ نقشِ سلیمانی ایک طلسماتی یا روحانی تعویذ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ نقشِ غیر مرئی قوتوں پر قابو پانے یا گمشدہ اشیا کو پانے میں مدد دیتا ہے لیکن اس کی کوئی تاریخی یا شرعی حیثیت ثابت نہیں۔ مصنف دراصل طنز کر رہے ہیں کہ بعض لوگ بہت ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ وہ بیماری کی حالت میں صرف دوا پر بھروسا نہیں کرتے بلکہ وہ چارپائی پر ہر قسم کی چیزیں رکھ لیتے ہیں چاہے وہ حقیقی ہوں یا محض توہمات پر مبنی ہوں۔ اسی طرح جعلی دستاویزات اور عدالتی سمن کا ذکر بھی خوب صورت طنز ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بعض افراد بیماری کے باوجود اپنی قانونی اور غیر قانونی سرگرمیوں کو نہیں بھولتے۔ وہ ان تمام سرگرمیوں کے ثبوت بھی اپنی چارپائی میں ہر وقت محفوظ رکھتے ہیں۔

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ چارپائی پر تکیے کے نیچے دوا کی پڑیاں، چند سکے، کتابیں، رسالے، کپڑے، نقشِ سلیمانی اور عدالتی سمن کے علاوہ جعلی دستاویزات کے مسودے بھی پڑے ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں بے ترتیب طریقے سے بکھری ہوتی ہیں۔ مگر ان کے مالک کو ہر چیز کی جگہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے کسی چیز کو تلاش کرنے کے لیے ٹٹولنا نہیں پڑتا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت

ہو تو اس کا ہاتھ اسی جگہ پہنچتا ہے جہاں وہ چیز چھپا کر رکھی ہوتی ہے۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے، آنکھیں بند کر کے وہ چیز تلاش کر لیتا ہے۔

چیزیں تلاش کرنے کی اس مہارت کو واضح کرنے کے لیے مصنف حکیم نابینا صاحب مرحوم کی مثال دیتے ہیں۔ حکیم نابینا بھی اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوا مکمل درستی سے نکالتے اور پھر واپس رکھ دیتے تھے۔ نابینا ہونے کے باوجود وہ مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض کو پہچانتے اور اس کی دوا تجویز کرتے۔ پھر بہت سی دواؤں میں سے اس خاص مریض کی مطلوبہ دوا پوری صحت کے ساتھ نکال کر مریض کو دے دیتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ دوا کی مقدار کا بھی بتاتے کہ مریض نے کتنی دوا دن میں کتنی بار استعمال کرنی ہے۔ پھر باقی دوا کو اسی بکس میں اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیتے تھے۔ یہ کوئی معمولی صلاحیت نہیں۔ مصنف طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں بتاتے ہیں کہ جس طرح حکیم نابینا اپنے دواخانے سے ہر دوا نکال لیتے تھے اسی طرح چارپائی کا مالک اپنی بکھری ہوئی چیزوں میں سے ہر چیز نکالنے کی مہارت رکھتا ہے۔ یہ ایک نہایت دل چسپ اور بامعنی تشبیہ ہے جو ہندوستانی طرزِ زندگی کو واضح کرتی ہے۔

مصنف کا یہ بیان صرف ایک فرد کی مہارت کا ذکر نہیں بلکہ ہندوستانی زندگی کے ایک اہم پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ یہاں لوگ چیزوں کو ترتیب سے رکھنے کی بجائے اپنی مخصوص لاپروائی کے ساتھ کہیں بھی ڈال دیتے ہیں۔ انھیں الماری یا درازوں کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ چارپائی ہی ان کی الماری بھی ہوتی ہے، تجوری بھی، اور ضرورت پڑنے پر میز بھی۔ جو لوگ بچپن سے اسی ماحول میں رہتے ہیں ان کے لیے چیزوں کو بغیر دیکھے نکال لینا اور واپس رکھ دینا کوئی بہت مشکل کام نہیں۔ یہ ایک ایسا طرزِ زندگی ہے جس میں بے ترتیبی بھی ایک ترتیب اختیار کر لیتی ہے۔

اس عبارت میں طنز و مزاح کی چاشنی میں ایک دل چسپ صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستانی گھروں میں چارپائی ایک مقدس حیثیت رکھتی ہے جہاں دنیا بھر کی اشیا جمع کی جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا حساب رکھنے والے ایسے نابغۂ روزگار ہوتے ہیں کہ وہ بند آنکھوں سے بھی ہر چیز ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ صرف مہارت نہیں بلکہ ایک فن ہے، جو صرف انھیں آتا ہے جو چارپائی کو زندگی کا ایک اہم جز سمجھتے ہیں۔

عبارت نمبر 7

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ، پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تام لوٹ بھی ہیں جنھیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ توقف کرنے میں غصے کا تاؤ مدھم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہمیں چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو قافیے پر اور طالب علم کو غل غپاڑے پر۔ ہندوستان میں چارپائی ہر کام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آیا تو اسی چارپائی پر نئی دری بچھا کر مہمان کو اس پر بٹھایا، کھلایا اور سُلایا۔ چارپائی ہندوستان کی آب وہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی طرح ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروساماں لیکن ہر نا موزوں کام کے لیے موزوں۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں مختص کی ہیں۔ میرے نزدیک تو چارپائی ان تمام لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ چارپائی پر لیٹے لیٹے تصور میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا ہوں جو صرف میرے ہی اشارے پر بنتی بگڑتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں چارپائی کو نہ صرف ہندوستانی معاشرت کا لازمی حصہ قرار دیا ہے بلکہ اسے اقتدار اور حکمرانی کا استعارہ بھی بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خاندان کے بڑے جو گھر کے کرتا دھرتا ہوتے ہیں چارپائی ہی پر براجمان ہو کر حکومت کرتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے احکام صادر کیے جاتے ہیں، فیصلے کیے جاتے ہیں اور کبھی کبھار سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔ گویا چارپائی محض آرام یا نیند کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک تخت حکومت بھی ہے جہاں سے گھر، خاندان بلکہ گاؤں کی سیاست بھی چلتی ہے۔

معاشرتی زندگی میں لوگوں کے درمیان تنازعات ہوتے رہتے ہیں۔ معاشرہ مختلف خیالات، ضروریات اور رویوں کے حامل افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب یہ افراد ایک ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہیں تو ان کے درمیان اختلافات اور تنازعات پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے اور نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے فیصلے ضروری ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے گھریلو معاملات سے لے کر قومی اور بین الاقوامی سطح تک، ہر جگہ ایسے مواقع آتے ہیں جہاں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر میں بچوں سے غلطی ہو جائے تو والدین بچوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اختلافات ہوں تو والدین فیصلہ کر کے ان کی تربیت کرتے ہیں تاکہ وہ درست سمت میں چلیں۔ خاندانوں یا قبیلوں کے درمیان جھگڑوں کے فیصلے کرنے کے لیے محلے یا خاندان کے بڑے سامنے آتے ہیں۔ وہ لوگوں کو جمع کر کے ان کی بات سنتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور وہ سکون کے ساتھ مل جل کر رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ خاندانوں یا گاؤں میں چارپائی کو وہ مقام حاصل ہے کہ کرتا دھرتا لوگ اس پر بیٹھ کر لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا، مظلوم کا ساتھ دینا اور ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ دینا انصاف یا عدل کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

ترجمہ: عدل کرو وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

چناں چہ لوگوں کے درمیان اختلافات اور تنازعات کو ختم کرنے کے لیے کرتا دھرتا لوگ فیصلے کرتے ہیں۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مختلف احکام جاری کرتے ہیں۔ گناہ گاروں یا مجرموں کو سزا دینے کا عمل بھی مکمل کیا جاتا ہے۔ یہ سارا کام خاندان کے کرتا دھرتا لوگ چارپائی پر براجمان ہو کر ہی کرتے ہیں۔

انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مجرموں کو سزا سنائی جاتی ہے۔ سزا دینے کا عمل بھی چارپائی سے شروع ہوتا ہے۔ آلاتِ سزا میں زبان، ہاتھ، پاؤں، ڈنڈا اور برتن شامل ہیں۔ سب سے پہلے سزا دینے کے لیے زبان استعمال ہوتی ہے۔ فیصلہ کرنے والے زبان سے ہی گناہ گار کی ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ اگر جرم سنگین ہو تو ہاتھ اور لاٹھی استعمال ہوتی ہے۔ گناہ گار چارپائی کے قریب آتا ہے اور اسے تھپڑ، مکا یا پاؤں سے ٹھوکر مار کر سزا دی جاتی ہے۔ اگر گناہ گار کا چارپائی سے فاصلہ زیادہ ہو اور ہاتھ اس کی کمر تک نہ پہنچے تو لاٹھی سے مدد لی جاتی ہے۔ بعض اوقات گنہ گار کا چارپائی سے فاصلہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہاں تک لاٹھی کا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی صورتِ حال میں چارپائی کے قریب پڑے پانی وغیرہ کے برتن کام آتے ہیں۔ خاندان کے بڑے، جوش اور غصے میں وہ برتن اٹھا کر گناہ گار کو مارتے ہیں۔ کسی بھی جھگڑے کا فیصلہ کرتے ہوئے فریقین کی باتیں، گواہوں کی گواہیاں اور دیگر معاملات چارپائی پر بیٹھ کر ہی نمٹائے جاتے ہیں۔ چارپائی پر بیٹھ کر ہی فیصلے سنائے جاتے ہیں اور سزا کا سارا عمل بھی چارپائی پر بیٹھ کر ہی مکمل کیا جاتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ سزا دینے میں توقف یا تاخیر نہیں کی جاتی۔ سزا دینے والے اتنے غصے میں ہوتے ہیں کہ سزا دینے کے لیے فوری عمل کرتے ہیں تاکہ غصے کا تاؤ کم نہ ہو۔ سزا دینے میں زیادہ دیر کرنے سے غصہ ٹھنڈا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہونے سے سوچنے کا موقع مل سکتا ہے کہ سزا دینی چاہیے یا نہیں۔ غور کرنے سے ممکن ہے کہ فیصلے کی غلطی واضح ہو جائے اور سزا ختم ہو جائے۔ اس لیے بغیر سوچے سمجھے ہاتھ میں جو چیز آئے مارنے لگتے ہیں تاکہ فیصلہ بدلا نہ جائے۔

جب انسان غصے میں ہوتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ درست ہے۔ لیکن اگر کچھ دیر رک جائے، سوچ لے تو شاید وہ اپنی غلطی سمجھ جائے اور فیصلہ بدل لے۔ اسی لیے اکثر لوگ فوری ردِ عمل دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بعد میں اپنے ہی فیصلے پر شک نہ

ہونے لگے۔ سزا دینے والے جلد بازی میں مار پیٹ شروع کر دیتے ہیں تاکہ سوچنے کا موقع نہ ملے اور اپنی غلطی کا پتہ نہ چل سکے۔

سزا دینے میں توقف کرنے سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں یہ احساس ہو جائے کہ اصل قصوروار تو وہ خود ہیں اور ان کا غصہ بے جا تھا۔ ایسی صورت میں وہ سزا کسی اور کو دینے کی بجائے خود کو قصوروار سمجھتے ہوئے، خود پر ہی تادیب کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگیں۔

اس عبارت میں مصنف نے بڑے شگفتہ انداز میں چارپائی کی افادیت بیان کی ہے۔ چارپائی صرف سونے کا فرنیچر نہیں بلکہ وہ چارپائی کو حکومت اور اختیار کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ انھوں نے لطیف طنز سے کام لیتے ہوئے مزاح پیدا کیا ہے جس سے قاری لطف بھی اٹھاتا ہے اور سوچنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔

عبارت نمبر 8

چارپائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانہ سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانچ سات چھوٹے بڑے بچے اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتے، بلی اور بے شمار مکھیاں آ پہنچیں۔ سب اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ صاحب خانہ صدر دسترخوان ہیں۔ ایک بچہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے، دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر، تیسرا کم کھانے پر، چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو مکھیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھی اڑاتی جاتی ہے اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔ شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھو کر فکرِ سخن میں چارپائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے، جیسے گھر میں آگ لگی ہے اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے، بیوی بچے بدن دبانے اور بددعائیں سننے لگے۔ کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو، کہیں گم ہوئی ہو، ہندوستانی اس کی تلاش کی ابتدا چارپائی سے کرتا ہے۔ اس میں ہاتھی، سوئی، بیوی، بچے، موزے، مرغی، چور، کسی کی تخصیص نہیں۔ رات میں کھٹکا ہوا، اس نے چارپائی کے نیچے نظر ڈالی۔ خطرہ بڑھا تو چارپائی کے نیچے پناہ لی۔ زندگی کی شاید ہی کوئی ایسی سرگرمی ہو جو چارپائی یا اس کے آس پاس نہ انجام پائی ہو۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم چارپائی کو ہرنا موزوں کام کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ چارپائی ایک اچھے بکس کا کام دیتی ہے۔ یعنی جو چیز چاہیں آپ اس میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک مہمان کی مہمان نوازی کے لیے بھی سب سے مناسب چارپائی ہے۔ ہندوستانی چارپائی کو زنبیل سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی شے گم ہو جائے اس کی تلاش چارپائی سے ہی شروع کی جاتی ہے۔

مصنف کے نزدیک شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے جو باتیں منتخب کی ہیں صرف چارپائی ہی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح سے بھرپور اس اقتباس میں ہندوستانی طرزِ زندگی کی سادگی اور گھریلو ماحول کا ایک دل چسپ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ چارپائی کو محض ایک فرنیچر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک ایسے مرکز کے طور پر پیش کرتے ہیں جو روزمرہ زندگی کے ہر پہلو سے جڑی ہوئی ہے۔ یہاں وہ چارپائی کے کھانے کی میز میں تبدیل ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ باورچی خانے سے گرم گرم کھانا چارپائی پر سجایا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ ہی گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد، جانور اور مکھیاں بھی اس دعوت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں لوگوں نے گھروں میں مرغیاں، کتے اور بلیاں وغیرہ پالی ہوتی ہیں۔ کھانے کی چیزیں دیکھ کر یہ سب بھی وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھلے ماحول میں مکھیوں کی بھی بہتات ہوتی ہے۔ چارپائی پر رکھے کھلے کھانے پر مکھیاں بھی جمع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح گھر کے پالتو کتے، بلیاں، مرغیاں اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے بچے بھی قرینے سے کھانے کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔

اس منظر میں ہندوستانی گھروں کا عمومی ماحول نظر آتا ہے جہاں کھانے کے وقت صرف گھر کے افراد ہی نہیں بلکہ گھر میں موجود ہر ذی روح مخلوق کسی نہ کسی شکل میں شریک ہوتی ہے۔ ایسے گھروں میں کھانے کے آداب کسی خاص اصول کے تابع نہیں ہوتے۔ یہاں فطری انداز میں سب مل جل کر کھاتے ہیں۔ گھر کے افراد کے ساتھ مرغیاں اور کتے بھی اپنی جگہ بنالیتے ہیں۔ ان سب میں بھی صاحب خانہ صدر دستر خوان ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روایتی گھروں میں خاندان کا سب سے بڑا شخص کھانے کے دوران میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ کھانے کے دوران میں شور شرابا شروع ہو جاتا ہے۔ گھر کا سربراہ یعنی صدر دستر خوان سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ کھانے کا عمل آگے بڑھتا ہے تو دستر خوان پر موجود بچے مختلف وجوہات کی بنیاد پر سزا پاتے ہیں۔ ایک بچہ زیادہ کھانے پر سزا پاتا ہے کیوں کہ والدین کو لگتا ہے کہ وہ حد سے زیادہ کھا رہا ہے۔ دوسرا بچہ کم کھانے پر سزا پاتا ہے کیوں کہ والدین کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ کم کھانے کی وجہ سے بچہ کمزور نہ ہو جائے۔ تیسرا بدتمیزی سے کھانے پر سزا پاتا ہے کیوں کہ وہ کھانے کے آداب کا خیال نہیں رکھتا۔ یہ ساری صورتِ حال گھر میں چلنے والے تضادات کو ظاہر کرتی ہے۔ والدین کے فیصلے اکثر غیر منطقی اور جذباتی ہوتے ہیں۔ بچوں کے کم یا زیادہ کھانے پر انھیں تشویش رہتی ہے اور وہ بچوں کو زیادہ یا کم کھانے پر مجبور کرتے ہیں۔

یہ صورتِ حال معاشرے میں عام ہے۔ بچوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر سزا دی جاتی ہے۔ اکثر اوقات انھیں ایسے معاملات میں بھی ڈانٹ سنی پڑتی ہے جن میں ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے بچوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک دیہاتی شخص نے دیکھا کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ بچوں سے محبت سے پیش آتے ہیں تو اس نے کہا:

''میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا۔''

آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

''جو رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

کھانے کے دوران بھی نبی کریم خاتم النبیین ﷺ بچوں کو بہت شفقت سے کھانے کے آداب سکھاتے تھے۔ حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں بچپن میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا۔ میرا ہاتھ پلیٹ میں ہر جگہ جا رہا تھا تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

''اے بچے! اللہ کا نام لو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔'' (صحیح بخاری)

کھانے کے دوران میں بیوی کھانے سے مکھیاں اڑاتی اور شوہر کی بدزبانی سنتی جاتی ہے۔ یہاں بیوی کو ایک شفیق مگر مظلوم ہستی کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ وہ کھانے کے دوران میں مکھیاں اڑانے میں مصروف رہتی ہے تاکہ دوسرے افراد سکون سے کھانا کھالیں۔ وہ ہمیشہ اپنے گھر کے ماحول کو بہتر بنانے میں لگی رہتی ہے۔ بیوی کی فرماں برداری کے باوجود شوہر اپنی فطرت کے مطابق بیوی پر بدزبانی اور سختی کرتا ہے۔ بیوی اسے صبر و تحمل سے برداشت کرتی ہے۔ قرآنِ مجید بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (سورۃ النسا:19)

ترجمہ: **اور عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو۔**

کھانا کھانے کے بعد شوہروں کی بھی اپنے پیشوں اور مزاجوں کے مطابق مصروفیات ہوتی ہے۔ اگر شوہر شاعر مزاج ہے تو ہاتھ دھو کر فکرِ سخن میں ڈوب جائے گا۔ اسے دنیا کے کسی کام سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کچھ مرد محض خیالی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور وہ عملی زندگی کی مشکلات سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اگر شوہر کوئی ملازم ہے تو وہ ایسے بدحواسی سے دفتر کی طرف دوڑتا ہے جیسے گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ملازمت پیشہ افراد دفتروں کی سختیوں کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ انھیں وقت پر دفتر پہنچنے یا اپنے کام پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ اگر شوہر کوئی مذہبی آدمی ہے تو وہ اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگتا ہے۔ دوپہر کو کھانا کھا کر تھوڑی دیر سونا یا آرام کرنا قیلولہ کہلاتا ہے۔ قیلولہ کرنا سنت ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

''قیلولہ کیا کرو، کیوں کہ شیطان قیلولہ نہیں کرتا۔''

یہاں طنز یہ ہے کہ شوہر کوئی شاعر ہو، ملازم ہو یا کوئی مذہبی آدمی، سب بیوی بچوں کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس کے باوجود بیوی بچے انھیں آرام اور سہولت دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ مذہبی شوہر قیلولہ کرنے کے لیے لیٹتا ہے تو بیوی بچے اس کا بدن دباتے ہیں۔ ذرا غلطی ہو جائے تو اس کی بددعائیں بھی سنتے ہیں لیکن یہ معمول اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

یہ اقتباس ازدواجی زندگی میں مشرقی مرد کے عمومی رویے پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرتی رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ جس میں عورت کو ہر حال میں صبر، خدمت اور قربانی کا درس دیا جاتا ہے۔ عورت ہر حال میں مرد کے آرام و سکون کا خیال رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مرد کسی نہ کسی بہانے اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اقتباس میں گہرا طنز اور شگفتگی نمایاں ہے۔

عبارت نمبر ۹

چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مانند ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمران کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ، کوچ اور صوفے کے دلدادہ اور ڈرائنگ روم کے اسیر اس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چارپائی پر میسر آتی ہے! شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کرلی ہیں، مثلاً: سچے دوست، شرافت، فراغت اور گوشۂ چمن۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چارپائی ان تمام لوازم کو پورا کرسکتی ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم چارپائی کو ہر نا موزوں کام کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ چارپائی ایک اچھے بکس کا کام دیتی ہے۔ یعنی جو چیز چاہیں آپ اس میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک مہمان نوازی کے لیے بھی سب سے مناسب چارپائی ہے۔ ہندوستانی چارپائی کو زنبیل سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی شے گم ہو جائے اس کی تلاش چارپائی سے ہی شروع کی جاتی ہے۔

مصنف کے نزدیک شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے جو باتیں منتخب کی ہیں، صرف چارپائی ہی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

رشید احمد صدیقی کا مضمون ''چارپائی'' ہندوستانی طرزِ زندگی کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے وہ ایک گہرے سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک چارپائی محض ایک فرنیچر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ہندوستانی معاشرت اور لوگوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چارپائی کی خصوصیات ہندوستانی معاشرے کے مزاج سے مکمل ہم آہنگ ہیں۔ سخت گرمی اور حبس میں، کھلی فضا میں بچھی چارپائی ٹھنڈک فراہم کرتی ہے۔ سردیوں میں لحاف اور رضائی کے ساتھ سکون مہیا کرتی ہے۔ جب ضرورت ہو یہ کھانے کی میز بن جاتی ہے۔ یہ میز، صندوق، بستر، دواخانہ اور مجلس کی نشست بھی بن جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کی روزمرہ زندگی میں چارپائی ایک ناگزیر عنصر ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا اور معاشرت کی ضرورت کے مطابق ایک شان دار ایجاد ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی طرح ڈھیلی ڈھالی اور شکستہ حال ہوتی ہے۔ چارپائی شکستہ حال ہے، جیسے ہندوستان کے گلی کوچے، اس کے پرانے محلے، اس کی عمارتیں جو کبھی شان و شوکت کی علامت تھیں مگر اب شکستہ حالی کا شکار ہیں۔ بے ترتیبی اور خستہ حالی کے باوجود چارپائی ہر ضرورت پوری کرتی ہے۔ یہ سونے کے لیے بھی ہے، بیٹھنے کے لیے بھی۔ بیمار کے لیے شفا خانہ بھی ہے اور پرانی ہو جائے تو پیاز

ذخیرہ کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ ہندوستان کے لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں بے شمار مشکلات کے باوجود حالات کو برداشت کرتے اور زندگی گزارتے ہیں۔ اسی طرح چارپائی ہر نقص، ہر خرابی اور بے سروسامانی کے باوجود لوگوں کے کام آتی ہے۔ زیادہ تر گھروں میں چارپائیاں سالہا سال چلتی ہیں۔ ان کی حالت خراب ہوتی ہے تو کبھی اس کی رسیاں بدل لی جاتی ہیں۔ وہ ہلنے لگے تو اس کے پایوں میں کیلیں ٹھونک دی جاتی ہیں۔ اس کی بوسیدگی کو چھپانے کے لیے اس پر دری یا چادر بچھا دی جاتی ہے۔ ہندوستانی بھی اپنی روایات کو وقت کے ساتھ ساتھ نیا رنگ دے کر ان میں جدت پیدا کر لیتے ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ چارپائی شکستہ حال اور بے سروسامان ہے لیکن ہندوستانیوں کی طرح طاقت وروں اور حکمرانوں کو راحت فراہم کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ یہ جملہ ہندوستانیوں کے رویے پر ایک لطیف طنز ہے۔ ہندوستان کے لوگ غربت، کسمپرسی اور بے سروسامانی میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ دن رات محنت مشقت کر کے بھی اپنی بنیادی ضروریات پوری نہیں کر پاتے۔ طاقت ور اور حکمران طبقہ ان کے حقوق غصب کر لیتا ہے۔ لیکن یہ غریب وشکستہ حال لوگ انھی طاقت وروں کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ محنت مشقت کر کے حکمرانوں کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اپنی بے ترتیبی، سادگی اور شکستہ حالی کے باوجود چارپائی کسی نہ کسی طرح حکمرانوں کی خدمت کے لیے بھی حاضر رہتی ہے۔ چاہے گاؤں کے زمیندار ہوں یا شہروں کے نواب، افسران ہوں یا اعلیٰ عہدے دار، چارپائی کا وجود ہر گھر میں ہے۔ حکم چلانے والے، فیصلے کرنے والے، معاملات کی نگرانی کرنے والے سب چارپائی پر بیٹھ کر ہی یہ کام انجام دیتے ہیں۔ چارپائی پر آرام کیا جاتا ہے، سوچ بچار کی جاتی ہے اور احکام بھی جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں نظام چاہے کتنا ہی بوسیدہ ہو، طاقت ور اپنے لیے جگہ نکال ہی لیتے ہیں۔ چارپائی کی طرح کام آنے والے لوگ بھی انھیں ہر جگہ خدمت کے لیے مل جاتے ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ صوفے کے دل دادہ چارپائی کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ جدید طرزِ زندگی کے عادی افراد چارپائی کی سادگی اور اس کی بے مثال راحت کو محسوس نہیں کر سکتے۔ جو لوگ کوچ اور صوفے کے عادی ہیں وہ صرف ڈرائنگ روم کی خوب صورتی اور نشست کی بناوٹ کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ چارپائی کی حقیقی عافیت اور سکون کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ چارپائی ایک ایسی سہولت ہے جو ہر حال میں انسان کو مکمل آرام فراہم کرتی ہے۔ اس پر بیٹھنے اور لیٹنے کا کوئی خاص طریقہ اور رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا۔ آپ اس پر چاہیں تو آدھا لیٹ جائیں، چاہیں تو ٹانگیں پھیلا کر بیٹھیں، چاہیں تو سرہانے تکیہ رکھ کر نیم دراز ہو جائیں۔ یہ آزادی کسی کوچ یا صوفے پر میسر نہیں ہوتی۔ صوفے یا کوچ میں بدن ایک خاص زاویے میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہاں ایک مخصوص انداز میں بیٹھنا پڑتا ہے اس لیے جسم کو مکمل آرام نہیں ملتا۔

مصنف مزید کہتے ہیں کہ عام طور پر لوگ سکون، خوش حالی اور عیش وعشرت کے لیے بڑی بڑی چیزوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ خوش حال زندگی کے لیے مال و دولت اور وسیع وعریض محل کے مالک ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ شعرا بھی خوشی اور آسودگی کے لیے چند بنیادی عناصر کو ضروری سمجھتے ہیں جیسے: سچے دوست، شرافت، فراغت اور گوشہ نشینی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو حقیقی راحت اور سکون فراہم کرتی ہیں۔ مصنف کے نزدیک ہندوستان جیسے غریب ملک میں یہ لوازمات محض ایک خواب ہیں کیوں کہ یہاں کے لوگوں کی زندگی سادگی اور ضروریات تک محدود ہے۔ اس لیے وہ مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ حقیقی سکون اور عیش کے لیے اگر کوئی ایک چیز کافی ہو سکتی ہے تو وہ صرف چارپائی ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں عام آدمی کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہے وہاں خوش حالی اور عیش وعشرت کی تعریف بھی سادہ ہونی چاہیے۔ چارپائی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو وہ سکون دے سکتی ہے جس کی تلاش میں لوگ بڑے بڑے اخراجات کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"اور ہم نے تمھاری نیند کو سکون بنایا اور رات کو پردہ (آرام کا وقت) بنایا۔" (سورۃ النبا:9,10)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ نیند اور آرام اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ اگر ایک سادہ چارپائی پر آدمی کو نیند اور آرام مل جائے تو وہ چارپائی بھی کسی نعمت سے کم نہیں۔

رشید احمد صدیقی مزاحیہ انداز میں بات کہہ رہے ہیں کہ عیش وآرام کے لیے محل یا قیمتی اشیا کا ہونا ضروری نہیں۔ ایک سادہ چارپائی ہی انسان کی زندگی میں خوشی اور راحت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے ہندوستانی معاشرت میں چارپائی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

عبارت نمبر 10

بانوں کی ٹوٹی ہوئی چارپائی جسے مکّا (مکئی) کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ہے۔ ہر طرف جھومتے لہلہاتے کھیت ہیں۔ بارش نے گرد وپیش کو شگفتہ وشاداب کر دیا ہے۔ دور دور جھیلیں جھمکتی، جھلکتی نظر آتی ہیں جن میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی اپنی بولیوں سے برسات کی علمداری اور مزیداری کا اعلان کرتے ہیں۔ مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے اس کے یہاں نہ آسائش ہے، نہ آرائش، نہ عشق وعاشقی، نہ علم وفضل، نہ دولت واقتدار۔ لیکن یہ سب چارپائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کی محنت کا کرشمہ ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب اس کی پیداوار کو چور، مہاجن یا زمیندار لوٹ لیں گے اور اسی چارپائی پر اس کو سانپ ڈس لے گا اور قصہ پاک ہو جائے گا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم چارپائی کو ہر ناموزوں کام کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ چارپائی ایک اچھے بکس کا کام دیتی ہے۔ یعنی جو چیز چاہیں آپ اس میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک مہمان کی مہمان نوازی کے لیے بھی سب سے مناسب چارپائی ہے۔ ہندوستانی چارپائی کو زنبیل سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی شے گم ہو جائے اس کی تلاش چارپائی سے ہی شروع کی جاتی ہے۔

مصنف کے نزدیک شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے جو باتیں منتخب کی ہیں صرف چارپائی ہی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتا رہے ہیں کہ چارپائی ہر حال میں، ہر جگہ ساتھ دیتی ہے۔ جب فصل پکتی ہے تو کسانوں کو اپنے کھیتوں کی رکھوالی کرنی پڑتی ہے۔ کھیتوں کی رکھوالی کے لیے وہ ایک بلند پلیٹ فارم بناتے ہیں جس پر بیٹھ کر وہ فصلوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس پلیٹ فارم کو "مچان" کہا جاتا ہے۔ مچان ایک اونچی جگہ یا چوکی ہوتی ہے جو عموماً بانس، لکڑی یا چارپائی کے ذریعے کھیتوں میں بنائی جاتی ہے۔ مچان پر بیٹھ کر کسان دور تک دیکھ سکتا ہے اور فصلوں کو جانوروں، پرندوں اور چوروں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ مچان بنانے کے لیے کسان عام طور پر ٹوٹی ہوئی چارپائی استعمال کرتے ہیں۔ چارپائی کو دیہی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ نئی چارپائی گھر میں آرام وسکون کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جب یہ پرانی ہو جاتی ہے اور اس کا بان ٹوٹ جاتا ہے، اس کی لکڑی اور پائے بھی خراب ہو جاتے ہیں تو یہ شکستہ چارپائی کھیت میں مچان کے طور پر کام میں لائی جاتی ہے۔

مصنف دیہات کی زندگی کا ایک خوب صورت منظر دکھا رہے ہیں جہاں مچان پر بیٹھا کسان اپنی فصلوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی ہے اور کھیت لہلہا رہے ہیں۔ بارش نے فصلوں کو شادابی بخش دی ہے اور فضا میں ہر طرف تازگی ہو گئی ہے۔ جھیلوں کے صاف پانی میں بادلوں کا عکس لرز رہا ہے۔ جھیل میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی مخصوص آوازوں کے ذریعے خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ درختوں پر بیٹھے پرندے خوشی سے چہچہا رہے ہیں۔ بارش نے ہر طرف جل تھل کر دیا ہے۔ بقول شاعر:

دور تک پھیلا ہوا پانی ہی پانی ہر طرف　　اب کے بادل نے بہت کی مہربانی ہر طرف

(شباب للت)

ہوا میں ایک خنکی اور سکون ہے جو دیہات کی سادہ زندگی کو مزید دل کش بنا رہا ہے۔ قدرت کی رعنائی سے سارا منظر ایک حسین خواب کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ زمین کی رنگینی اور آسمان کی نرمی نے منظر کو جنت نظیر بنا دیا ہے۔

؎ فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
(ساحرلدھیانوی)

اس خوب صورت قدرتی منظر میں ایک تھکا ہارا کسان بھی شامل ہے۔ وہ اپنی مچان پر بیٹھا کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے۔ اس دل فریب اور خوش گوار موسم میں بھی اسے اپنی فصلوں کی فکر ہے۔ اس کے پاس آرام کے وسائل ہیں نہ دولت۔ وہ ایک بان کی بنی سادہ چارپائی پر بیٹھا اپنی فصل کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے دن رات محنت سے زمین کو سینچا اور اپنے خون پسینے سے فصل کو پروان چڑھایا ہے۔ اب اسے اپنی محنت کا ثمر ملنے والا ہے۔ لیکن اس کے دل میں یہ خدشہ ہے کہ کوئی اس کی پیداوار کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس کی پیداوار کو کوئی چور نہ لے اڑے۔ اس کی فصل کو بارش سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اس کسان کے پاس نہ کوئی آسائش ہے نہ آرائش، نہ اس کے پاس علم و فضل ہے نہ مال و دولت، نہ ہی کوئی حکومت و اقتدار اس کے پاس ہے۔ اس کے پاس صرف اس کی محنت کا کرشمہ ہے۔ ہندوستان کی زراعت اسی کسان کی محنت پر ٹکی ہوئی ہے۔ وہ خود فاقہ کشی میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن دوسروں کے لیے خوش حالی کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ اپنی محنت سے زمین سے سونا اگاتا ہے لیکن خود دو وقت کی روٹی کے لیے ترستا ہے۔ بڑے زمیندار اور جاگیردار اس کی محنت پر عیش کرتے ہیں جب کہ وہ خود بے بسی کی زندگی گزارتا ہے۔ زمینداروں اور مہاجنوں کی تجوریاں بھرنے والا خود قرضوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ گندم کی بالیوں سے بہت روشنی ہوئی اس روشنی سے قرض نہ اترا کسان کا (احمد فاخر)

کسان برسات میں بھیگتا ہے، دھوپ میں جلتا ہے، سردی میں ٹھٹھرتا ہے لیکن پھر بھی ہل چلاتا ہے، زمین کو جوتتا ہے اور فصلوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر وہ صرف زمین کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا ہے۔ لیکن اس کی خوشی لحاتی ثابت ہوتی ہے۔ اس کی امیدیں بکھر جاتی ہیں کیوں کہ فصل کا زیادہ حصہ ساہوکار، زمیندار اور جاگیردار لے جاتا ہے۔ کچھ حصہ حکومت کے ٹیکسوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی محنت کا ثمر دوسروں کے ہاتھوں میں جاتا دیکھتا رہتا ہے۔ وہ بے بسی سے سوچتا ہے کہ اس کا حصہ کہاں گیا؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب اسے کبھی نہیں ملتا۔

اسلام میں محنت کرنے والے کو بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور محنت کرنے والے کو اللہ کا دوست قرار دیا جاتا ہے:

"بے شک اللہ محنتی (محنت و ہنر سے روزی کمانے والے) بندے سے محبت کرتا ہے۔"

اور بقول شاعر:

؎ حلال رزق کا مطلب کسان سے پوچھو پسینہ بن کے بدن سے لہو نکلتا ہے (عادل رشید)

آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے محنت مزدوری کرنے والے کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کا حکم فرمایا ہے۔ لیکن ہندوستان میں محنت کرنے والے کو دبایا جاتا ہے۔ اس کا حق چھینا جاتا ہے۔ کسان جس کی محنت سے خوش حالی آتی ہے، خود بے بسی کی تصویر بن جاتا ہے۔ زندگی بھر مشقت کرنے والے اس کسان کا انجام بھی دردناک ہوتا ہے۔ جس چارپائی پر بیٹھ کر وہ اپنی فصلوں کی رکھوالی کرتا ہے، ایک دن اسی پر لیٹ کر زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ وہ قرض کے بوجھ تلے دب کر خودکشی کر لیتا ہے۔ کبھی وہ بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر جان دے دیتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ رات کے وقت اکیلا کھیت میں بیٹھا فصلوں کی نگرانی کر رہا ہوتا ہے کہ کوئی زہریلا سانپ اسے ڈس لیتا ہے۔ وہ اپنوں سے دور، بے یار و مددگار اسی چارپائی پر جان دے دیتا ہے۔ اس کی محنت بھری مفید زندگی کا اچانک خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ فصلوں کا خواب بھوک کی آنکھوں میں رہ گیا گاؤں کے کھیت کھا گئے لیکن کسان تک (توقیر ساگر)

کسان کی زندگی ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر رہی ہے۔ حکومتیں بدلتی ہیں، پالیسیاں بنتی ہیں مگر کسان کی تقدیر نہیں بدلتی۔ ٹوٹی چارپائی کی مچان پر بیٹھا وہ فصلوں کی نہیں بلکہ ایک ایسے خواب کی رکھوالی کرتا ہے، جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔

؎ ملا نہ کھیت سے اس کو بھی آب و دانہ کیا کسان شہر کو پھر اک ہوا روانہ ہوا کیا

عبارت نمبر (11)

برسات ہی کا موسم ہے۔ گاؤں میں آموں کا باغ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، کوئل کوکتی ہے، ہوا لہکتی ہے۔ گاؤں میں لڑکے لڑکیاں دھوم مچا رہے ہیں۔ کہیں کوئی پکا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔ سب کے سب جھپٹتے ہیں۔ جس کو مل گیا وہ ہیرو بن گیا۔ جس کو نہ ملا اس پر سب نے ٹھٹھے لگائے۔ یہی لڑکے لڑکیاں جو اس وقت کسی طرح قابلِ التفات نظر نہیں آتیں، کسے معلوم آگے چل کر زمانہ اور زندگی کی کن نیرنگیوں کو اُجاگر کریں گے۔ کتنے فاقے کریں گے، کتنے فاتح بنیں گے، کتنے نامور اور نیک نام، کتنے گمنام و نافرجام اور یہ خاکسار ایک کھری چارپائی پر اس باغ میں آرام فرما رہا ہے۔ چارپائی باغبان کی ہے۔ باغ کسی اور کا ہے۔ لڑکے لڑکیاں گاؤں کی ہیں۔ میرا حصہ کا صرف آم ہے۔ ایسے میں جو کچھ دماغ میں نہ آئے تھوڑا ہے۔ یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو کیا تعجب!

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم چارپائی کو ہر ناموزوں کام کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ چارپائی ایک اچھے بکس کا کام دیتی ہے۔ یعنی جو چیز چاہیں آپ اس میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک مہمان کی مہمان نوازی کے لیے بھی سب سے مناسب چارپائی ہے۔ ہندوستانی چارپائی کو زنبیل سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی شے گم ہو جائے اس کی تلاش چارپائی سے ہی شروع کی جاتی ہے۔

مصنف کے نزدیک شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے جو باتیں منتخب کی ہیں صرف چارپائی ہی ان لوازم پر پورا اترتی ہے۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں رشید احمد صدیقی دیہاتی زندگی، فطرت کی خوب صورتی اور انسان کی قسمت کو دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ گاؤں کی ایک دل کش تصویر کھینچتے ہیں اور لڑکے، لڑکیوں کی بے فکر مسرت کا حال بتا رہے ہیں۔

مصنف بتاتے ہیں کہ برسات کا موسم اپنے جوبن پر ہے۔ آموں کے باغ میں زندگی کی ہلچل ہے۔ بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر تیر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ بادلوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے، کبھی سورج کی کرنیں راستہ بنا لیتی ہیں۔ کوئل کی کوک فضا میں رس گھول رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں دلوں کو مسرور کر رہی ہیں۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں اس حسین قدرتی ماحول میں مست و مگن ہیں۔ سب ہنستے کھیلتے اور اچھلتے کودتے ہیں۔ ان کی دنیا ابھی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ خوشی سے دھوم مچا رہے ہیں۔ اچانک کوئی پکا ہوا آم درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے، سب اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ جسے آم مل گیا، وہ سب کی نظر میں جیت گیا اور ہیرو بن گیا۔ جو اس آم سے محروم رہ گیا، اس کا مذاق اڑایا گیا۔ یہی منظر پوری زندگی کا خلاصہ ہے۔ دنیا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کامیابی کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ سب ان پر رشک کرتے ہیں۔ کچھ محروم رہ جاتے ہیں اور حسرت کے ساتھ دوسروں کو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ بے بسی میں ہار مان لیتے ہیں۔

یہ لڑکے لڑکیاں جو آج کھیل میں مگن ہیں، کل بڑے ہو کر زندگی کے مختلف میدانوں میں اتریں گے۔ کوئی کامیاب ہوگا، کوئی ناکام، کوئی عزت پائے گا، کوئی گمنامی میں کھو جائے گا۔ انھی میں سے کچھ دولت، شہرت اور عزت حاصل کریں گے تو کچھ فاقہ کشی اور محرومیوں کا شکار ہوں گے۔ زندگی میں کوئی بادشاہ بنے گا تو کوئی فقیر۔ دن بدلتے رہیں گے اور لوگوں کے حالات بھی تبدیل ہوتے رہیں گے۔ یہی دنیا کا اصول ہے اور اسی کے تابع زندگی گزرتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے:

"اور ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں" (آلِ عمران)

یہی تغیر بھی دنیا کی پہچان ہے۔ یہاں سب کچھ عارضی ہے۔ سب کچھ بدلنے والا ہے۔ جو آج خوش حال ہے، وہ کل بدحال ہو سکتا ہے۔ جو آج محروم ہے، وہ کل بادشاہ بن سکتا ہے۔

دنیا کے ایوانوں میں کیا رہ گیا آخر　　کچھ نقشِ کہن رہ گئے، کچھ خواب نئے ہیں

موسم اور باغ کا منظر خوب صورت ہے۔ مصنف خود اس منظر کا ایک حصہ ہے مگر وہ محض ایک تماشائی ہے۔ وہ اس تماشے کو دیکھ رہا ہے اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا ہے۔ آنے والا وہ وقت جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ ایک کھری چارپائی پر لیٹا ہے۔ چارپائی باغبان کی ہے، باغ کسی اور کا ہے، لڑکے لڑکیاں گاؤں کے ہیں اور اس کے حصے میں صرف ایک آم آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سب کچھ ہے مگر ہر چیز ہر کسی کے لیے نہیں۔ کسی کو سب کچھ ملتا ہے۔ کسی کو کچھ نہیں ملتا اور وہ اس پر صبر اور قناعت کرتا ہے۔ کسی کو سب کچھ مل جاتا ہے اور وہ مزید کی جستجو میں رہتا ہے۔ یہی دنیا کی حقیقت ہے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا　　کہیں زمین، کہیں آسماں نہیں ملتا

مصنف چارپائی پر لیٹا اس خوب صورت منظر سے محظوظ ہو رہا ہے۔ وہ کہتا ہے ''ایسے میں جو کچھ دماغ میں نہ آئے، تھوڑا ہے یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو تعجب کیسا!''

اس جملے میں مصنف انسانی ذہن کی ایک خاص کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسی حالت میں ہے جہاں ذہن مکمل طور پر سکون میں ہے۔ خیالات کی روانی رک سی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کچھ نیا سوچنے کو نہ آئے تو حیرت کی بات نہیں۔ جو تھوڑے بہت خیالات پہلے سے موجود ہیں، وہ بھی اس پُرسکون فضا میں تحلیل ہو جائیں تو تعجب نہیں۔ یہ دراصل ایک ذہنی فراغت اور بے فکری کی تصویر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سوچنے سمجھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ انسان فطرت اور ماحول میں کھو کر سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ نہ ماضی کا کوئی دکھ ہے نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔

فردا کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر　　دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم، یہ خوش بو کا سفر

اقتباس کے آخری حصے میں مصنف کی چارپائی پر لیٹنے کی یہ حالت محض ایک عام سا منظر نہیں بلکہ زندگی کی ایک بڑی حقیقت کا استعارہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جہاں سب کچھ کسی اور کا ہے۔ ہم بس لمحہ بھر کے مہمان ہیں۔ دنیا کی یہ ہنگامہ خیزی، لوگوں کا آنا جانا، زندگی کی دوڑ دھوپ، سب چلتی رہتی ہے۔ آخر میں صرف ایک سوال باقی رہتا ہے: کیا ہم نے وہ پایا جس کے لیے ہم دوڑ رہے تھے؟ ہر کسی کو یہ سوال کبھی نہ کبھی ضرور گھیر لیتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں بہت کچھ دماغ میں آتا ہے اور بہت کچھ نکل بھی جاتا ہے۔

ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں　　نرم فضا کی کروٹیں دل کو دُکھا کے رہ گئیں

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں دنیا کے فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ ہمیں صبر اور استقامت سے زندگی گزارنی چاہیے۔ محنت کرنی چاہیے اور خود کو اپنی محنت کے ثمرات کا ہی حق دار سمجھنا چاہیے۔ مال و دولت کی ہوس سے دل کو پاک رکھنا چاہیے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا ہونا چاہیے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

''اصل دولت مال نہیں، بلکہ دل کا غنی ہونا ہے۔''

عبارت نمبر 12

پھر عالمِ تصور میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا ہوں جو صرف میرے لیے ہے جو میرے ہی اشارے پر بنتی بگڑتی ہے، مجھے خالق کا درجہ حاصل ہے، اپنے مخلوق ہونے کا وہم بھی نہیں گزرتا، نہ اس کا خیال کہ زمانہ کسے کہتے ہیں، نہ اس کی پروا کہ زندگی کیا ہے۔ دوسروں کو ان کا اسیر دیکھ کر چونک پڑتا ہوں۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ میں ان لوگوں سے اور خود زمانہ اور زندگی سے علیحدہ بھی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے اونگھنے لگتا ہوں۔ ممکن ہے اونگھنے میں پہلے سے بتلا ہوں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب اور چارپائی ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم چارپائی کو ہر نا موزوں کام کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ چارپائی ایک اچھے بکس کا کام دیتی ہے۔

یعنی جو چیز چاہیں آپ اس پر رکھ سکتے ہیں۔ چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا بھرپور نمونہ ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی طرح ڈھیلی، ڈھالی، شکستہ حال، بے سروساماں ہے۔ لیکن ہر نا موزوں کام کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ ہر کام اس سے نکلوا لیا جاتا ہے۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے جو باتیں بتائی ہیں۔ چارپائی ان تمام لوازم پر پورا اُترتی ہے۔

تشریح طلب سبق کی آخری عبارت ہے لہٰذا اس کا سباق نہیں۔

تشریح

رشید احمد صدیقی اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور شگفتگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، محاورات کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کے آخر سے لی گئی ہے۔ اس میں مصنف انسانی خیالات اور حقیقت کے درمیان کشمکش کو بڑے دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عالمِ تصور میں ایک ایسی کائنات تعمیر کرتے ہیں جہاں زمانے اور زندگی کے مسائل کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ ایک ایسی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں جہاں وہ اپنے تخیل کی دنیا میں کھو جاتے ہیں، جہاں وہ خود کو سب سے زیادہ بااختیار محسوس کرتے ہیں۔ عالمِ تصور میں وہ ایسی کائنات تعمیر کرتے ہیں جہاں وہ خود مختار ہوتے ہیں، جہاں ہر چیز ان کے قابو میں ہوتی ہے۔ وہ جو چاہیں بنا سکتے ہیں اور جو چاہیں مٹا سکتے ہیں۔ ان کی یہ خیالی دنیا کسی قانون یا ضابطے کی پابند نہیں ہوتی۔ وہاں وقت اور زمانے کی قید نہیں ہوتی۔ وہ اپنے خیالات کی کائنات میں خود کو خالق سمجھنے لگتے ہیں۔ انھیں اپنے مخلوق ہونے کا وہم بھی نہیں گزرتا۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی خیالی جنت میں مست و مگن ہو جاتے ہیں۔

یہ کیفیت انسان پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب وہ حقیقت کی سختیوں سے بچ کر خیالات کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل سے کچھ دیر کے لیے الگ ہو کر ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ یہاں نہ کوئی زنجیر ہے نہ قید، نہ وقت کا دباؤ ہے نہ دوسروں کی رائے کی پروا۔ وہ اپنے خیالات میں محو ہو کر خود کو ہر شے سے بلند تر محسوس کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مخلوق ہونے کا بھی احساس کھو دیتا ہے۔

مصنف اپنی خیالی دنیا کا بادشاہ ہے۔ وہ ہر چیز سے ماورا ہو گیا ہے۔ لیکن جب وہ حقیقی دنیا میں واپس آتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ دنیا کے مسائل کے اسیر ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا کے لوگ زندگی کی الجھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ وقت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مختلف رشتوں اور تعلقات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دوسروں کی زندگی کو اصولوں میں بندھا دیکھ کر وہ حیران ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے الگ ہے، اسے ایک عجیب سا سکون بھی محسوس ہوتا ہے، کچھ دیر کے لیے وہ اونگھنے لگتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ شاید وہ پہلے سے ایک خواب میں جی رہا ہے۔ وہ خود کو ایک ایسی نیند میں محسوس کرتا ہے، جس سے جاگنے کی ضرورت نہیں۔

عبارت کے آخر میں مصنف ایک گہری فلسفیانہ کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ باقی دنیا، زمانے اور زندگی کی دوڑ دھوپ سے علیحدہ ہیں۔ یہ علیحدگی محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور فکری ہے۔ وہ اپنے اردگرد لوگوں کو دنیوی جھمیلوں میں الجھا ہوا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے چونک پڑتے ہیں۔ مگر پھر جلد ہی اس بے نیازی کی کیفیت میں لوٹ آتے ہیں جہاں انھیں نہ دنیا کی پروا ہوتی ہے نہ زندگی کی حقیقتوں کا ادراک۔ یہ کیفیت رفتہ رفتہ ایک گہری اونگھ یا بے خبری میں بدل جاتی ہے، جس میں وہ شاید پہلے ہی سے مبتلا ہیں، مگر اب انھیں اس کا شعور ہو رہا ہے۔

یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون ''چارپائی'' کی آخری عبارت ہے۔ چارپائی محض ایک عام گھریلو چیز نہیں بلکہ اس کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی طرزِ زندگی کو سادگی اور خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے۔ چارپائی یہاں ایک علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ نہ صرف آرام و سکون کی جگہ ہے بلکہ زندگی کے نشیب و فراز، انسانی تعلقات، سماجی رویوں اور وقت کے تغیرات کی بھی گواہ ہے۔ مصنف نے چارپائی کے ذریعے دیہات کی سادہ مگر پُرمعنی زندگی، کسانوں کی محنت، موسموں کے اثرات اور انسانی نفسیات کی

مختلف کیفیتوں کو نہایت دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مضمون کے آخری حصے میں وہ ایک ایسی کیفیت میں پہنچ جاتے ہیں جہاں خیالات تحلیل ہونے لگتے ہیں۔ زمانہ اور دنیوی مشغولیات بے معنی محسوس ہوتی ہیں۔ اور آخر کار انسان ایک ایسی نیند میں چلا جاتا ہے جہاں خواب اور حقیقت کی سرحدیں مدغم ہو جاتی ہیں۔ یوں چار پائی نہ صرف آرام کی جگہ بنتی ہے بلکہ ایک فکری و فلسفیانہ علامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ جہاں انسان دنیا اور زندگی کے پیچیدہ سوالات میں کھو کر خود کو ایک نئی تنہائی میں پاتا ہے۔

مشقی سوالات

سوال نمبر ۱۔ مختصر جواب دیں۔

۱۔ سبق میں ریاست کے ملازم اور چار پائی میں کون کون سی مشابہت بتائی گئی ہے؟

جواب۔ سبق میں ریاست کے ملازم اور چار پائی میں بہت سی مشابہتیں بتائی گئی ہیں۔ وہ دونوں کسی بھی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ البتہ چار پائی ریاست کے ملازم سے زیادہ کار آمد ہوتی ہیں۔

۲۔ متن کے مطابق چار پائی کے نیچے کیا کچھ جمع ہوتا ہے؟

جواب۔ چار پائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے، جھاڑو، آش جو، روئی کے پھاہے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھر، جھینگے، محلے کے دو ایک بچے جمع ہوتے ہیں۔

۳۔ ''ورنہ آپ کے دشمن اسی چار پائی پر لب گور لائے گئے''۔ اس جملے کی وضاحت کریں؟

جواب۔ ''ورنہ آپ کے دشمن اسی چار پائی پر لب گور لائے گئے'' اس جملے میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو تو اسے چار پائی پر دوا دی جاتی ہے۔ اگر وہ ٹھیک نہ ہوا اور فوت ہو جائے تو اسے ورثا قبر تک چھوڑ آتے ہیں۔

۴۔ مصنف کا ''پنشن یافتہ چار پائی'' سے کس طرح پالا پڑا؟

جواب۔ مصنف کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دیہات میں کسی سے ملنے گئے۔ رات کو میزبان نے ان کے سونے کا انتظام کیا اور ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چار پائی پر ذخیرہ شدہ پیاز اٹھا کر چار پائی کے نیچے رکھ دیے اور بستر بچھا دیا گیا۔ پرانی چار پائی، پیاز کی تیز بو اور کال کوٹھری کے ماحول سے میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

۵۔ چار پائی پر سے حکومت کیسے ہوتی ہے؟

جواب۔ چار پائی سے حکومت اس طرح ہوتی ہے کہ خاندان کے کرتا دھرتا چار پائی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے سارے احکامات جاری کیے جاتے ہیں اور گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا وہیں سے استعمال کیے جاتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۔ متن کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ چار پائی پر سوکھنے کے لیے..............پھیلایا جائے گا۔

ب۔ چار پائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال..............میں داخل کر دیتے ہیں۔

ج۔ چار پائی ایک اچھے..............کا بھی کام دیتی ہے۔

د۔ صاحب خانہ صدر..............ہیں۔ ہ۔ اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں..............کرنے لگے۔

جوابات

۱	اناج	۲	کوٹھڑی	۳	بکس	۴	دسترخواں	۵	قیلولہ

انشائیہ:

انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی مانند لگتی ہے مگر مضمون سے الگ انداز رکھتی ہے۔ انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنی تحریر پیش کرتا ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے۔ کسی خاص نتیجہ کے بغیر بات کو ختم کرتا ہے۔ انشائیہ میں دل چسپ بیان، غیر رسمی انداز، خوش گوار حیرت اور نظریے کے تیکھے پن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا زیر نظر سبق ''چار پائی'' ایک بہترین انشائیہ ہے۔

سوال نمبر ۳۔ انٹرنیٹ کے ذریعے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا تحریر کردہ کوئی انشائیہ تلاش کر کے اپنے دوستوں کو سنائیں۔

جواب۔ عملی کام

خاکہ: خاکہ کے لغوی معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچا کے ہیں۔ خاکے سے مراد کسی شخص کی لفظی تصویر کشی ہے۔ خاکے کو شخصی مرقع یا شخصیت نگاری بھی کہتے ہیں۔ خاکہ نگار کو خاکے کا موضوع بننے والی شخصیت کے مزاج سے مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔ بنیادی طور پر خاکہ اختصار، جامعیت اور دل آویز زبان و بیان کا حامل ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۴۔ اپنے پسندیدہ استاد محترم کا تعارفی خاکہ تحریر کریں اور اپنے دوستوں کو سنائیں۔

جواب۔ عملی کام

رسیدات: رسید کے معنی وصول کرنا، پہنچنا، رسائی وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں رسید وہ تحریر ہے جس میں کسی شے کے پہنچنے یا وصول ہونے کا مضمون ہو۔ قانونی لحاظ سے رقم یا سامان وصول کرنے کی باقاعدہ تحریر جس میں وصول کرنے والے اور گواہوں کے دستخط موجود ہوں۔

سوال نمبر ۵۔ فرض کریں کہ آپ نے کسی سے ساٹھ ہزار روپے قرض لیا ہے۔ اس حوالے سے ایک رسید لکھیں۔

جواب۔

باعثِ تحریر آنکہ

مبلغ ساٹھ ہزار روپے (۶۰۰۰۰) نصف جن کے مبلغ تیس ہزار روپے (۳۰۰۰۰) ہوتے ہیں، بابت قرضِ حسنہ تین ماہانہ اقساط میں قابلِ واپسی از اں مظہر حسین ولد صغیر احمد، ذات مغل، نقد وصول پا کر رسید لکھ دی ہے، تا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

گواہ شد	العبد	گواہ شد
محمد بلال ولد بشیر احمد	محمد امتیاز ولد امام بخش	ممتاز حسین ولد عبدالعزیز
ساکن---------	ساکن------	ساکن------
قومی شناختی کارڈ نمبر-----	قومی شناختی کارڈ نمبر---	قومی شناختی کارڈ نمبر----
دستخط-------	دستخط----------	دستخط------

تاریخ: ۱۵۔ مارچ--------۲۰،

سوال نمبر ۶۔ مرکب لفظ کا نصف اول کالم ''الف'' میں جب کہ اس کا نصف دوم کالم ''ب'' میں موجود ہے، انھیں جوڑیے اور کالم ''ج'' میں پورا مرکب لفظ لکھیے۔

جیسے: اوڑھنا بچھونا

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج) جوابات
اوڑھنا	کوشی	اوڑھنا بچھونا
غل	خوان	غل غپاڑا
نا	بچھونا	ناموزوں
سبک	غپاڑا	سبک دوش
دستر	موزوں	دسترخواں
عیش	دوش	عیش کوشی

سوال نمبر ۷۔ درج ذیل ضرب الامثال کا مفہوم واضح کریں۔

۱۔ آم کے آم گٹھلی کے دام ۲۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل

۳۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام ۴۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر

۵۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ۶۔ تلے تیس اوپر بیس

جوابات:

۱۔ آم کے آم گٹھلی کے دام — دوہرا فائدہ ہونا

۲۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل — جو چیز سامنے نہ ہو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے

۳۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام — بڑھاپے میں جوانوں جیسا بناؤ سنگار کرنا

۴۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر — اثر صحبت کا ہوتا ہے یا نسل کا

۵۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا — مشکوک شخص اپنی حرکتوں سے پہچانا جاتا ہے۔
۶۔ تلے تیس اوپر بیس — ایک سے بڑھ کر ایک، بظاہر بھولی بھالی لیکن اندر سے شریر

سوال نمبر:۸۔ سبق ''چارپائی'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔ جواب: دیکھیے سبق کا خلاصہ

سوال نمبر:۹۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں اور حوالہ متن بھی درج کریں۔

''چارپائی ہندوستان کی آب وہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان تمام لوازم کو پورا کرسکتی ہے۔'' جواب: دیکھیے نثر پاروں کی تشریحات

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ رشید احمد صدیقی پیدا ہوئے؟
(الف) 1890ء میں (ب) 1892ء میں (ج) 1894ء میں (د) 1896ء میں (ب)

2۔ رشید احمد صدیقی پیدا ہوئے:
(الف) جون پور میں (ب) خان پور میں (ج) کرنال میں (د) سیدم میں (الف)

3۔ رشید احمد صدیقی میٹرک تک رہے:
(الف) حیدرآباد میں (ب) جون پور میں (ج) اترپردیش میں (د) دہلی میں (ب)

4۔ رشید احمد صدیقی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی:
(الف) دہلی سے (ب) لکھنو سے (ج) کراچی سے (د) علی گڑھ سے (د)

5۔ رشید احمد صدیقی نے ایم۔اے کیا:
(الف) انگریزی میں (ب) فارسی میں (ج) عربی میں (د) ہندی میں (ب)

6۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے:
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) علامہ شبلی نعمانی (ج) مولانا الطاف حسین حالی (د) محسن الملک (الف)

7۔ رشید احمد صدیقی شعبہ درس وتدریس سے منسلک ہوئے:
(الف) 1920ء میں (ب) 1922ء میں (ج) 1924 (د) 1926ء میں (ب)

8۔ علی گڑھ کالج میں رشید احمد صدیقی پروفیسر ہوگئے:
(الف) 1919ء میں (ب) 1920ء میں (ج) 1921ء میں (د) 1922ء میں (د)

9۔ علی گڑھ کالج کو جب یونی ورسٹی کا درجہ ملا تو صدر شعبہ اُردو ادبیات بنا دیا گیا:
(الف) ڈاکٹر ممتاز منگلوری کو (ب) رشید احمد صدیقی کو (ج) ڈاکٹر بشیر بدر کو (د) ڈاکٹر احسن فاروقی کو (ب)

10۔ ''خنداں، گنج ہائے گرانمایہ، طنزیات ومضحکات، اُردو طنز ومزاح کی تنقیدی تاریخ'' تصانیف ہیں:
(الف) مشتاق احمد یوسفی (ب) پطرس بخاری (ج) رشید احمد صدیقی (د) اشفاق احمد (ج)

11۔ رشید احمد صدیقی کا انتقال ہوا:
(الف) 1977ء میں (ب) 1979ء میں (ج) 1981ء میں (د) 1983ء میں (الف)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ سبق ''چارپائی'' کی صنف ہے:
(الف) افسانہ (ب) انشائیہ (ج) ناول (د) ڈرامہ (ب)

2۔ سبق ''چارپائی'' ماخوذ ہے:
(الف) مضامینِ پطرس (ب) مضامینِ شبلی نعمانی (ج) مضامینِ حالی (د) مضامینِ رشید (د)

3۔ چارپائی اور مذہب ہندوستانیوں کا ہے:
(الف) اوڑھنا بچھونا (ب) اوڑھنا کاڑھنا (ج) اوڑھنا جھاڑنا (د) اوڑھنا سہارنا (الف)

4۔ ہم پیدا ہوتے ہیں:
(الف) چارپائی پر (ب) پلنگ پر (ج) بیڈ پر (د) مسہری پر (الف)

5۔ ہم یہیں سے مدرسہ، آفس، جیل خانے کو نسل یا آخرت کا لیتے ہیں:
(الف) سہارا (ب) آسرا (ج) راستہ (د) ثواب (ج)

6۔ چارپائی پڑی ہوئی ہے ہماری:
(الف) بنیاد میں (ب) شہ رگ میں (ج) روح میں (د) گھٹی میں (د)

7۔ ہم چارپائی پر دوا کھاتے ہیں، دعا اور _____ مانگتے ہیں:
(الف) بھیک (ب) پناہ (ج) اجر (د) نجات (الف)

8۔ اکثر فکرِ قوم میں کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔
(الف) سوا (ب) فاقہ (ج) دغا (د) چوری (ب)

9۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا شاعر کو:
(الف) اپنی شاعری پر (ب) نظم پر (ج) ردیف پر (د) قافیہ پر (د)

10۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا _____ کو فعل غپاڑے پر:
(الف) لڑکے (ب) طالب علم (ج) بچے (د) جوان (ب)

11۔ ہندوستانی گھرانوں میں ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، دواخانہ، کتاب گھر اور شفاخانہ کی حیثیت حاصل ہے:
(الف) بیڈ کو (ب) مسہری کو (ج) پلنگ کو (د) چارپائی کو (د)

12۔ کوئی مہمان آیا، چارپائی نکالی گئی، اس پر بچھا دی گئی:
(الف) نئی چادر (ب) نئی دری (ج) نئی بیڈ شیٹ (د) نئی رضائی (ب)

13۔ مہمان صاحب مع اچکن، ٹوپی، بیگ، بقچی کے بیٹھ گئے:
(الف) چارپائی پر (ب) دری پر (ج) چادر پر (د) دسترخوان پر (الف)

14۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہوگیا کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان:
(الف) بے وقوف (ب) نادان (ج) دیوانہ (د) بدنصیب (د)

15۔ چارپائی پر ہی مہمان کا منہ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ:
(الف) چائے پئیں گے (ب) آرام کریں گے (ج) سو رہیں گے (د) کافی پئیں گے (ج)

16۔ چارپائی پر سوکھنے کے لیے پھیلایا جائے گا:
(الف) گیہوں (ب) دھان (ج) باجرہ (د) اناج (د)

17۔ اناج پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی، دانے چگتی اور سنتی رہیں گی:
(الف) گیت (ب) نصیحتیں (ج) گالیاں (د) شور (ج)

18۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر چھیلے جائیں گے:
(الف) شلجم (ب) آلو (ج) کدو (د) پھل (ب)

19۔ ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رُخصت جمع ہوتی رہتی ہے اس کو لے کر ملازمت سے ہو جاتے ہیں:
(الف) ریٹائر (ب) بری الذمہ (ج) سبکدوش (د) سرخرو (ج)

20۔ جب چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو داخل کر دیتے ہیں:
(الف) سٹور میں (ب) کال کوٹھری میں (ج) تہہ خانے میں (د) کباڑ خانے میں (ب)

21۔ چارپائی پر سال بھر کے _____ کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے:
(الف) اناج (ب) گیہوں (ج) چاول (د) پیاز (د)

22۔ چار پائی ایک اچھے ________ کا بھی کام دیتی ہے:
(الف) صندوق (ب) بکس (ج) ڈرائنگ روم (د) بیڈروم (ب)

23۔ ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہوتا، رکھی جاتی ہیں:
(الف) چار پائی کے نیچے (ب) بیڈ شیٹ کے نیچے (ج) کمبل کے نیچے (د) تکیے کے نیچے (د)

24۔ حکومت بھی ہوتی ہے:
(الف) چار پائی پر (ب) پلنگ پر (ج) مسہری پر (د) ڈبل بیڈ پر (الف)

25۔ خاندان کے کرتا دھرتا چار پائی پر ہی ہوتے ہیں:
(الف) بیمار (ب) صحت یاب (ج) براجمان (د) جلوہ افروز (ج)

26۔ ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں:
(الف) دفتر سے (ب) چار پائی سے (ج) عدالت سے (د) محکمہ کی طرف سے (ب)

27۔ چار پائی ہی کھانے کا ہوتی ہے:
(الف) کمرہ (ب) ڈائننگ ٹیبل (ج) سٹور (د) کچن (الف)

28۔ صاحب خانہ دستر خوان پر ہوتے ہیں:
(الف) وزیر (ب) صدر (ج) ممبر (د) چیئر مین (ب)

29۔ کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو کہیں گم ہوئی ہو، ہندوستانی اس کی تلاش کی ابتدا کرتا ہے:
(الف) پلنگ سے (ب) مسہری سے (ج) چار پائی سے (د) بیڈ سے (ج)

30۔ ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے:
(الف) چار پائی (ب) ثقافت (ج) شادی (د) رسم (الف)

31۔ بانوں کی ٹوٹی ہوئی چار پائی کو مکا (مکئی) کے کھیت میں باندھ دیا جاتا ہے بطور :
(الف) پہچان (ب) مچان (ج) شناخت (د) حفاظت (ب)

32۔ مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی کر رہا ہے:
(الف) حفاظت (ب) نگرانی (ج) رکھوالی (د) چوکیداری (ج)

33۔ سبق میں موسم کا ذکر ہے:
(الف) برسات (ب) بہار (ج) گرمی (د) سردی (الف)

34۔ کہیں کوئی پکا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے تو سب کے سب:
(الف) لڑتے ہیں (ب) دوڑتے ہیں (ج) لپکتے ہیں (د) جھپٹتے ہیں (د)

35۔ جس کو درخت کی ڈال سے گرا ہوا آم مل جاتا ہے وہ بن جاتا ہے:
(الف) ہیرو (ب) چیمپئن (ج) صدر (د) ممبر (الف)

36۔ یہ خاکسار ایک کھری چار پائی پر آرام فرما رہا ہے:
(الف) چمن میں (ب) جنگل میں (ج) گلستان میں (د) باغ میں (د)

37۔ باغ میں رکھی ہوئی چار پائی کس کی ہے؟
(الف) مصنف کی (ب) باغبان کی (ج) چوکیدار کی (د) کسان کی (ب)

38۔ لڑکے لڑکیاں ہیں:
(الف) دیہات کے (ب) شہر کے (ج) بستی کے (د) گاؤں کے (د)

39۔ مصنف کے حصہ کا صرف کیا ہے؟
(الف) ایک تربوز (ب) ایک خربوزہ (ج) ایک کیلا (د) ایک آم (د)

40۔ دوسروں کو اس کا اسیر دیکھ کر ________ ہوں:
(الف) چونک پڑتا (ب) خاموش ہو جاتا (ج) پریشان ہو جاتا (د) غم زدہ ہو جاتا (الف)

سبق:۸ اور پاکستان بن گیا

مُصنفہ
خدیجہ مستور
(1927-1982)

مصنفہ کا تعارف

خدیجہ مستور بریلی کے یوسف زئی خاندانؔ سے تعلق رکھتی تھیں۔ بریلی کے نزدیک بلسہ نامی گاؤں کے ایک متوسط پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام تہوّر علی خاں تھا اور وہ ملازمت پیشہ تھے لہٰذا مختلف مقامات پر ابتدائی زندگی گزاری۔ ان کی والدہ کا نام انور جہاں تھا جو ایک اچھی شاعرہ اور مضمون نگار تھیں۔ اس طرح انھیں ابتدا ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر آیا لیکن نو برس کی تھیں کہ والد وفات پا گئے اور خاندان والوں نے کفالت سے ہاتھ کھینچ لیا لہٰذا معاشی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور لکھنؤ میں اپنے نانا کے ہاں قیام کرنا پڑا۔ گھر پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنی محنت اور ذوق سے وسیع مطالعہ اور معاشرتی و معاشی حقائق کا ادراک حاصل کیا۔

خدیجہ مستور کی چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور (۱۹۳۰-۲۰۱۲ء) بھی معروف ناول نگار اور افسانہ نگار گزری ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد دونوں بہنیں اپنے گھرانے کے ساتھ پہلے کراچی اور پھر لاہور آ گئیں۔

خدیجہ مستور کو ابتدا ہی سے افسانوی ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کھیل'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ''بوچھار'' (۱۹۴۶ء)، ''چند روز اور'' (۱۹۵۱ء)، ''تھکے ہارے'' (۱۹۶۲ء) اور ناول ''آنگن'' (۱۹۶۲) بھی شائع ہوئے۔ ''آنگن'' پر ان کو آدم جی ادبی انعام ملا۔ ان کی آخری تصنیف ''زمین'' ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

خدیجہ مستور اردو خواتین ناول نگاروں میں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے اپنے ناول ''آنگن'' میں سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ایک پورے عہد اور دور کی کش مکش کو پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس ناول کو قیامِ پاکستان کے پس منظر میں لکھے جانے والے ناولوں میں امتیاز حاصل ہے۔ ناول ''آنگن'' کی کہانی اگرچہ ایک خاندان کی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے آئینے میں اُنھوں نے گھریلو زندگی کے تصادم اور کش مکش کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی نظریات کے ٹکراؤ، سماجی رجحانات اور معاشی تحریکوں کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کا ایک خاص کارنامہ اپنے نسوانی کرداروں کی حقیقی تصویر کشی اور ان کی نفسیات کا سچا اظہار ہے۔

''آنگن'' کی زبان نہایت شستہ، رواں اور روزمرہ کی زبان ہے۔ خدیجہ مستور کا اسلوب جدید دور کے سادہ، بے تکلف اور عام فہم انداز کا آئینہ دار ہے جو ناول کے موضوع، کرداروں اور ان کے تمام احساسات و معاملات کے اظہار پر قادر ہے۔ ''آنگن'' درحقیقت قیامِ پاکستان کے وقت کے ایک متوسط مسلمان گھرانے کی تصویر کشی پر مبنی ہے۔

۲۶۔ جولائی ۱۹۸۲ء کو خدیجہ مستور کا لاہور میں انتقال ہوا لیکن ان کا فن اور ان کی لافانی تخلیقات آج بھی زندہ ہے۔

تصانیف: تھکے ہارے، چند روز اور کھیل، بوچھار اور ٹھنڈا میٹھا پانی، ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ جب کہ آنگن اور زمین، ناول ہیں۔

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:
- ☆ طلبہ کی لسانی اور ادبی مہارتوں کو بہتر بنانا۔
- ☆ طلبہ کو فنِ ناول نگاری اور اس کے لوازم سے روشناس کرنا۔
- ☆ خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کے توسط سے تحریکِ پاکستان کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔
- ☆ طلبہ میں ناول کے کرداروں، واقعات، پلاٹ، مکالمات اور منظر کشی وغیرہ کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر 51 **آنگن:** (گھر کے اندر کا صحن، انگنائی)، **براہِ راست:** (سیدھا، بلاواسطہ، بغیر کسی ذریعے کے)، **سیاست:** (کسی ملک کا نظامِ حکومت، حکومت کرنے کی حکمتِ عملی، ملکی تدبیر وانتظام، طریقۂ حکمرانی)، **یوپی:** (بھارت کی ریاست اتر پردیش، بلحاظ آبادی، بھارت کی سب سے بڑی اور رقبے کے اعتبار سے پانچویں بڑی ریاست ہے)، **اشرافیہ:** (حکومتِ امرا جس میں چند مخصوص اور بااثر لوگ ہی اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہوتے ہیں، خواص کی حکومت)، **جھلک:** (آب وتاب، چمک دمک، روشنی، پرتو، عکس، جلوہ)، **نسواں:** (عورتیں، خواتین، مستورات)، **نسوانی:** (نسواں سے منسوب، عورتوں کا، عورتوں سے نسبت)، **نفسیات:** (جان، روح، ذات، وجود، ہستی، خواہشِ نفسانی، نفس سے متعلقہ باتیں، علم النفس، انسان کے تحت الشعور اور لاشعور کی تحقیق کا علم)، **مہارت:** (کسی کام، فن یا پیشے وغیرہ میں کمالِ ہنر مندی، استادی، تجربہ کاری)، **مرکزی:** (بنیادی، نمایاں، خاص، ممتاز)، **کانگرس:** (انڈین نیشنل کانگرس جسے کانگرس پارٹی اور آئی این سی بھی کہا جاتا ہے، بھارت کی ایک بڑی سیاسی جماعت ہے۔)، **دارالحکومت:** (ایسا شہر یا علاقہ جہاں سے کسی ملک کا نظام چلایا جاتا ہے یا جہاں قومی وسرکاری ادارے اور دفاتر موجود ہوں، دارالحکومت کہلاتا ہے)، **پنجاب:** (بھارت کی ایک ریاست کا نام)، **خون کی ہولی:** (قتل وغارت گری، قتلِ عام، خون ریزی، جنگ وجدل، لڑائی)، **نڈھال:** (ناتواں، کمزور، تھکا ماندہ، تھکا ہارا نیز شدتِ غم سے مضمحل)، **بیٹھک:** (بیٹھنے کی جگہ، نشست گاہ، مردانہ کمرا، مکان کا وہ حصہ جو مردوں کی نشست کے لیے مخصوص ہو)، **سر سہلانا:** (سر پر ہاتھ پھیرنا، پیار کرنا، پچکارنا، تعریف کرنا، خوشامد کرنا)، **فساد:** (تباہی، خرابی، لڑائی، جھگڑا، ہنگامہ)، **ٹھنڈی آہ بھرنا:** (بہت افسوس کرنا)

نمبر 52 **بلکنا:** (تڑپ کے رونا، زار زار رونا، سسکیاں بھر کر رونا)، **چہرہ فق ہونا:** (اوسان خطا ہونا، بے نور وبے رونق ہو جانا)، **وقف کرنا:** (بخشنا، عطا کرنا، ہمیشہ کے لیے کسی کو دے دینا، نذر کرنا، پیش کرنا)، **تار:** (برقی تار کے ذریعے آنے والی خبر، ٹیلی گرام، برقی پیغام)، **نگر:** (شہر، قصبہ، بڑی بستی، بڑا گاؤں، بڑی آبادی)، **نچلا نہ بیٹھنا:** (بے چین اور حرکت میں رہنا، چپ نہ رہنا)، **نیم دیوانگی:** (تھوڑا سا پاگل پن، دیوانوں جیسی حالت، پاگلوں کی سی کیفیت)، **عالم:** (دنیا، کائنات، حالت، کیفیت)، **بپھرنا:** (غصے میں بھرنا، غضب ناک ہونا، جھلانا، قابو سے باہر ہونا)، **دلدل:** (وہ زمین جو پانی کے اثر سے اتنی نرم اور لیس دار ہو گئی ہو کہ اس میں پاؤں دھنس جائیں۔ وہ مصیبت یا پریشانی جس سے نکلنا بہت مشکل ہو)

نمبر 53 **رُکھائی:** (بے رُخی، بے مروتی، روکھا پن)، **ڈبڈبانا:** (آنکھوں میں آنسو بھر آنا)، **احاطہ:** (چار دیواری، چار دیواری سے گھری ہوئی جگہ)، **بسیرا:** (پڑاؤ، عارضی قیام، شام کے وقت اپنے اپنے گھونسلے میں رات گزارنے کے لیے جانے سے کچھ پہلے پرندوں کا اکٹھے بیٹھنے اور چہچہانے کا عمل)، **فضا:** (زمین اور آسمان کے درمیان کی وسعت، کسی چیز کے اندر کی خالی جگہ، میدان، کشادہ جگہ)، **ٹہلنا:** (آہستہ آہستہ چلنا پھرنا، مٹرگشت کرنا، تفریح کے لیے پھرنا، سیر کرنا)، **مگن:** (کسی خیال، بات یا کام میں ڈوبا ہوا، بے خود، کسی کام میں محو، مست، سرشار)، **پھرتی:** (چستی، تیزی، جلدی)، **سُونی:** (اجاڑ، ویران، خالی)، **لو:** (آگ کا چھوٹا شعلہ، چراغ یا شمع کا شعلہ)، **مدھم:** (دھیما، آہستہ، ہلکا، خفیف)، **پُرامن:** (محفوظ، جس میں امن وسلامتی ہو، خطرات وخدشات سے پاک)، **بوکھلا کر:** (پریشان ہو کر، گھبرا کر)، **تڑاخ سے:** (بے باکی سے، فوراً)، **عیش:** (آرام، آسائش، خوشی، راحت، سکھ)، **جوش:** (ولولہ، دھن، لگن)

نمبر 54 **جھیلنا:** (برداشت کرنا، سہنا، اٹھانا، گوارا کرنا)، **یتیم:** (بے پدر، جس کا باپ مرگیا ہو)، **یتیم الطرفین:** (وہ بچہ جس کے ماں باپ دونوں مر گئے ہوں)، **حق جتانا:** (استحقاق ظاہر کرنا یا دلانا)، **سسکنا:** (سبکنا، ذرا ذرا سا سانس لینا، سسکی بھرنا)، **نفرت:** (کسی چیز سے بھاگنا، بے زاری، انتہائی ناپسندیدگی، کراہت، گھن)، **شادمانی:** (خوشی، فرحت، مسرت)، **رفع کرنا:** (دکھ اور رنج وغیرہ دور کرنا، پورا کرنا)، **بحال:** (اپنی اصلی حالت پر، قائم، برقرار، ہٹائے جانے کے بعد پھر اپنے مقام یا جگہ پر واپس، بشاش، خوش، تروتازہ)، **شبنم:** (رات کی نمی، اوس، وہ نمی جو پانی یا پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندوں کی شکل میں رات کو ہوا میں سے زمین پر نمودار ہوتی ہے)

نمبر 55 **صلاحیت:** (قابلیت، اہلیت، لیاقت)، **دیوانگی** (ہوش وحواس گم ہو جانے کا عالم، جنون، پاگل ہونے کی کیفیت)، **بت:** (مجسمہ، مورتی، وہ صورت جو پتھر، مٹی، دھات یا لکڑی وغیرہ سے بنائی جائے، خاموش، گم صُم)، **بے حس وحرکت:** (وہ چیز جو حرکت نہ کر سکے، سُن، بے جان، جس پر کیفیات وحالات اثر انداز نہ ہوں)، **اذیت ناک:** (دکھ دینے والا، تکلیف دہ، اذیت دینے والا)، **مقروض:** (جس پر کسی کا قرض آتا ہو، وہ شخص جس نے اُدھار لیا ہو، قرض دار)، **کرب:** (جسمانی تکلیف وذہنی کوفت، تکلیف، بے چینی، غم، رنج، درد)، **سناٹا:** (خاموشی، ویرانی، ہوکا عالم، سکتے کا عالم)، **بے نیاز:** (بے پروا، بے غرض، جو کسی شخص کا محتاج نہ ہو، جس کو کوئی حاجت نہ ہو)، **گنگنانا:** (ترنم کے ساتھ دھیمی آواز سے گانا، چپکے چپکے گانا کہ آواز تو نکلے لیکن الفاظ کسی کی سمجھ میں نہ آئیں)، **ادھوری:** (آدھی، نصف، جو ابھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی ہو، نامکمل)، **ترجمانی:** (نمائندگی)

توضیحات

سیاست: کسی ملک کا نظامِ حکومت، حکومت کرنے کی حکمتِ عملی، ملکی تدبیر وانتظام، طریقۂ حکمرانی۔

یو۔پی: بھارت کی ریاست اتر پردیش، بلحاظ آبادی، بھارت کی سب سے بڑی اور رقبے کے اعتبار سے پانچویں بڑی ریاست ہے۔

اشرافیہ: حکومتِ امرا جس میں چند مخصوص اور بااثر لوگ ہی اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہوتے ہیں، خواص کی حکومت

نفسیات: جان، روح، ذات، وجود، ہستی، خواہشِ نفسانی، نفس سے متعلقہ باتیں، علم النفس، انسان کے تحت الشعور اور لاشعور کی تحقیق کا علم۔

کانگرس: انڈین نیشنل کانگرس جسے کانگرس پارٹی اور آئی این سی بھی کہا جاتا ہے، بھارت کی ایک بڑی جماعت ہے۔ جماعت کا قیام دسمبر 1885ء میں عمل میں آیا۔ اپنے قیام کے بعد یہ ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف جدوجہد کرنے والی ایک اہم جماعت بن گئی۔ تحریکِ آزادئ ہند کے دوران میں اس کے ڈیڑھ کروڑ سے زائد اراکین تھے۔

دارالحکومت: ایسا شہر یا علاقہ جہاں سے کسی ملک کا نظام چلایا جاتا ہے یا جہاں قومی وسرکاری ادارے اور دفاتر موجود ہوں، دارالحکومت کہلاتا ہے۔

مشرقی پنجاب: جو پہلے ایک صوبہ اور بعد میں 1947ء سے 1966ء تک بھارت کی ایک ریاست تھی، جو برطانوی ہند کے صوبہ پنجاب کا حصہ رہا ہے۔ 1984ء میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کا قتلِ عام ہوا، جس کے بعد سے اب تک علیحدگی کی تحریک چل رہی ہے۔ جس کا مقصد بھارت سے آزادی حاصل کرنا ہے اور آزاد ملک خالصتان بنانا ہے۔ بھارت پنجاب کے لوگوں پر ظلم کر رہا ہے۔

دلدل: وہ زمین جو پانی کے اثر سے اتنی نرم اور لیس دار ہو گئی ہو کہ اس میں پاؤں دھنس جائیں۔ وہ مصیبت یا پریشانی جس سے نکلنا بہت مشکل ہو۔

بسیرا: پڑاؤ، عارضی قیام، شام کے وقت اپنے اپنے گھونسلے میں رات گزارنے کے لیے جانے سے کچھ پہلے پرندوں کا اکٹھے بیٹھنے اور چہچہانے کا عمل۔

فضا: زمین اور آسمان کے درمیان کی وسعت، کسی چیز کے اندر کی خالی جگہ، میدان، کشادہ جگہ۔

سبق کا خلاصہ

پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگی راہ نما پاکستان جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا کانگرسی کارکن تھے۔ ان سے یہ فساد دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بیٹھک میں بیماروں کی طرح لیٹے ہر کسی سے ملکی حالات کے بارے میں پوچھتے

رہتے۔ عالیہ ان کا سر سہلاتی مگر وہ اس طرح بے چین تھے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

ان کے شہر میں تو ابھی تک فساد نہیں ہوا تھا۔ لیکن سب کو ڈر لگا ہوا تھا کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ بڑی چچی کا بیٹا شکیل گھر سے بھاگ گیا تھا اور اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ لہٰذا بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں اور جمیل سے کہنے لگیں کہ تمھارا پاکستان بن گیا اور تمھارے ابا کا ملک آزاد ہو گیا۔ اب میرے شکیل کو کون لائے گا۔ اس پر جمیل اپنی اماں کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ فساد دو تین دن میں ختم جائے گا۔

اتنی دیر میں عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے۔ انھوں نے عالیہ اور اماں کو لکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی پاکستان جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجیے اور تیار رہیے۔ جس پر عالیہ کی اماں خوشی کے مارے جمیل بھیا سے کہتی ہے کہ بس ابھی تار بھیج دو اور وہ جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ جمیل بھیا کو عالیہ سے جدائی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور وہ گھبرا کر سب کی طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے فسادی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں۔ وہ عالیہ اور اس کی اماں کو روکنے کی بہت کوشش کرتا ہے لیکن اماں ایک دم بپھر اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ تم ہوتے کون ہو روکنے والے۔ جمیل بھیا سر جھکائے اٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں۔

جمیل بھیا کی حالت دیکھ کر عالیہ کو یوں لگا کہ وہ نہیں جا سکتی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جا سکتی۔ اسے کوئی نہیں لے جا سکتا۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر وہ ادھر رہ گئی تو دلدل میں پھنس جائے گی۔ بڑی چچی نے عالیہ کی اماں کو جانے سے روکا لیکن اس نے ان کی کسی بات کی پروا نہ کی۔ عالیہ اپنی تمام سوچوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اوپر چلی گئی۔ جب وہ نیچے آئی تو تھوڑی دیر بعد جمیل بھیا بھی گھر لوٹ آتے ہیں اور عالیہ کی اماں یعنی اپنی چچی سے کہتے ہیں کہ میں تار کر آیا ہوں۔ اماں پاکستان جانے کی بات کر رہی ہوتی ہیں کہ بڑے چچا آ جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کون جا رہا ہے پاکستان؟ کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا۔ جس پر اماں تڑاخ سے جواب دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ بڑے آئے حق دار، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے۔ میرے شوہر کو چھین لیا، اسے مار ڈالا۔ میری بچی یتیم ہو گئی۔ جس پر بڑے چچا افسردہ ہو کر خاموشی سے بیٹھک کی طرف چلے جاتے ہیں۔

عالیہ بڑے چچا کی محبت میں اماں سے الجھ پڑتی ہے اور اماں کی باتوں کی پروا کیے بغیر بیٹھک میں چلی جاتی ہے اور اپنی اماں کے فیصلے پر بڑے چچا کے سامنے رونے لگتی ہے۔ وہ عالیہ کو حالات بہتر ہونے کا یقین دلاتے ہیں اور اُسے پیار سے تھپکاتے ہیں۔ اسرار میاں کے بیٹھک میں آنے سے عالیہ اُٹھ کر صحن میں چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر صحن میں رکنے کے بعد وہ اوپر چلی جاتی ہے۔ چھت پر وہ بے چینی سے ٹہلنے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل بھیا بھی چھت پر آ جاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا سچ مچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ جس پر وہ جواب دیتی ہے کہ ہاں! جمیل بھیا نیم دیوانگی کی حالت میں عالیہ سے کہتے ہیں کہ تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی۔ تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہوگا۔ تم خوش نہیں رہو گی۔ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ جمیل بھیا کھڑے رہتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے سے عالیہ کو یوں لگا کہ وہ سب کچھ کھو چکی ہے۔ بڑی دیر ٹہلنے کے بعد وہ چھمی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے اور اپنے پاکستان جانے کی اطلاع دیتی ہے۔

مرکزی خیال

یہ سبق تقسیمِ ہند کے دوران میں ہونے والے سماجی، سیاسی، اقتصادی بحران کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ''آنگن'' اتر پردیش کے ایک متوسط مسلم گھرانے کے آنگن کے مسائل پر لکھا گیا ناول ہے۔ مصنفہ نے بڑی خوب صورتی اور احتیاط سے بتایا ہے کہ باہر کے واقعات کی گونج گھر کے آنگن میں کس طرح سنائی دیتی ہے۔ ناول کی کہانی گھر کے آنگن اور آنگن سے ملحقہ بیٹھک کے گرد گھومتی ہے۔ نیز تقسیم کے وقت لوگوں کا اپنے پیاروں کو نہ چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر جانا، مسلمانوں کا پاکستان ہجرت کرنا اور دورانِ ہجرت ہونے والے فسادات کو مصنفہ نے نہایت دردمندی سے بیان کیا ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق و سباق

پاکستان بن گیا اور مسلم لیگی راہ نما پاکستان جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا ان حالات کی وجہ سے نہایت بے چین تھے۔ عالیہ ان کا سر سہلاتی ہے۔ ان کے شہر میں ابھی فساد برپا نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی سب ڈرے ہوئے تھے۔ عالیہ کی اماں اپنے بھائی کا خط آنے پر ان کے ساتھ پاکستان جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ جمیل بھیا کو عالیہ سے جُدائی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اماں اپنے پاکستان جانے کے فیصلے پر بڑے چچا سے الجھ پڑتی ہے۔ انھیں اپنی بیوگی اور اپنی بیٹی کی یتیمی کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ عالیہ ان سب سے فرار حاصل کرنے کے لیے اوپر چلی جاتی ہے۔ ادھر جمیل بھیا آ جاتے ہیں۔ وہ جمیل بھیا کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی اسے ہر طرف سناٹا لگتا ہے۔ وہ چھمی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

عبارت نمبر 1

پاکستان بن گیا۔ لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ مشرقی پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟''

یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟''

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگتی۔ ''بڑے چچا آپ آرام کیجیے، آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا۔'' اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے۔ اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ شام کے وقت عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور عالیہ کی اماں ان کے ساتھ پاکستان جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ عالیہ جمیل بھیا کی محبت کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنی اماں کے ساتھ جانے پر تیار ہو جاتی ہے۔ اماں کو پاکستان جانے سے سب روکتے ہیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتیں اور بڑے چچا کے ساتھ بحث کرنے لگتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ کی وجہ سے میری بیٹی یتیم ہو گئی۔ عالیہ بڑے چچا سے بے حد محبت کرتی ہے اور صورتِ حال سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے۔ ادھر سے جمیل بھیا آ جاتے ہیں جو نیم دیوانگی کی حالت میں اس سے متعدد سوال کرتے ہیں۔ مگر وہ ان سوالوں کا جواب نہیں دیتی اور اسی کرب کی حالت میں صبح کا انتظار کرنے لگتی ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

تشریح طلب اقتباس ایک ایسے وقت کی عکاسی کرتا ہے جب ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا، انگریز یہاں سے جا چکے تھے اور مقامی لوگوں کو انگریزوں کی غلامی سے نجات مل چکی تھی۔ لیکن یہ آزادی ہر کسی کے لیے خوشی کا پیغام نہ تھی۔ اس اقتباس میں ایک کردار یعنی بڑے چچا کا ذکر ہے۔ بڑے چچا ایک حساس، سنجیدہ اور متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھنے والے فرد ہیں۔ وہ مسلم لیگ کی

بجائے کانگریس کے حامی ہیں۔ اس لیے ملک کی تقسیم کے فیصلے کو وہ دکھ اور افسوس سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد پورے پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے اور ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ صدیوں سے مل جل کر رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تو بڑے چچا اندر سے بکھر گئے۔ اس اقتباس میں ان کی ذہنی اذیت، بے بسی اور دل گرفتگی کو سادہ مگر پُر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے نتیجے میں پاکستان بن گیا۔ پاکستان بنانے کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان ایک الگ وطن میں اپنی دینی، تہذیبی اور معاشرتی آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ ان کا الگ وطن کا مطالبہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب ہندو مسلم اختلافات زور پکڑ گئے۔ اس وقت مسلمانوں کو خدشہ ہوا کہ متحدہ ہندوستان میں ان کا تشخص مٹ جائے گا۔ چناں چہ آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ ان دونوں قوموں کا الگ تشخص ہے۔ اس بنیاد پر انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ آزاد ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا جو شدید جدوجہد کے بعد بالآخر پورا ہو گیا۔

؎ نقشِ بے معنی میں اِک رنگِ حقیقت بھر دیا مردِ آہن تو نے ناممکن کو ممکن کر دیا

پاکستان کے قیام کے بعد کراچی اس کا دارالحکومت بنا۔ لیگی رہنما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ آزاد وطن میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور نئی ریاست اپنے پاؤں پر کھڑی ہو رہی تھی۔ پاکستان کے قیام پر جہاں لاکھوں مسلمان خوشی سے جھوم اٹھے تھے، وہیں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس تقسیم کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ بڑے چچا بھی انھی لوگوں میں سے تھے۔ وہ کانگریس کے پرانے وفادار اور ہندوستان کی تقسیم کے شدید مخالف تھے۔ ان کی نظریں ہمیشہ متحدہ ہندوستان کے خواب پر جمی تھیں۔ وہ چاہتے تھے انگریز ہندوستان سے رخصت ہو جائے اور ہندو، مسلمان، سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ سب مل جل کر رہیں۔ ان کی خواہش اور جدوجہد کے برعکس پاکستان بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ بڑے چچا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی انسانی لاشوں پر کھڑی ہوگی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھائی بھائی کا مخالف اور پڑوسی پڑوسی کا دشمن بن جائے گا۔ بقول ندا فاضلی:

؎ کوئی ہندو کوئی مسلم کوئی عیسائی ہے سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

بڑے چچا اس صدمے سے نڈھال ہو گئے تھے۔ انھوں نے حالات کی خرابی کا بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ وہ اب صرف جسمانی طور پر زندہ تھے، اندر سے ان کی ساری امیدیں، یقین اور توانائی ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ وہ سارا دن بیماروں کی طرح بیٹھک میں پڑے رہتے۔ وہ بار بار سب سے یہی سوال کرتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا ہے؟ ان سوالوں میں حیرانی بھی تھی اور بے بسی بھی۔ وہ ایک ایسے عہد کے گواہ تھے جہاں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لیے جان دے دیتے تھے۔ تقسیم کے بعد اب وہی قومیں ایک دوسرے کو قتل کر رہی تھیں۔ بقول عالم خورشید:

؎ چاروں طرف ہیں شعلے ہمسائے جل رہے ہیں میں گھر میں بیٹھا بیٹھا بس ہاتھ مل رہا ہوں

یا بقول کامل بہزادی:

؎ اس قدر میں نے سُلگتے ہُوئے گھر دیکھے ہیں اب تو چبھنے لگے آنکھوں میں اُجالے مجھ کو

کانگریس کی حمایت میں وہ لوگوں کو یہی کہتے رہے کہ ملک تقسیم نہیں ہونا چاہیے، تقسیم سے خون بہے گا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے خون بہتا دیکھ رہے تھے۔ وہ عالیہ سے پوچھتے: ''یہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟ یہ وہ سوالات تھے جن سے ان کی بے بسی ٹپکتی تھی۔ یہ وہ سوال ہیں جو آج بھی

ہمارے ذہنوں میں گونجتے ہیں۔ بڑے چچا صرف ایک سیاسی کارکن نہیں تھے، وہ جذباتی طور پر ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ان کی سوچ صرف نظریاتی ہی نہیں بلکہ روحانی اور تہذیبی سطح پر ہندوستان کی یکجہتی کی قائل تھی۔

جب وہ یہ سوال عالیہ سے پوچھتے تو عالیہ خود الجھن میں پڑ جاتی۔ عالیہ خود نوجوان تھی اور اس سیاسی کشمکش کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عالیہ کے پاس ان سوالوں کے کوئی جواب نہیں تھے۔ بڑے چچا کی بے چینی دیکھ کر وہ انھیں کہتی: ''بڑے چچا آپ آرام کیجیے، آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا'' وہ ان کا سر سہلاتی اور انھیں تسلی دیتی۔ بڑے چچا کے سوال سُن کر وہ خود بھی پریشان ہو جاتی۔ عالیہ بڑے چچا کا سر سہلاتی تو وہ آنکھیں بند کر لیتے۔ آنکھیں بند کر کے بھی انھیں سکون نہیں ملتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ فسادات کے خونی مناظر کو اپنی بند آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہے ہوں۔ ان کے تصور میں خون کی ندیاں بہ رہی تھیں، خون کی ان ندیوں میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی لاشوں کو بہتے دیکھتے۔ وہی ہندو اور مسلمان جو کبھی بھائیوں کی طرح رہتے تھے، وہی ہندو اور مسلمان جو ایک دوسرے کے لیے جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ بڑے چچا کے ذہن میں ایسے سوالات تھے لیکن ان کے جواب نہیں تھے۔ انھیں دکھ یہ تھا کہ آزادی کے بعد ان کے سامنے ایک ایسا ہندوستان تھا جو ان کے نظریات اور خوابوں کے بالکل الٹ تھا۔ بقول فیض احمد فیض:

؎ یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

اس عبارت میں بڑے چچا کی ذہنی کیفیت دکھائی گئی ہے۔ لیکن دراصل اس میں اس وقت کی پوری سیاسی اور سماجی فضا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بڑے چچا کا کردار ان لاکھوں لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو نہ پاکستان بننے کے مخالف تھے، نہ متحدہ ہندوستان کے حامی، بلکہ وہ صرف انسانیت اور بھائی چارے کے قائل تھے۔ وہ معاشرے میں عدل و انصاف کا چلن دیکھنا چاہتے تھے۔

؎ شمیمِ عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے (مخدوم محی الدین)

عبارت نمبر 2

''زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا، ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا تھا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، پر اب کیا رہ گیا، دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا ہے''

کریمن بوا فساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں۔ اپنے شہر میں فساد تو نہ ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی۔ پتا نہیں کب کیا ہو جائے؟

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ بتاتی ہیں کہ پاکستان بن گیا اور لیگی راہ نما پاکستان جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ فسادات کی وجہ سے بڑے چچا بہت پریشان تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ شام کے وقت عالیہ کے ماموں کا خط آیا اور عالیہ کی اماں ان کے ساتھ پاکستان جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ عالیہ بھی جمیل کی محبت کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنی اماں کے ساتھ جانے پر تیار ہو جاتی ہے۔ اماں کو پاکستان جانے سے سب روکتے ہیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتیں اور بڑے چچا کے ساتھ بحث کرنے لگتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ کی وجہ سے میری بیٹی یتیم ہو گئی۔ عالیہ بڑے چچا سے بے حد محبت کرتی ہے۔ صورتِ حال سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ چھت پر چلی جاتی ہے۔ ادھر سے جمیل بھیا آ جاتے ہیں جو نیم دیوانگی کی حالت میں اس سے متعدد سوال کرتے ہیں۔ مگر وہ ان سوالوں کے جواب نہیں دیتی۔ تھک ہار کر وہ چھمی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ اس دردناک تبدیلی کو بیان کر رہی ہیں جو تقسیم ہند کے بعد ہندو اور مسلمان قوموں کے تعلقات میں پیدا ہوئی۔ مصنفہ نے ابتدا ایک پرانی یاد سے کی ہے۔ وہ ایسے زمانے کی بات کرتی ہیں جو اب صرف یادوں میں رہ گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک تھے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ اگر کسی گاؤں میں کسی مسلمان پر آنچ آتی تو ہندو اپنا سب کچھ قربان کر دیتا اور اپنی جان تک دے دیتا۔ یہ صرف انسانیت اور بھائی چارے کے لیے تھا۔ دوسری طرف مسلمان بھی اتنے ہی مخلص تھے۔ اگر کسی ہندو کی عزت پر حرف آنے کا خطرہ ہوتا تو مسلمان بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی جان نچھاور کر دیتے۔ دونوں کے درمیان ایسا مضبوط رشتہ تھا جیسے دونوں ایک ہی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہوں۔ یہ محبت اور اخوت ایک گہری تہذیبی یکجہتی کا اظہار تھی۔ یہ یکجہتی صدیوں کی مشترکہ تاریخ کا ورثہ تھی۔ بقول تلوک چند محروم:

ہندو مسلمان قومیں پُرانی دونوں کی دونوں ہندوستانی

زمانہ بدلا، حالات تبدیل ہوئے اور سیاسی فضا بھی زہر آلود ہو گئی۔ رہنماؤں کی تقاریر نے عوام کو ورغلایا تو نفرتیں بڑھ گئیں۔ دونوں قوموں کے درمیان اعتماد ٹوٹنے لگا، جو بھائی ایک دوسرے کے لیے جان دینے کو تیار تھے اب ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر اتر آئے۔ محبت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ امن کی جگہ خوف اور خون ریزی نے لے لی۔ انسانیت کی جگہ تعصب اور خود غرضی نے لے لی۔ ملک تقسیم ہوا تو دونوں قوموں کے ہاتھوں میں خنجر آ گئے۔ یہ خنجر محض ہتھیار نہیں بلکہ دلوں میں اتری وہ نفرتیں تھیں جنھوں نے ہر رشتہ توڑ دیا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ ایک مسلمان اپنی جان دے کر ہندو کی عزت کی حفاظت کرتا۔ اسی طرح ایک ہندو اپنے مسلمان پڑوسی کی حفاظت کے لیے کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے، باہمی اعتماد ختم ہو چکا تھا اور ہر کوئی دوسرے کی نیت پر شک کرتا تھا۔

چھپی خاموش آہیں شور محشر بن کے نکلی ہیں دبی چنگاریاں خورشید خاور بن کے نکلی ہیں (مخدوم محی الدین)

کریمن بوا فساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی ہیں۔ کریمن بوا اس گھر کی پرانی اور وفادار ملازمہ ہے۔ وہ نہ صرف گھر کے روز مرہ کاموں سے وابستہ ہے بلکہ اس خاندان کے ہر فرد کے ساتھ جذباتی طور پر جڑی ہوئی ہے۔ کریمن بوا نے پرانا امن کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور نئے حالات بھی دیکھ رہی ہے۔ جب وہ فساد کی خبریں سنتی ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے۔ یہ آہیں گویا رشتوں کی شکست کا نوحہ ہیں۔ اسے یقین نہیں آتا کہ جو لوگ کبھی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ان کے شہر میں ابھی تک کوئی فساد نہیں ہوا لیکن اسے خوف ہے کہ یہ فسادات کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ فسادات کی آگ میں کوئی محفوظ نہیں رہے گا۔ یہ خوف اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔

یہ عبارت تقسیم ہند کے اس المیے کو سامنے لاتی ہے جس سے بے شمار لوگ متاثر ہوئے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم صرف جغرافیائی حدود میں تبدیلی نہیں تھی بلکہ یہ دلوں کے درمیان کھنچنے والی ایک لکیر تھی۔ یہ ایسی تقسیم تھی جس نے صدیوں پرانی رفاقت کو ختم کر دیا تھا۔

کریمن بوا کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگ جو سیاست اور اقتدار کی دوڑ سے دور تھے، وہ بھی کس قدر پریشان اور بے بس ہو گئے تھے۔ جو لوگ پُرامن زندگی چاہتے تھے وہ بھی نفرت کی آگ میں جھلسنے لگے تھے۔ جنھیں سیاست سے کوئی غرض نہ تھی وہ لوگ بھی سیاسی فیصلوں کا شکار ہو رہے تھے۔ کریمن بوا کی حالت بتاتی ہے کہ نفرت کی سیاست صرف ان لوگوں کو نہیں جلاتی جو اس کا پرچار کرتے ہیں، یہ آگ ان لوگوں کو بھی جھلسا دیتی ہے جو صرف امن چاہتے ہیں۔

یہ کون آگ لگانے پہ ہے یہاں مامور یہ کون شہر کو مقتل بنانے والا ہے (خورشید رہانی)

اس عبارت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آزادی صرف ایک ریاست بننے کا نام نہیں بلکہ یہ انسانوں کے جذبات، ان کی شناخت اور ان کی زندگیوں کو بدلنے کا عمل ہے۔ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو الگ ریاست تو مل گئی مگر اس کی قیمت بہت بھاری تھی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، ہزاروں بے گناہ مارے گئے اور ہزاروں لاپتہ ہو گئے۔ صدیوں سے قائم محبت لمحوں میں برباد ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے چچا، کریمن بوا اور دوسرے لوگ اس تبدیلی کو برداشت نہیں کر پا رہے۔ ان کے دل ٹوٹ چکے ہیں، ان کی امیدیں مر چکی ہیں اور وہ بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ اقتباس اپنے سادہ الفاظ اور مختصر بیانیے کے باوجود بہت گہرائی رکھتا ہے، یہ قاری کو وقت کے ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں ماضی کی محبت اور حال کی نفرت دونوں ساتھ نظر آتی ہیں، جہاں ایک طرف کریمن بوا کی آہیں سنائی دیتی ہیں اور دوسری طرف فسادیوں کے نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہ بیان صرف ماضی کی کہانی نہیں بلکہ ایک مسلسل چیخ ہے جو اہلِ درد کو آج بھی سنائی دیتی ہے۔

ہر ایک شاخ تھی لرزاں فضا میں چیخ و پکار ہوا کے ہاتھ میں اِک آب دار خنجر تھا (راہی فدائی)

عبارت نمبر 3

''کہاں ہوگا میرا شکیل؟''، بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں۔ ''تمھارا پاکستان بن گیا جمیل! تمھارے ابا کا ملک بھی آزاد ہو گیا، پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا؟'' ''سب ٹھیک ہو جائے گا اماں، وہ خیریت سے ہوگا۔ یہ فساد دو سات چار دن میں ختم ہو جائیں گے۔ جمیل بھیّا ان کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فق رہتا۔ شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آ گیا۔ انھوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجیے اور تیار رہیے۔

''بس ابھی تار دے دو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے؟'' مارے خوشی کے اماں کا منھ سرخ ہو رہا تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن چکا ہے۔ مسلم لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے ہیں اور آفت زدہ مہاجرین فسادات کا شکار ہیں۔ ہندوستان کا ہر فرد اس صورتِ حال سے پریشان ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ کے ماموں اپنی بہن کو اپنے ساتھ پاکستان چلنے کا کہتے ہیں، جس پر وہ رضامند بھی ہو جاتی ہے۔ اسے گھر کے تمام لوگ پاکستان جانے سے منع کرتے ہیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتی اور بڑے چچا سے بھی اُلجھ پڑتی ہے۔ عالیہ جمیل کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود اماں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ عالیہ چھت پر جاتی ہے، تھوڑی دیر بعد جمیل بھی اس کے پیچھے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ وہ عالیہ سے بہت سے سوال کرتے ہیں اور اسے جانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی۔ تھک ہار کر وہ چھٹی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں ایک گھر کا منظر دکھایا گیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ملک تقسیم ہو چکا ہے، پاکستان بن گیا ہے اور ہر طرف خوف، فسادات اور بے یقینی کی کیفیت طاری ہے۔ یہ منظر ایک ایسے گھر کا ہے جہاں لوگ برسوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں لیکن اب ان کے خیالات، ان کی وفاداریاں اور ان کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں۔ بڑی چچی کو اپنے

بیٹے شکیل کی فکر ہے جو لاپتہ ہے۔ انگریزوں کے جانے اور ملک تقسیم ہونے کے بعد ہر طرف ہنگامے برپا ہو گئے۔ بمبئی بھی ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جلنے لگا۔ ہر طرف سے لوگوں کے مرنے اور املاک کے ضائع ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ بڑی چچی کو سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں۔ اسے پاکستان بننے کی خوشی ہے نہ غم۔ اس سادہ گھریلو خاتون کو صرف اپنے لاپتہ بیٹے شکیل کی فکر ہے۔ بمبئی کے فسادات نے اس کی پریشانی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ چناں چہ وہ جمیل سے کہتی ہے۔ ''تمھارا ابا پاکستان بن گیا، تمھارے ابا کا ہندوستان بھی آزاد ہو گیا لیکن میرا شکیل کہاں ہے؟'' یہ سوال ایک ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہے۔ یہ ایک ماں کی فریاد ہے جس کا بیٹا کھو گیا ہے۔ جس ماں کا بیٹا گم ہو جائے، اس کے لیے ہر چیز بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس لیے بڑی چچی کو نہ پاکستان سے مطلب ہے نہ ہندوستان کی آزادی سے کوئی غرض، اسے صرف اپنے بیٹے شکیل کی سلامتی کی فکر ہے۔ اورنگ کا قول ہے:

''باپ بے اعتنائی کر سکتا ہے لیکن ماں کی محبت میں کبھی فتور نہیں پڑ سکتا۔''

اور بقول شاعر:

؎ رہتے ہیں میرے ساتھ فرشتے دعاؤں میں　　میں خوش نصیب ہوں کہ میری ماں حیات ہے

بڑی چچی کا یہ جملہ کہ ''تمھارا پاکستان بن گیا جمیل'' بھی غور طلب ہے۔ جمیل مسلم لیگ سے وابستہ نوجوان ہے۔ اس کی سوچ نئی نسل کی سوچ ہے۔ وہ سمجھتا ہے مسلمانوں کو ایک الگ ریاست کی ضرورت ہے جہاں وہ آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک ضروری ہے جہاں ان کی ثقافت، ان کا طرزِ زندگی اور ان کا مسلم تشخص محفوظ رہ سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے عملی طور پر مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کی، نعرے لگائے اور ایک نئے ملک کے لیے جدوجہد کی۔ اس کے لیے پاکستان بننا ایک خواب کی تعبیر ہے۔ اس لیے بڑی چچی جمیل سے کہتی ہے کہ تمھیں تو تمھارا مقصد حاصل ہو گیا۔ پاکستان بنے سے تمھیں تو خوشی مل گئی لیکن میرا تو سب کچھ لٹ گیا کیوں کہ میرا بیٹا مجھ سے دور ہو گیا ہے۔ تمھیں تمھارا پاکستان مل گیا۔ لیکن مجھ سے میرا شکیل چھن گیا ہے۔

؎ سُورج سرِ مژگاں ہے اندھیرے نہیں جاتے　　ایسے تو کبھی چھوڑ کے بیٹے نہیں جاتے　　(اسلم انصاری)

اسی جملے میں ایک دوسرا پہلو بھی شامل ہے کہ ''تمھارے ابا کا ملک بھی آزاد ہو گیا۔'' بڑے چچا جو جمیل کے والد ہیں، وہ کانگریس کے حامی تھے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ پورا ہندوستان ایک رہے۔ سب مل کر ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرائیں۔ متحد اور آزاد ہندوستان میں سب قومیں مل جل کر زندگی گزاریں۔ ان کا خواب پاکستان بنانا نہیں بلکہ ہندوستان کو متحد رکھنا تھا۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے حق میں لیکن تقسیم کے خلاف تھے۔ ان کے دل میں اس زمانے کی یادیں تازہ تھیں جب ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹتے تھے۔ بڑے چچا کے لیے ملک کی تقسیم ایک دکھ تھا۔ ایک شکست تھی۔ ملک کی تقسیم ان کے لیے ایک ایسی حقیقت تھی جسے وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ ملک کی تقسیم ان کے لیے ایک تکلیف دہ حقیقت تھی لیکن تسکین کی بات یہ تھی کہ انگریزوں کا راج ختم ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان سے رخصت ہو چکے تھے۔ بڑے چچا کا آزاد ہندوستان کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ اس لیے بڑی چچی کہتی ہیں کہ جمیل اور ان کے والد یعنی بڑے چچا کے خواب پورے ہو گئے۔ وہ خوش ہیں لیکن بیٹے کی جدائی میں غم سہنے والی ماں یعنی بڑی چچی کے لیے تسکین اور خوشی کا کوئی سامان نہیں کیوں کہ شکیل ابھی تک واپس نہیں آیا۔

؎ میں نے سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے　　تو نے جا کر تو جُدائی مری قسمت کر دی
(احمد ندیم قاسمی)

جمیل اپنی ماں کو تسلی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور شکیل بھی خیریت سے ہو گا۔ فسادات بھی چند دنوں میں ختم ہو جائیں گے اور پھر سے ملک میں امن و امان ہو جائے گا۔ وہ ماں کو تسلی دیتا ہے لیکن اس کے لہجے میں بے یقینی ہے اس لیے وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ ملکی حالات کی وجہ سے وہ خود بھی اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ جانتا ہے

کہ فسادات معمولی نوعیت کے نہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ شکیل کے واپس آنے کی کوئی ضمانت نہیں مگر ماں کو تسلی دینے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ اسے احساس ہے کہ ماں سارا دن اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے اور ہر آہٹ پر چونک جاتی ہے۔ ہر شام اس کے لیے ایک کرب لے کر آتی ہے۔ جمیل کے پاس بھی اسے دینے کے لیے جھوٹے دلاسوں کے سوا کچھ نہیں۔

؎ لے جائیں کہاں زخمِ جدائی کو اے فنا ہم　　یہ پھول کسی در پہ سجایا نہیں جاتا

شام کے وقت آنگن میں بیٹھے سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ سب کے چہروں پر اداسی اور خاموشی تھی۔ اس دوران میں عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ انھوں نے عالیہ کی ماں سے پوچھا کہ اگر وہ لوگ بھی جانا چاہیں تو فوراً اطلاع دیں اور پاکستان جانے کی تیاری کر لیں۔ عالیہ کی ماں یہ خبر سن کر پُرجوش ہو جاتی ہیں۔ وہ جمیل سے کہتی ہیں کہ فوراً تار دے دو۔ وہ کہتی ہیں کہ ''ہماری تیاری میں کیا لگے گا، ہم تو تیار بیٹھے ہیں۔ اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے؟'' خوشی سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ وہ بمبئی کے فسادات سے خوف زدہ تھیں۔ بھائی کے خط سے انھیں تسلی ہوئی کہ ان کا بھی کوئی سہارا ہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ نئی مملکت یعنی پاکستان میں جا کر شاید وہ اور ان کی بیٹی عالیہ بہتر زندگی گزار سکیں۔

اس عبارت میں درد کی گہرائی، سیاسی تقسیم، خاندانی کشمکش اور انسانی جذبات کو خوب صورت طریقے سے دکھایا گیا ہے۔ اس میں ایک گھر کا منظر دکھا کر پوری قوم کی حالت بتائی گئی ہے۔ ایک طرف ایک ماں ہے جو اپنے بیٹے کے غم میں نڈھال ہے۔ دوسری طرف جمیل ہے جو ایک نئے ملک کے خواب میں الجھا ہوا ہے۔ تیسری طرف بڑے چچا ہیں جو بکھرے ہوئے ہندوستان میں پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ عالیہ کی ماں ہے جو اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کی خاطر نئے ملک میں جانے کے لیے پُرجوش ہے۔ ان سب کے درمیان میں عالیہ ہے جو سب کو دیکھتی ہے، سب محسوس کرتی ہے اور خاموشی سے سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

عبارت نمبر 4

جمیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فسادی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں: ''مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔'' انھوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا، کیسی سفارشی نظریں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ''میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہو گی، پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی، واہ۔'' مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔ ''عالیہ جانے پر راضی نہیں ہو گی چھوٹی چچی، وہ نہیں جائے گی، وہ جا ہی نہیں سکتی۔'' جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا: ''تم اچھے حق دار آ گئے، کون نہیں جائے گا؟'' اماں ایک دم بپھر اٹھیں۔ ''تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟'' ''ضرور جائیے چھوٹی چچی۔'' جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہل بھی نہ سکے گی۔ ''میں ابھی تار کیے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔'' جمیل بھیا اٹھ کر باہر چلے گئے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ بتاتی ہیں کہ پاکستان بن گیا اور مسلم لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت پہنچ چکے ہیں۔ لیکن لوگ فسادات کا شکار ہو گئے اور تقسیمِ ہند کی خبر نے انھیں اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا عالیہ کی اماں نے بھی اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ بتاتی ہیں کہ گھر کے تمام افراد عالیہ کی اماں کو پاکستان جانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کی نہیں سنتی اور بڑے چچا سے بھی الجھ پڑتی ہے۔ عالیہ جمیل کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود اپنی اماں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ عالیہ چھت پر جاتی ہے جمیل بھی اس کے پیچھے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ وہ عالیہ سے بہت سے سوال کرتے ہیں اور اسے جانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

اس عبارت میں اُس واقعہ کا بیان ہے جب عالیہ کی ماں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ عالیہ کے ماموں نے خط بھیجا تھا کہ انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کردی ہیں اور وہ کراچی جارہے ہیں۔ انھوں نے عالیہ کی ماں سے کہا تھا کہ اگر وہ لوگ بھی جانا چاہیں تو اطلاع کردیں اور تیار رہیں۔ اماں نے جمیل سے کہا کہ وہ ابھی تار دے کر اطلاع کردے۔ اماں کے پاکستان جانے کے فیصلے سے گھر کا ہر فرد متاثر ہوا۔ اس فیصلے سے جمیل، خاص طور پر بے حد پریشان اور بے چین ہوگیا۔ جمیل اپنے دل میں عالیہ کے لیے محبت بھرے جذبات رکھتا تھا اس لیے وہ عالیہ کو روکنا چاہتا تھا۔ عالیہ کے پاکستان جانے کی خبر اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

تمھارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے　　تمھارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا　　(بشیر بدر)

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ بتاتی ہیں کہ چچی اور عالیہ کے پاکستان جانے کی خبر سن کر جمیل بھیا گھبرا گئے کیوں کہ وہ عالیہ سے محبت کرتے تھے۔ اس لیے انھیں یوں لگا جیسے وہ بھی فسادات کی زد میں آگئے ہیں۔ نیز انھوں نے اسی اضطرابی کیفیت میں اپنی چچی سے کہا کہ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کردوں گا۔ جمیل بھیا نے سفارشی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی اماں کو پاکستان جانے سے روک لے۔ لیکن اس نے نظریں جھکا کر یہ ظاہر کیا کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ جمیل کے بے حد اصرار پر بھی چچی نہیں مانی اور کہنے لگی کہ: **"میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہوگی، پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی، واہ۔"**

مصنفہ نے اس عہد کے گھریلو تصادم اور ذہنی کش مکش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تقسیم کا فیصلہ ہوتے ہی عالیہ کی اماں کو ہندوستان بے گانہ محسوس ہونے لگا۔ وہی ہندوستان جہاں اس کے آباؤ اجداد برسوں سے رہ رہے تھے، اب وہاں سب کچھ پرایا ہوگیا تھا۔ ہندوستان کی بجائے اب مسلمانوں کو پاکستان اپنا وطن لگ رہا تھا۔ جس کی بڑی وجہ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات تھے۔ عالیہ کی اماں کا بھی یہی خیال تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے۔ کیوں کہ وہاں مسلمانوں کی حکومت ہوگی اور وہاں تمام لوگ امن وسکون سے زندگی گزاریں گے۔ اس لیے وہ پاکستان جانے پر رضامند تھیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے عورت کے جذباتی پن کو بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ خود سے جُڑے رشتوں کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عالیہ کی اَماں اپنے بھائی کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور وہ اس کے ساتھ پاکستان جانا چاہتی تھی۔

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنفہ کہتی ہیں کہ جمیل بھیا نے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر چچی سے کہا کہ عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی، وہ نہیں جاسکتی۔ جس پر اس کی چچی نے جواب دیا کہ تم کون ہوتے ہو حق جتانے والے اور روکنے والے۔ ان جملوں سے جمیل بھیا کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور انھیں یقین ہوگیا کہ وہ انھیں پاکستان جانے سے نہیں روک سکتے۔ اس لیے جمیل بھیا نے چچی سے کہا کہ آپ ضرور پاکستان جائیں۔ لیکن جمیل کی باتیں سن کر عالیہ کو احساس ہوا کہ وہ ان کی بات کی پابند ہے۔ اگرچہ عالیہ بھی جمیل سے محبت کرتی تھی لیکن کبھی اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اماں کے فیصلے اور تقسیم کے واقعہ نے اسے مجبور کردیا کہ وہ ہندوستان، بڑی چچی، یہ آنگن اور جمیل کو چھوڑ کر چلی جائے جب کہ وہ انھیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی لیکن حالات نے اسے مجبور کردیا تھا۔ بقول شاعر:

وحشتیں، عشق اور مجبوری　　کیا کسی خاص امتحان میں ہوں　　(خورشید ربانی)

اپنے گھر، اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ اپنے گھر کے در و دیوار سے بچھڑتے ہُوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ لیکن تقسیمِ ہندوستان نے نہ معلوم کتنے لوگوں کو اپنے وطن میں بے وطن اور اپنے ہی گھر میں بے گھر کردیا۔ عالیہ کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جاسکتی۔ اُسے کوئی نہیں لے جاسکتا لیکن اس کے لب خاموش تھے۔

آزادیوں کے شوق و ہوس نے ہمیں عدیلؔ　　اِک اجنبی زمین کا قیدی بنا دیا　　(عدیل زیدی)

نیز جمیل بھیا ان تمام حالات سے راہِ فرار حاصل کرنے اور عالیہ کے ماموں کو پیغام بھیجنے کے لیے گھر سے باہر نکل گئے۔

دراصل تشریح طلب عبارت میں مصنفہ نے تقسیم کے نتیجے میں بکھرنے والے آنگن کو پیش کیا ہے۔

اس عبارت میں مصنفہ نے کرداروں کے جذبات اور ان کی کیفیتوں کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں جمیل کی کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات کی سنگینی میں محبت اور عزم کو برقرار رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ جمیل اور عالیہ کی ماں کے درمیان مکالمے کے ذریعے ان کرداروں کی داخلی کشمکش کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کی نفسیات کی گہرائی کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس عبارت سے نظر آتا ہے کہ عالیہ کی ماں کا پاکستان جانے کا فیصلہ صرف ہجرت کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک خاندان اور ایک نسل کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا فیصلہ تھا۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس کا اثر بہت گہرا اور دیرپا محسوس ہونے والا تھا۔

بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

عبارت نمبر 5

"عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جاسکتی، اسے کوئی نہیں لے جاسکتا، مگر اس کے گلے میں تو سیکڑوں کانٹے چبھ رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں مگر وہ کیوں رکے، کس لیے، کس کے لیے، اس نے سوچا اور پھر جیسے بڑے سکون سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں تو ہمیشہ کے لیے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن چکا ہے۔ مسلم لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جاچکے ہیں اور آفت زدہ مہاجرین فسادات کا شکار ہیں۔ ہر شخص اپنے تئیں پریشان ہے۔ عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور وہ اپنی بہن کو اپنے ساتھ پاکستان چلنے کو کہتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ بڑی چچی عالیہ کی اماں کو پاکستان جانے سے روکتی ہے لیکن وہ جانے کے لیے بضد ہیں۔ جمیل گھر آکر کہتا ہے کہ وہ ماموں کو تار کر آیا ہے۔ اماں کو سب پاکستان جانے سے روکتے ہیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتی اور بڑے چچا سے بھی اُلجھ پڑتی ہیں۔ عالیہ جمیل کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود اماں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ وہ ان تمام حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے شکستہ دل ہوکر اوپر چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل بھیا بھی اس کے پیچھے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ وہ نیم دیوانگی میں عالیہ سے متعدد سوالات کرتے ہیں اور اسے جانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں۔ آخر وہ چھمی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ نے عالیہ کی دلی کیفیت اور جذباتی کشمکش کو نہایت دردمندی سے پیش کیا ہے۔ جمیل نے عالیہ کی ماں کو اپنا فیصلہ بدلنے کو کہا تھا۔ اس نے عالیہ کو جس طرح پاکستان جانے سے روکنے کی بات کی تھی اس سے جمیل کی عالیہ سے محبت نظر آتی تھی۔ عالیہ اس سے بہت متاثر ہوئی لیکن ماں کے فیصلے سے وہ ایک الجھن کا شکار تھی۔ عالیہ کے دل میں قیامت برپا تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی، اپنے ارادے کا اعلان کرنا چاہتی تھی مگر حالات کا جبر اسے بولنے نہیں دیتا تھا۔ ماحول کی گھٹن نے اس کی آواز چھین لی تھی، اس کے اندر دو قوتیں ٹکرا رہی تھیں: ایک یہ کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر چلی جائے، جب کہ دوسری اسے رکنے پر مجبور کرتی

تھی۔ عالیہ کی یہی داخلی کشمکش اس اقتباس کا خوب صورت رنگ ہے۔

؎ ہائے رے مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں (جگر مرادآبادی)

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ کہتی ہیں کہ اماں کے پاکستان جانے کے فیصلے پر عالیہ خوش نہ تھی۔ عالیہ بڑے چچا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ بڑے چچا میں عالیہ کو اپنے مرحوم والد نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی اماں کو بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ ان کا اکلوتا سہارا تھی۔ جمیل کی محبت اس کے پیروں کی زنجیر بن گئی تھی۔ عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جاسکتی۔ اسے کوئی نہیں لے کر جاسکتا۔ وہ جمیل سے محبت کرتی ہے اور وہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ انھیں اس نیم دیوانگی کے عالم میں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاسکتی۔ یہ اس کا آنگن ہے۔ اپنا گھر ہے۔ یہ اسے آخر کیسے چھوڑ کر جاسکتی ہے۔ مگر وہ اپنے جذبات بیان کرنے سے قاصر تھی۔ اس کا دل شکست و ریخت کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک ناقابلِ بیان کیفیت سے گزر رہی تھی۔ جسے وہ کسی کو نہیں بتاسکتی تھی۔ کیوں کہ نہ تو وہ اپنی اماں کی ناراضی جھیل سکتی تھی اور نہ ہی انھیں پاکستان میں اکیلا چھوڑ کر جمیل سے شادی کر کے ہمیشہ ہندوستان میں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا وہ دوہری اذیت کا شکار تھی۔ اتنی اذیت سے دوچار ہونے کے باوجود بھی وہ خاموش تھی۔ اس کے ذہن میں خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے لیکن وہ زبان سے کچھ ادا نہیں کرتی۔ بقول شاعر:

؎ اظہارِ حال کا بھی ذریعہ نہیں رہا دل اتنا جل گیا ہے کہ آنکھوں میں نم نہیں (اسماعیل میرٹھی)

مصنفہ مزید بتاتی ہیں کہ عالیہ اپنے چاروں طرف دیکھتی ہے اور سوچتی ہے کہ وہ آخر کس کے لیے رُکے۔ اماں کے جانے کے بعد اس آنگن میں کون اس کا اپنا رہ جائے گا۔ جمیل جو اس سے محبت تو کرتے ہیں اور وہ بھی ان سے محبت کرتی ہے، لیکن ان کی اُکھڑی اُکھڑی طبیعت کی وجہ سے اسے ان کی محبت پر کبھی یقین نہیں آیا۔ شاید عالیہ انھیں ایک سر پھرا انسان سمجھتی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے رکنا اور اپنی اماں کو اکیلا چھوڑ دینا اس نے گوارا نہیں کیا۔ یہ سوچ کر اس نے خود کو مطمئن کرلیا اور بڑے اطمینان سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ وہ یہ سوچتی ہے کہ اگر وہ ہندوستان میں رک گئی تو اس کا یہ فیصلہ سازگار نہ ہوگا اور یہ نہ ہو کہ وہ جمیل کی محبت کی دلدل میں دھنستی چلی جائے۔ لہٰذا یہاں سے رخصت ہونا ہی بہتر ہے۔ بقول پروین شاکر:

؎ وقتِ رخصت آگیا دل پھر بھی گھبرایا نہیں اس کو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں

اس عبارت میں مصنفہ نے نسوانی جذبات کو نہایت باریکی اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ عالیہ کی خاموشی محض الفاظ کی کمی نہیں بلکہ حالات کے جبر اور معاشرتی روایت کی آئینہ دار ہے۔ مصنفہ کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عالیہ کے دکھ کو کسی چیخ یا فریاد کے بغیر بھرپور انداز میں ظاہر کیا ہے۔

عالیہ کی خاموشی صرف ایک فرد کی خاموشی نہیں بلکہ اس عہد کے بے شمار انسانوں کے کرب کا عکس ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بے شمار انسانوں کو زمینوں، رشتوں اور ان کی شناخت سے کاٹا جارہا تھا۔ اس المناک پس منظر میں عالیہ کی اندرونی کشمکش ایک بکھرتے خاندان کے درد کی پکار ہے۔ مصنفہ نے اس درد کو بڑی مہارت سے لفظوں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

عبارت نمبر 6

کریمن بوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو۔۔۔۔" اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کریمن بوا آج تو ڈائنوں کی طرح چیخنے لگیں۔ "ارے کوئی تو اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔ سب چلے گئے سب چلے جائیں گے مگر یہ کہیں نہیں جاتا۔" بیٹھک میں اسرار میاں کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دُلھن؟" بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی چچی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔" اماں نے رُکھائی سے جواب دیا۔

"یہ گھر تمھارا ہے چھوٹی دلھن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو۔" بڑی چچی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کرلیں، شاید وہ تنہائی کے بھوت سے ڈر

رہی تھیں۔ عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اوپر بھاگ گئی۔ دھوپ پیلی پڑ کر سامنے کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل شور مچائے جارہے تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن چکا ہے۔ مسلم لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جاچکے ہیں اور آفت زدہ مہاجرین فسادات کا شکار ہیں۔ انھیں حالات میں عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور وہ انھیں اپنے ساتھ پاکستان چلنے کو کہتے ہیں جس پر عالیہ کی اماں رضامند ہوجاتی ہے لیکن ان کے اس فیصلے سے جمیل بھیا اداس ہوجاتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ سب عالیہ کی اماں کو پاکستان جانے سے روکتے ہیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتیں اور بڑے چچا سے بھی اُلجھ پڑتی ہیں۔ عالیہ جمیل کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود اماں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ وہ ان حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل بھی اس کے پیچھے چھت پر چلا جاتا ہے۔ وہ نیم دیوانگی کے عالم میں عالیہ سے بہت سے سوالات کرتا ہے اور اسے جانے سے منع کرتا ہے۔ لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں ایک ایسا منظر دکھایا گیا ہے جہاں ہر کردار اپنی اُلجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ اس میں پاکستان بننے کے بعد پورے خاندان کے اندر جاری تناؤ اور ان کی جذباتی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ شام کے وقت سب لوگ چائے پی رہے ہیں۔ اسرار میاں جو بڑے چچا کے سوتیلے بھائی ہیں کریمن بوا سے چائے مانگتے ہیں۔ کریمن بوا اس گھر کی پرانی نوکرانی ہے۔ وہ اپنے رویے سے اسرار میاں کے ساتھ ایک عجیب سی تلخی اور حقارت دکھاتی ہے۔ وہ اسرار میاں کو ہمیشہ گھٹیا انداز میں دیکھتی ہے اور اس کا رویہ اتنا تیکھا ہوتا ہے کہ وہ انھیں ڈائنوں کی طرح ڈانٹتی ہے۔ کریمن بوا کا رویہ آج کچھ زیادہ سخت تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عالیہ اور اس کی ماں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کریمن بوا اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی اور اس نے پورے خاندان کو اسی گھر میں مل جل کر رہتے دیکھا تھا۔ شادی کے بعد اگرچہ عالیہ کا باپ الگ گھر میں رہنے لگا تھا لیکن اس کی وفات کے بعد عالیہ اور اس کی ماں دوبارہ اسی گھر میں آگئے تھے۔ اب پاکستان بن چکا تھا اور عالیہ کی ماں نے کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس لیے بکھرتے ہوئے خاندان کو دیکھنا کریمن بوا کے لیے تکلیف دہ امر تھا۔ وہ اپنے دکھ اور غصے کا اظہار اسرار میاں کے ساتھ تلخ رویے کے ذریعے کر رہی تھی۔

اسرار میاں کے ساتھ کریمن بوا کی تلخی اور حقارت کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ اسرار میاں، بڑے چچا کے سوتیلے بھائی ہیں۔ بڑے چچا کے والد نے پہلی بیوی کی موجودگی میں ہی ایک اور شادی کرلی تھی۔ اسرار میاں ان کی دوسری بیوی سے پیدا ہوئے تھے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اسرار میاں بڑے چچا کے ساتھ رہ رہے تھے۔ بڑے چچا کے والد کی دوسری بیوی کو خاندان نے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے اسرار میاں کے ساتھ سب کا رویہ مختلف تھا۔ کریمن بوا چوں کہ اس گھر کی پرانی نمک خوار تھی، اس لیے وہ اسرار میاں کو حقیر سمجھنے میں دو ہاتھ آگے تھی۔ خاندان اور خاص طور پر کریمن بوا کا یہ تلخ رویہ اس سماجی روایت کی عکاسی کرتا ہے جہاں کسی دوسری شادی کی وجہ سے آیا ہوا بچہ ہمیشہ متنازعہ اور ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔

؎ اسی لیے تو یہاں اب بھی اجنبی ہُوں میں تمام لوگ فرشتے ہیں آدمی ہوں میں (بشیر بدر)

دوسری طرف اسرار میاں کو بھی خاندان میں اپنی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہے۔ اس لیے وہ ایک تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا ٹھکانہ گھر کی بیٹھک ہے۔ انھوں نے کبھی گھر کے آنگن میں قدم نہیں رکھا۔ وہ جب بھی بیٹھک میں آتے ہیں، ان کی موجودگی کو اجنبیوں کی طرح محسوس کیا جاتا ہے۔ ان کے لیے یہ گھر کبھی مکمل طور پر "اپنا" نہیں بن سکا۔

انھیں ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کو کھانا ہمیشہ تب ملتا ہے جب سب گھر والے پیٹ بھر کر کھا چکے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ جب کریمن بوا سے چائے مانگتے ہیں تو کہتے ہیں:

''کریمن بوا! اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو۔۔۔۔۔''

کریمن بوا کے رویے میں آج سخت مایوسی اور کرب دکھائی دیتا ہے۔ اسرار میاں کو کوستے ہوئے وہ کہتی ہے: ''ارے کوئی اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔ سب چلے گئے، سب چلے جائیں گے مگر یہ کہیں نہیں جاتا۔'' اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کریمن بوا، عالیہ کی ماں کے پاکستان جانے کے فیصلے سے دُکھی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ عالیہ اور اس کی ماں خاندان اور پرانے گھر کو چھوڑ کر پاکستان جائیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے کہنے سے عالیہ کی ماں اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کریں گی۔ چناں چہ وہ اپنا سارا غصہ اسرار میاں کو ڈانٹ کر نکال رہی ہے۔

بڑی چچی عالیہ کی ماں کے فیصلے سے آگاہ ہیں اور وہ بھی انھیں پاکستان جانے سے روکنا چاہتی ہیں۔ وہ بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ بڑی لجاجت سے عالیہ کی ماں سے پوچھتی ہیں: ''کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلھن؟'' بڑی چچی کے لہجے سے مایوسی جھلکتی ہے۔ وہ اپنے شوہر اور اپنے بیٹے جمیل میاں کے سیاسی نظریات کی وجہ سے مفلوج ہو چکی تھی۔ دونوں باپ بیٹا اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے ایک دوسرے سے الجھتے رہتے تھے۔ ان کے درمیان اختلاف کی ایک خلیج حائل ہو گئی تھی۔ بڑی چچی کو اپنے بیٹے شکیل کے لاپتہ ہونے کا بھی دکھ ہے۔ ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے وہ پُر نہیں کر پا رہیں۔ وہ زندگی میں ایک نئی روشنی کی متلاشی ہیں لیکن ان کی توقعات اور حقیقت کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ ان کا دل کبھی اپنے بیٹے کی جدائی میں تڑپتا ہے اور کبھی خاندان کے بکھرنے پر روتا ہے۔ گھر کے اندر اور باہر کے حالات اسے کوئی خوشی کی خبر نہیں دے رہے۔ وہ چاہتی ہے کہ عالیہ اور اس کی ماں پاکستان نہ جائیں لیکن عالیہ کی ماں کا رویہ بہت عجیب اور روکھا ہے۔ بڑی چچی کے سوال کے جواب میں وہ بڑی بے اعتنائی سے جواب دیتی ہیں: ''ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔'' ان کے اس جواب سے بڑی چچی کو شدید تکلیف ہوئی۔ انھوں نے بڑی لجاحت سے کہا'' یہ گھر تمھارا ہے چھوٹی دلھن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو۔'' بڑی چچی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انھوں نے ضبط کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑی چچی کو تنہائی کا احساس خوف زدہ کر رہا ہے۔ وہ شدید اُلجھن اور بے بسی کی کیفیت میں ہیں۔

اس عبارت میں عالیہ کی ماں کا کردار بھی بہت عجیب نظر آتا ہے۔ عالیہ کی ماں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد بڑے چچا کے پاس رہ رہی ہیں۔ بڑے چچا اور ان کا خاندان ان کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن عالیہ کی ماں کے مزاج میں ناشکری کی جھلک نظر آتی ہے۔ جب ان کے بھائی نے انھیں پاکستان جانے کی دعوت دی تو ان کا رویہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ بڑے چچا اور ان کے خاندان کے احسانات کو فراموش کر کے فوراً ان کے ساتھ پاکستان جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

عالیہ ان سب حالات کو دیکھتی ہے اور پورے منظر کو اپنے دل میں سمیٹ لیتی ہے۔ وہ ان حالات سے خوش نہیں لیکن انھیں بدل بھی نہیں سکتی۔ وہ ان حالات سے فرار چاہتی ہے اور پناہ ڈھونڈنے کے لیے اوپر بھاگ جاتی ہے۔ سورج ڈھل رہا ہے اور دھوپ پیلی پڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک غم ہے اور وہ پناہ کی تلاش میں ہے۔ وہ اس ماحول کی تنگی اور اداسی کی قید سے نکلنا چاہتی ہے۔ سامنے ہائی سکول کے احاطے میں پرندے شور مچا رہے ہیں۔ اس شور میں اسے ایک گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے (افتخار عارف)

اس عبارت میں نظر آنے والا منظر ایک خاندان کی پریشانیوں اور ٹوٹتے رشتوں کے کرب کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں ایک ایسا خاندان نظر آتا ہے جو اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ، اپنے جذباتی خلا اور اپنے سیاسی نظریات کے درمیان پھنس چکا ہے۔ ہر کوئی ان حالات سے فرار چاہتا ہے لیکن کسی کے بس میں کچھ نہیں۔

عبارت نمبر 7

کھلی فضا میں آ کر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی کہ اب آگے کیا ہوگا، شاید اچھا ہی ہو، وہ یہاں سے جا کر ضرور خوش رہے گی۔ جب وہ نیچے اتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے، صرف کریمن بوا جانے کس بات پر بڑبڑا رہی تھیں اور پھرتی سے روٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔ جمیل کہاں گئے، اب تک کیوں نہیں آئے، عالیہ نے سُونی کرسی کی طرف دیکھا۔ جانے یہ سر پھرا آدمی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ لالٹین کی بتی خراب تھی اس لیے اس میں سے دو لویں اُٹھ رہی تھیں اور ایک طرف سے چمنی سیاہ ہو گئی تھی۔ مدھم روشنی میں بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا اور مسلم لیگی راہ نما پاکستان چلے گئے۔ لیکن لوگ فسادات میں گھرے ہوئے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ انھی حالات میں عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور وہ انھیں پاکستان چلنے کا کہتے ہیں۔ جمیل عالیہ کی محبت میں چچی کو پاکستان جانے سے روکتا ہے جس پر وہ جمیل اور باقی گھر والوں سے ہی الجھ پڑتی ہیں۔ عالیہ ان تمام حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ کی اماں بڑے چچا سے اُلجھ پڑتی ہیں۔ جس کی وجہ سے عالیہ کھانا چھوڑ کر بڑے چچا کے پاس جاتی ہے اور وہ اسے یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس کی حکومت آتے ہی تمام معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ عالیہ بیٹھک سے اٹھ کر چھت پر چلی جاتی ہے اور کچھ دیر بعد جمیل بھی اس کے پیچھے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ وہ اسے پاکستان جانے سے روکتے ہیں۔ لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ، عالیہ کی ذہنی اور جذباتی حالت کی عکاسی کرتی ہے۔ عالیہ اپنی زندگی کی ایک بڑی تبدیلی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ پاکستان جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس موقع پر اس کے ذہن میں جو خیالات آ رہے ہیں، وہ اس کی داخلی کیفیت اور اس وقت کے پورے ماحول کی غیر یقینی صورتِ حال کو آشکار کر رہے ہیں۔

عجب اِک بے یقینی کی فضا ہے یہاں ہونا نہ ہونا ایک سا ہے (صابر ظفر)

شام کی چائے پر بڑی چچی نے جب عالیہ کی ماں سے پوچھا تھا کہ کیا وہ واقعی پاکستان جا رہی ہیں تو عالیہ کی ماں نے بڑی رکھائی سے جواب دیا تھا کہ وہ پاکستان جا رہی ہیں۔ بڑی چچی نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن عالیہ کی ماں نہیں مانیں۔ جس کی وجہ سے پورے ماحول پر ایک اداسی چھا گئی تھی۔ اس ماحول کی گھٹن سے تنگ آ کر عالیہ چھت پر چلی گئی۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور سکول کے صحن میں پرندے شور مچا رہے تھے۔ عالیہ چھت پر ٹہلتے ہوئے سوچتی ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ اس کے ذہن میں پاکستان جانے کا خیال مختلف سوالات اور توقعات کو جنم دے رہا ہے۔ اسے اچھے مستقبل کی امید بھی ہے مگر اس کے ساتھ ایک تشویش بھی ہے۔ وہ بھی سوچتی ہے کہ شاید وہاں جا کر وہ زیادہ خوش رہ سکے گی لیکن اسے یہاں کی زندگی سے بھی ایک دلی لگاؤ ہے۔

حسرت دِل نامکمل ہے کتابِ زندگی جوڑ دے ماضی کے سب اوراق مستقبل کے ساتھ (فگار انادی)

کافی دیر ٹہلنے کے بعد جب وہ نیچے اتری تو آنگن میں سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے۔ کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف کریمن بوا بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پھرتی سے روٹیاں بھی پکا رہی تھی۔ عالیہ نے دیکھا

کہ جمیل کی کرسی سونی پڑی تھی۔ وہ خود ابھی تک گھر واپس نہیں آئے تھے۔ جمیل کی غیر موجودگی میں ان کی خاص کرسی سونی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سوچتی ہے کہ جب وہ پاکستان چلی جائے گی تو پتہ نہیں جمیل اسے یاد کریں گے یا بھول جائیں گے؟ وہ جمیل کے ساتھ جڑے ہوئے احساسات میں گم ہے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتی ہے اور اس کا جواب جاننا چاہتی ہے۔ لیکن اس سوال سے اس کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے　　اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم)

اس صورتِ حال سے عالیہ کی ذہنی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کو چھوڑ کر ایک نئے مقام پر جانے کی تیاری کر رہی ہے لیکن اس کے اندر کا خوف اسے بے یقینی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ اپنے تعلقات کو پرکھنے کی کوشش کرتی ہے، اسے اس گھر سے اور اس میں رہنے والوں سے انس ہے۔ وہ اس گھر کے در و دیوار سے محبت کرتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کیا پاکستان جا کر وہ اس گھر کی یادوں کو بھلا پائے گی۔ جمیل کی خالی کرسی کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ کیا جمیل بھی اسے یاد رکھیں گے یا بھول جائیں گے۔

لالٹین کی بتی خراب تھی۔ اس سے دو لویں اٹھ رہی تھیں جس کی وجہ سے روشنی کم اور دھواں زیادہ تھا۔ دھویں کی وجہ سے ایک طرف سے چمنی بھی سیاہ ہو گئی تھی۔ چمنی سیاہ ہونے سے روشنی مدھم ہو گئی تھی اور بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔ یہاں لالٹین ایک علامت ہے۔ لالٹین روشنی دیتی ہے جو امید اور خوشی کی علامت ہے۔ اس وقت لالٹین کی روشنی مدھم ہے کیوں کہ اس کی بتی خراب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول میں امید اور خوشی کم اور غم کا اثر زیادہ ہے۔ ملکی حالات کے زیرِ اثر اس گھر کے حالات بھی خراب ہیں۔ یہاں امید کی روشنی کی بجائے غم اور اداسی کی تاریکی چھائی ہے۔ اس نیم تاریک ماحول میں بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بھی بگڑے سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے چہروں سے، ان کے اندر کا غم اور مایوسی نظر آ رہی ہے۔ حالات کا سب سے زیادہ اثر ان کے چہروں پر نظر آ رہا ہے۔ ان سب حالات میں وہی سب سے زیادہ مجبور اور بے بس دکھائی دیتی ہیں۔ کریمن بوا اسرار کے معاملے میں ہمیشہ سے چڑچڑی اور بداخلاق تھیں لیکن ان حالات نے انھیں اور زیادہ تلخ بنا دیا ہے۔

بڑی چچی کا چہرہ بھی لالٹین کی مدھم روشنی میں بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے شکیل کے لیے پریشان ہیں کیوں کہ شہر میں فسادات برپا ہیں اور شکیل کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ اسے اس بات کا بھی دکھ ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کی تشکیل کے بعد ان کے حالات نہیں بدلے۔ وہ زیادہ خراب حالات کا شکار ہو چکے ہیں۔ چھوٹی دلھن کا پاکستان جانے کا فیصلہ بھی ان کی مایوسی اور تکلیف میں اضافہ کرتا ہے۔ انھیں تنہا رہ جانے کا احساس بھی ستا رہا ہے۔ اس لیے ان کے اندر کا غم اور ناامیدی ان کے چہرے سے نمایاں ہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی اور چہروں کا بگاڑ دراصل امید کی کمی اور حالات کی سنگینی کو ظاہر کرتے ہیں۔

عالیہ اس سارے منظر کو دیکھتی اور اس کی سنگینی کو محسوس کرتی ہے۔ وہ اس ماحول سے متاثر بھی ہوتی ہے لیکن وہ اس میں تبدیلی نہیں لا سکتی۔ اس سارے منظر میں ہر شخص اپنی جگہ مجبور اور بے بس ہے۔ ہر شخص حالات کے ہاتھوں مجبور ہے اور بے بسی سے یہ جبر سہنے کے لیے تیار ہے۔ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن سب ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مگن ہے لیکن سب کو بے یقینی اور مایوسی کا سامنا ہے۔

عبارت نمبر 8

جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''میں تار کر آیا ہوں چھوٹی چچی!'' انھوں نے دھیرے سے کہا۔ ''تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آ جایا کرو، جانے کب یہاں بھی گڑبڑ ہو جائے۔'' بڑی چچی نے کہا۔

''رہنا تو پڑتا ہے، مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں، ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پرامن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا۔'' ''تو بہ اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا، تم نے تار پر پتا ٹھیک لکھا تھا ناں؟'' اماں نے پوچھا۔ ''آپ اطمینان رکھیں، پتا ٹھیک تھا۔'' ''خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں، کیا بری حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو۔'' اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا اور مسلم لیگی راہ نما پاکستان چلے گئے۔ لیکن لوگ فسادات میں گھرے ہوئے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ انھی حالات میں عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور وہ انھیں اپنے ساتھ پاکستان چلنے کا کہتے ہیں۔ جمیل عالیہ کی محبت میں چچی کو پاکستان جانے سے روکتا ہے جس پر وہ جمیل اور باقی گھر والوں سے ہی الجھ پڑتی ہیں۔ عالیہ ان تمام حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ کی اماں بڑے چچا سے اُلجھ پڑتی ہیں۔ جس کی وجہ سے عالیہ کھانا چھوڑ کر بڑے چچا کے پاس جاتی ہے اور وہ اسے یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس کی حکومت آتے ہی تمام معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ عالیہ بینچک سے اٹھ کر چھت پر چلی جاتی ہے اور کچھ دیر بعد جمیل بھی اس کے پیچھے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ وہ اسے پاکستان جانے سے روکتے ہیں۔ لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

جمیل بھیا، عالیہ کے ماموں کو تار دینے گئے ہوئے تھے۔ عالیہ کی ماں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا اور تار کے ذریعے اس کی اطلاع اپنے بھائی کو بھجوائی تھی۔ تار دے کر جمیل گھر واپس آیا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دھیرے سے چھوٹی چچی یعنی عالیہ کی ماں کو بتایا کہ وہ تار کر آیا ہے۔ عالیہ کی ماں کو خوشی تھی کہ ان کا بھائی ان کا سہارا ہے اور اب وہ پاکستان میں اپنے بھائی کے پاس رہیں گی۔

بڑی چچی فسادات کی وجہ سے خوف زدہ تھیں۔ انھوں نے جمیل سے کہا کہ وہ اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرے۔ وہ شام ہوتے ہی گھر آ جایا کرے۔ ہر طرف فسادات ہیں، پتہ نہیں کب یہاں بھی حالات خراب ہو جائیں۔ ان کے لہجے میں وہی خوف تھا جو اس وقت ہر ماں کے دل میں بس گیا تھا۔ آزادی کے بعد جو کچھ ہوا وہ خوشی سے زیادہ دکھ اور پریشانی لے کر آیا تھا۔ لوگوں کو توقع تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سب مل جل کر اپنے وطن کی ترقی کے لیے کام کریں گے لیکن ہر طرف ہندو مستانیوں کا خون بہنے لگا۔ صدیوں سے اکٹھے رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ فسادات، خون ریزی، مذہبی جنون وغیرہ نے ہر گھر کا سکون چھین لیا تھا۔ بڑی چچی بھی اس خوف میں مبتلا تھیں کہ کہیں ان کا بیٹا بھی فسادات کی زد میں نہ آ جائے۔

جمیل نے اپنی ماں کی بات کو تحمل سے سنا اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس نے ماں سے کہا کہ مسلمان ڈرے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ہندو انھیں ظلم کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اب ہمارا فرض ہے کہ مسلمانوں کو حوصلہ دیں اور انھیں سمجھائیں کہ وہ یہاں ڈٹ کر رہیں۔ وہ فساد کرنے والوں کا مقابلہ کریں لیکن یہاں کی فضا کو پُرامن رکھیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں گھر سے نکلنا پڑے گا اور لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھر میں بیٹھ کر تو کام نہیں چلے گا۔

جمیل ایک پرعزم نوجوان ہے، اس کے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ایک سیاسی کارکن ہے۔ اس نے

سیاست میں صرف نعرے نہیں لگائے تھے بلکہ آزادی کے لیے عملی کام بھی کیا تھا۔ وہ آزادی کے بعد پیش آنے والی پیچیدہ صورتِ حال میں مسلمانوں کے دلوں میں حوصلہ اور یقین پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کے لیے زندگی آسان نہیں رہی تھی۔ ملک کی تقسیم نے انسانوں کو خون میں نہلا دیا تھا۔ ہندو مسلم فسادات نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ٹرینیں لاشوں سے بھری آتی تھیں۔ محلے جل رہے تھے، عورتیں بیوہ ہو رہی تھیں۔ بچے یتیم ہو رہے تھے اور آزادی ایک زخم کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ان حالات میں جمیل گھر بیٹھ کر تماشائی بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ پاکستان کی طرف جو خوف زدہ تھے اور خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمان ڈرے بغیر اپنے گھروں میں رہیں۔ اسی لیے وہ گھر سے باہر رہ کر ان لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ جمیل اپنی ماں کو تسلی دیتا ہے اور اپنے عزم کا اظہار کرتا ہے۔ عالیہ کی ماں ان سب باتوں کو سنتی ہیں اور کہتی ہیں:

"توبہ، اب ملک آزاد ہو گیا ہے تو یہ کام شروع ہو گئے ہیں۔ خیر مجھے کیا۔ تم نے تار پر پتا تو ٹھیک لکھا تھا ناں؟"

ان کے لہجے میں بے نیازی اور خود غرضی کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے اس جملے میں وہ سب کچھ چھپا ہوا ہے جو وہ محسوس کر رہی ہیں۔ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان جا رہی ہیں۔ اب ان کے دل میں اس ملک کے حالات میں کوئی دل چسپی نہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ اس سے بیگانہ رہنا چاہتی ہیں۔ "خیر مجھے کیا" کہنے میں ان کی بیزاری اور لاتعلقی واضح نظر آتی ہے۔ انھیں صرف یہ غرض ہے کہ کسی طرح خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔ اسی لیے وہ پوچھتی ہیں کہ تار پر پتا تو ٹھیک لکھا تھا ناں؟ جمیل انھیں یقین دلاتا ہے اور کہتا ہے: "آپ اطمینان رکھیں، پتا ٹھیک تھا۔" وہ ایک سمجھ دار اور ذمہ دار نوجوان ہے۔ وہ اس تار کی اہمیت جانتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ چھوٹی چچی بغیر کسی پریشانی کے اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔

عالیہ کی ماں کو جب تار کی طرف سے تسلی ہو جاتی ہے تو وہ جمیل کو سمجھانے کے انداز میں کہتی ہیں "خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں۔ کیا بُری حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو،" یہ بات وہ بہت ہمدردی سے کہتی ہیں اور بات کرتے ہوئے بڑی چچی کی طرف دیکھتی ہیں۔

عالیہ کی ماں کے لہجے میں ایک بے گانہ پن اور بے اعتنائی ہے لیکن ساتھ ہی گہری سمجھ اور ہمدردی بھی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ ان کے پاکستان چلے جانے سے جمیل کی ماں تنہا رہ جائے گی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ایک لاپتہ بیٹے کے غم میں گھلتی جا رہی ہے۔ شوہر اور بیٹے کی سیاسی سرگرمیوں نے پہلے ہی گھر کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد جو خوش حالی کی امید تھی وہ بھی فسادات کی نذر ہو گئی ہے۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ جمیل اپنی ماں کا سہارا بنے اور اسے جینے کا حوصلہ دے۔ جمیل اپنے گھر اور اپنے باپ کے کاروبار کی طرف توجہ دے تاکہ گھر کے معاشی حالات بھی بہتر ہو سکیں۔

اس عبارت میں دکھایا گیا منظر اس وقت کی ذہنی، جذباتی اور سیاسی پیچیدگی کو واضح کرتا ہے۔ ایک طرف جمیل ہے جو آزادی کے بعد، نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت اور فلاح کے لیے میدان میں اترنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس کی ماں ہے جو فسادات سے خوف زدہ ہے اور جمیل کی زندگی کے لیے پریشان ہے۔ تیسری طرف عالیہ کی ماں ہے جو یہاں کے حالات سے تنگ آ کر پاکستان جا رہی ہے اور اب اسے اس ملک کے حالات سے کوئی غرض نہیں۔ سب کے رویوں میں ایک دوسرے سے بے گانگی ہے لیکن سب کی آنکھوں میں کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی بھی چھپی ہے۔ اس عبارت میں آزادی کے فوراً بعد کے ہندوستان کی کہانی نظر آتی ہے۔ یہاں ایک ایسا گھر ہے جہاں ہر فرد کی اپنی سوچ، اپنی خواہش، اپنی محرومی اور اپنا خوف ہے۔ اس کہانی میں کہیں سیاسی خواب ہیں، کہیں ذاتی درد ہے، کہیں ایک بنتا ہوا ملک ہے، کہیں ایک بکھرتا ہوا خاندان ہے اور بہت سی نم ہوتی ہوئی آنکھیں ہیں۔

عبارت نمبر 9

"کون جا رہا ہے پاکستان؟" بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔ انھوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں۔

"میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے۔" اماں نے تڑاخ سے جواب دیا۔

"کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لیے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔" بڑے چچا سخت جوش میں تھے۔

"ماشاءاللہ! آپ بڑے حق دار بن گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے، کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا۔ میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا۔ آپ ہی نے انھیں مار ڈالا۔ میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں۔" مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگی راہ نما پاکستان چلے گئے۔ ملک کو چاروں طرف سے فسادات نے گھیرا ہوا ہے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ہر ایک غم سے نڈھال ہے۔ ایک شام عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور عالیہ کی اماں ان کے ساتھ پاکستان جانے پر رضامند ہو جاتی ہیں۔ سب انھیں روکتے ہیں لیکن وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہتی ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ ان تمام حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل بھی چھت پر آ جاتے ہیں۔ وہ نیم دیوانگی میں عالیہ سے متعدد سوال کرتے ہیں۔ لیکن عالیہ خاموش رہتی ہے۔ جمیل چلے جاتے ہیں۔ آخر وہ چھمی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

جمیل، عالیہ کے ماموں کو تار کر آیا کہ عالیہ اور اس کی ماں بھی پاکستان جانے کے لیے تیار ہیں۔ عالیہ کی ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہم تو خیر پاکستان چلے جائیں گے لیکن تم اپنے گھر کی فکر کرو۔ اسی اثنا میں بڑے چچا صحن میں داخل ہوئے۔ ان کے کانوں میں یہ آواز پہنچی تو وہ پریشان ہو گئے۔ انھوں نے بوکھلا کر پوچھا "کون جا رہا ہے پاکستان؟" انھوں نے عالیہ کی ماں کی بات سُن لی تھی لیکن انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لہجے میں حیرانی، بے یقینی اور بے چینی کی جھلک نمایاں تھی۔ بڑے چچا خاندان کے بزرگ تھے۔ سب لوگ ان کے مشورے سے کام کرتے تھے۔ لیکن عالیہ کی ماں نے کسی سے مشورہ کیے بغیر اور بڑے چچا کو اعتماد میں لیے بغیر پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بڑے چچا کے سوال کے جواب میں عالیہ کی ماں نے تڑاخ سے جواب دیا "میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے۔" عالیہ کی ماں کا لہجہ اور انداز حیران کن تھا۔ اس میں بے گانگی اور دوسروں کے جذبات سے بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔ بڑے چچا کو عالیہ کی ماں کی طرف سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس گھر میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ سب ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے فیصلوں کا احترام کرتے تھے۔ چناں چہ عالیہ کی ماں کا جواب سُن کر وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔ غصے اور کرب کے ملے جلے جذبات میں بلند آواز میں وہ کہنے لگے "نہیں کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا۔ کس لیے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔"

بڑے چچا کے ان جملوں سے ان کا وہ رویہ ظاہر ہوتا ہے جو پورے خاندان پر اختیار اور کنٹرول چاہنے والے فرد کا ہوتا ہے۔ وہ خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے چاہتے ہیں کہ سب ان کی مرضی کے تابع رہیں۔ بڑے چچا کا یہ رویہ صرف ان کا ذاتی رویہ نہیں بلکہ یہ اس زمانے کا ایک تہذیبی رویہ بھی تھا۔ ایک خاندان میں سب لوگ مل جل کر رہتے تھے اور ہر معاملے میں خاندان کے سربراہ کے فیصلوں کو ہی فوقیت دی جاتی تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر خاندان کے کسی فرد کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

بڑے چچا عالیہ اور اس کی ماں کو پاکستان جانے سے روکتے ہیں۔ دراصل بڑے چچا کانگریس کے حامی تھے۔ کانگریس کا مؤقف یہ تھا کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر چلے جائیں اور حکومت مقامی لوگوں کے حوالے کر دیں۔ ملک متحد رہے اور اس میں بسنے والی تمام قومیتیں مل جل کر زندگی بسر کریں۔ اسی لیے وہ پاکستان کے قیام کے خلاف تھے اور ہندوستان کی آزادی کو ہی اصل کامیابی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کے خلاف جو جدوجہد انھوں نے کی تھی، جو قربانیاں انھوں نے دی تھیں، انھی کے نتیجے میں ملک آزاد ہوا ہے۔ اب آزاد ہندوستان یہاں کے لوگوں کا وطن ہے۔

کیا پوچھتے ہو نام و نشانِ مسافراں ہندوستاں میں آئے ہیں ہندوستان کے تھے (جون ایلیا)

بڑے چچا جوش میں آ کر کہتے ہیں کہ ''اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آیا ہے''، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی تھیں، ان کا پھل مل گیا ہے۔ اب انگریز یہاں سے جا چکے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ اس لیے یہاں کے لوگ بھوک، افلاس اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ انگریز یہاں کے غریب عوام کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ وہ ان پر ظلم ڈھاتے اور انھیں انصاف سے محروم رکھتے تھے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد اب یہاں کے لوگوں کے عیش کرنے کے دن آئے تھے۔ عیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ اب ہندوستان کے لوگ آزادی اور عزت سے سر بلند کر کے زندگی گزار سکیں گے۔ اب ان کو عزت، تحفظ، سیاسی شراکت اور برابری کے حقوق حاصل ہوئے ہیں۔ بڑے چچا کو بھی اچھی نوکری اور کاروبار کے لیے امداد ملنے کی توقع تھی۔ یہی ان کے لیے ''عیش'' تھا۔

بڑے چچا عالیہ اور اس کی ماں کو پاکستان جانے سے منع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان جانا ہار ماننے کے مترادف ہے۔ ان کے لیے پاکستان ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ صرف مذہب کی بنیاد پر چلے جائیں گے۔ حالاں کہ انھوں نے ہندوستان کے لیے ساری زندگی جدوجہد کی اور انگریزوں کے مظالم برداشت کیے۔ انھیں ہندوستان سے پیار ہے اور وہ اسے چھوڑ کر جانے کو درست نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ غصے میں آ کر کہتے ہیں کہ کوئی نہیں جائے گا پاکستان۔ وہ عالیہ کی ماں کے فیصلے کو اپنی ذاتی شکست سمجھتے ہیں۔ ان کے اس جملے میں سیاسی تلخی، ذاتی انا، قربانیوں کا دکھ اور آزادی کا غرور سب شامل ہے۔ سیاسی طور پر وہ آزاد اور متحد ہندوستان کے حامی تھے۔ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ پاکستان بننا، ان کے سیاسی نظریے کی شکست تھی۔ اب انھیں یہ دکھ تھا کہ جس ہندوستان کو انھوں نے قربانیاں دے کر آزاد کرایا تھا، لوگ اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں (جون ایلیا)

بڑے چچا نے جوش اور اپنائیت میں جو باتیں کیں، ان پر عالیہ کی ماں کو غصہ آ گیا۔ مارے غصے کے ان کی آواز کانپنے لگتی ہے۔ وہ کہتی ہیں: ''ماشاء اللہ! آپ بڑے حق دار بن گئے۔ نہ کھلانے کے، نہ پلانے کے۔ کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا۔ میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا، آپ ہی نے انھیں مار ڈالا۔ میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں''۔ یہ کرب، یہ الزام اور طوفانی ردِعمل، عالیہ کی ماں کے دل میں چھپی ساری تلخیاں باہر لے آتا ہے۔ برسوں سے دبائے ہوئے دکھ کو وہ ایک لمحے میں الفاظ میں بدل دیتی ہے۔ اس کے شوہر کا انتقال، اس کی بیٹی کی یتیمی اور اس کی تنہائی، سب اس کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اسے اپنا گھر چھوڑ کر اس گھر میں رہنا پڑا۔ یہ مجبوری اس کے دل کو چیرنے لگی۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے شوہر کو سیاسی نظریات نے نگل لیا اور وہ دنیا میں تنہا اور مجبور ہو کر رہ گئی۔ جب وہ اپنی یتیم بیٹی کے ساتھ زمانے کے اتنے دکھ

سہہ چکی ہے اور اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر چکی ہے تو بڑے چچا حق جتانے کو آ گئے ہیں۔ وہ طیش میں بڑے چچا کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ ان کے فیصلوں کو روک سکیں۔

اس عبارت میں دیا گیا تمام منظر نامہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان کا بننا صرف ایک جغرافیائی تقسیم نہیں تھی بلکہ اس نے ایک گھر کے آنگن میں تفریق کی ایک لکیر کھینچ دی تھی۔ ایک چھت کے نیچے رہنے والے لوگ دو الگ الگ نظریات کے حامل ہو گئے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہندوستان کو اپنا وطن مانتے تھے۔ انھوں نے انگریزوں سے آزادی کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ جینا چاہتے تھے اور اس کے لیے ایک الگ ملک کو ضروری سمجھتے تھے۔

عبارت نمبر (10)

''کریمن بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو۔ بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔ ''کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا سے تھی۔'' عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی، اماں کیا کہتی رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔ ''کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی؟'' ''ہاں بڑے چچا، اماں جو تیار ہیں۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا، لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا، پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی! اپنی ماں کو سمجھا لو، اب تمھارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے۔'' ''بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں، میں انھیں کس طرح چھوڑ دوں، وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تڑپوں گی، آپ۔۔۔ آپ تو۔۔۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگ کے تمام راہ نما پاکستان کے دارالحکومت کراچی چلے گئے۔ لیکن عوام فسادات کا شکار ہو گئے، پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہر شخص فسادات کی زد میں تھا۔ تقسیم نے لوگوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عالیہ کی اماں بھی اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان جانے پر رضامند ہو گئی تھی۔ سب گھر والوں نے اسے جانے سے روکا لیکن اس نے کسی کی نہیں مانی۔ جمیل اور عالیہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن عالیہ اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی اور پاکستان جانے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ بڑے چچا انھیں جانے سے روکتے ہیں جس پر عالیہ کی اماں کہتی ہیں بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے، کون سا دکھ ہے جو ہم نے یہاں نہیں دیکھا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ ان تمام حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے اور کچھ دیر بعد جمیل بھی اس کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ وہ نیم دیوانگی کی حالت میں اس سے سوالات کرتے رہے۔ لیکن اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور خاموش کھڑی رہی۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

عالیہ کی اماں پاکستان جانے کی بات کر رہی تھیں جب بڑے چچا صحن میں داخل ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کون پاکستان جا رہا ہے۔ عالیہ کی اماں نے بتایا تو وہ جوش میں کہنے لگے کہ میری اجازت کے بغیر کوئی پاکستان نہیں جا سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اب ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اور اب ہمارے عیش کے دن آ گئے ہیں۔ عالیہ کی اماں بھی بپھر گئیں اور اپنے شوہر کی وفات کا الزام بڑے چچا کو دینے لگیں۔ عالیہ کی اماں نے بڑے چچا کو خوب جلی کٹی سنائیں تو ماحول افسردہ ہو گیا۔ خلافِ توقع باتیں سُن کر بڑے چچا بھی رنجیدہ ہو گئے اور سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔ انھوں نے بڑی افسردگی سے کہا: کریمن بوا! میرا کھانا بیٹھک میں

بھجوادو'' بڑے چچا کا دل ٹوٹ گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے خاموشی سے اٹھ کر الگ ہو گئے۔ وہ اپنے جذبات اور کمزوری کو دوسروں سے چھپانا چاہتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ سنا تھا وہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ عالیہ کی اماں کے سخت الفاظ اور اپنے شوہر کی موت کا انھیں الزام دینا، ان کے لیے ایک گہرا صدمہ تھا۔ ان کے جذبات کا بوجھ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ ان سے بحث بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ وہ بیٹھک میں جا کر اپنے دکھ کو چھپانا چاہتے تھے۔

یہ سارا منظر دیکھ کر عالیہ بے چین ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بڑے چچا نے ہمیشہ ان کے لیے قربانی دی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ اسے باپ جیسی شفقت دی تھی۔ اماں کا رویہ دیکھ کر عالیہ کو افسوس ہوا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ اماں سے کہا: ''کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور میرا ساتھ دو۔'' یہاں یہ بات اہم ہے کہ عالیہ کی اماں اپنے شوہر کی موت کا الزام بڑے چچا کو کیوں دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے چچا اور عالیہ کا باپ دونوں کانگریس کے حامی تھے۔ عالیہ کا باپ عملی سیاست میں بھی سرگرم تھا اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے لیے کوشاں تھا۔ اسے انگریزوں کے خلاف سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں قید میں ڈال دیا گیا۔ اس پر غداری کا مقدمہ چلا اور قید کے دوران میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات کا عالیہ کی ماں پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ بڑے چچا پر الزام لگاتی ہیں کہ: ''آپ ہی نے میرے شوہر کو مروایا، آپ ہی نے انھیں چھین لیا۔'' عالیہ اس الزام کا جواب اپنی اماں کو دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ بڑے چچا نے کسی کو مجبور نہیں کیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کریں۔ ہر کسی کو اپنے سیاسی نظریات رکھنے اور ان پر بات کرنے کا حق حاصل ہے۔ ان نظریات کی بنیاد پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی بھی سب کو آزادی ہے۔ اس لیے اگر عالیہ کے باپ نے انگریزوں کے خلاف کچھ کیا تھا تو اپنی مرضی سے کیا تھا۔ انھیں اس کی سزا ملی تو بڑے چچا کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

بڑے چچا کی حالت دیکھ کر عالیہ کو رنج ہوا اور اس نے اپنی اماں کو بھی دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ:

''آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا سے تھی۔''

عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی۔ اس کے اندر بھی جذبات کا طوفان تھا۔ اس نے اماں کی بات کی پروا نہ کی اور نہ ہی سنا کہ اماں اسے کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ ایک بیٹی کی طرح بڑے چچا کے پاس گئی اور انھیں تسلی دی۔ اس کی اماں نے جو زیادتی کی تھی، وہ اس کا مداوا کرنا چاہتی تھی۔ عالیہ کو دیکھ کر بڑے چچا کو کچھ تسلی ہوئی۔ عالیہ کی اماں کی باتیں سُن کر انھیں جو مایوسی ہوئی تھی، عالیہ کے آنے سے وہ کم ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں امید کی چمک پیدا ہوئی اور انھوں نے دھیرے سے پوچھا ''کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی؟'' اس سوال کے پیچھے صرف حیرت اور غصہ نہیں تھا بلکہ التجا اور امید تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عالیہ پاکستان جانے سے انکار کر دے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان میں رہے اور اسی کو اپنا وطن سمجھے۔ لیکن عالیہ نے جو جواب دیا اس میں بے بسی تھی۔ اس نے کہا: ''ہاں بڑے چچا، اماں جو تیار ہیں۔'' یہ ایک ایسی سچائی تھی جسے وہ خود بھی قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ اس کے لہجے میں دکھ تھا اور بڑے چچا کے لیے محبت تھی۔ اس کی مجبوری تھی کہ اماں کا فیصلہ حتمی تھا اور وہ اپنی ماں کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔

اس موقع پر بڑے چچا نے ایک ایسی بات کہی جو تقسیم ہند کے سیاہ باب کی ایک جھلک ہے۔ انھوں نے کہا: ''یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا۔ لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا۔'' یہ صرف ایک شکایت نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ انگریزوں کی تقسیم سے لاکھوں انسان بے گھر ہو گئے، خاندان بکھر گئے، بستیاں جل گئیں، دل ٹوٹ گئے اور لوگ اپنے ہی ملک میں اجنبی بن گئے تھے۔ بڑے چچا کے لیے یہ بٹوارہ ان کی سیاسی جدوجہد کی شکست تھی۔ انھوں نے متحدہ ہندوستان کے خواب دیکھے تھے۔ اب ان کے سامنے صرف ہندوستان ہی تقسیم نہیں ہوا تھا، ان کا اپنا خاندان تقسیم ہو رہا تھا۔ وہ بکھرتے ہوئے خاندان کو متحد رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عالیہ اور اس کی اماں پاکستان نہ جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ عالیہ اپنی اماں کو سمجھائے اور بتائے کہ اب آرام و سکون کا زمانہ آ گیا ہے۔ تمام دکھ ختم ہو گئے ہیں اور اب انھیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔

عالیہ نے بڑے چچا کی بات سنی تو اسے ان پر ترس آنے لگا۔ وہ ان کے لیے کس قدر فکر مند تھے، وہ انھیں ہر صورت اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن عالیہ کے لیے سب سے بڑی مجبوری اس کی ماں کا فیصلہ تھا۔ اس نے کہا: ''بڑے چچا، میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں، میں انھیں کس طرح چھوڑ دوں؟'' اس سے عالیہ کی فرماں برداری نظر آتی ہے۔ وہ ایک کشمکش کی کیفیت میں تھی۔ ایک طرف اماں کا فیصلہ اور دوسری طرف بڑے چچا کا پیار اور درد۔ اس کشمکش میں وہ ٹوٹ رہی تھی۔ عالیہ جانتی تھی کہ سکھ کا زمانہ ہو یا دکھ کا، اماں کو چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا سہارا تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اماں پاکستان ضرور جائیں گی اور وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اسے اپنا یہ گھر، یہ رشتہ، یہ پیار، سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس گھر کو چھوڑ کر وہ خود بھی تڑپے گی۔ بڑے چچا سے بات کرتے کرتے وہ جذباتی ہو گئی۔ اس کی باتوں میں تڑپ تھی، درد تھا اور بے بسی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

فسانے درد محرومی کے دہرائے نہیں جاتے　　کچھ ایسے زخم ہوتے ہیں جو دکھلائے نہیں جاتے

اس عبارت میں صرف ایک مکالمے کا سلسلہ نہیں بلکہ تین مختلف انسانوں کے ٹوٹتے ہوئے دل اور بکھرتی ہوئی امیدیں ہیں۔ وہ حالات کے سامنے بے بسی اور مجبوری کی ایک مکمل تصویر نظر آتے ہیں۔ بڑے چچا کی خاموشی، عالیہ کی محبت اور اس کی ماں کی ضد، سب مل کر ایک ایسا جذباتی منظر بناتے ہیں جو قاری کے دل کو چھو جاتا ہے۔

مہارت نمبر (11)

''چھوٹی دلھن کو مجھ سے سخت نفرت ہے، ٹھیک ہے، میں نے تم لوگوں کے لیے کچھ بھی نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آتی۔ مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جا رہی ہے، پھر دکانوں کو چلانے کے لیے دس پندرہ ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے۔ میں چھوٹی دلھن کی سب شکایتیں رفع کر دوں گا''۔۔۔ انھوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا۔۔۔ ''کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟ لالٹین کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے، اب ان شاء اللہ تھوڑے دنوں میں کنکشن بحال کرا لوں گا اور اب تم ایم۔ اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو۔ میرا خیال ہے کہ تم کو اگلے سال ضرور داخل کرا دوں۔''

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جی ہی جی میں گھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا۔ خدا آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے۔۔۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت پہنچ گئے۔ ملک میں جا بجا فساد برپا ہے۔ ایک شام عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور وہ عالیہ کی اماں کو اپنے ساتھ پاکستان جانے کا کہتے ہیں۔ جس پر اماں رضامند ہو جاتی ہیں۔ عالیہ جمیل کی محبت اور بڑے چچا، چچی کی الفت کی وجہ سے پاکستان جانا نہیں چاہتی۔ لیکن اماں کی وجہ سے رضامند ہو جاتی ہے۔ جمیل بھیا، بڑے چچا، چچی سب عالیہ کی اماں کو پاکستان جانے سے روکتے ہیں لیکن وہ پاکستان جانے پر بضد ہوتی ہیں اور بڑے چچا سے اُلجھ پڑتی ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ ان تمام معاملات سے فرار حاصل کرنے کے لیے اوپر چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل بھی اوپر آ جاتے ہیں اور نیم دیوانگی کے عالم میں اس سے متعدد سوال کرتے ہیں، جن کا وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ شدید ذہنی دباؤ میں ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

اس اقتباس میں بڑے چچا کی جذباتی حالت اوران کی امیدیں دکھائی گئی ہیں۔ عالیہ کی ماں کے سخت جملوں سے دل گرفتہ ہوکر بڑے چچا بیٹھک میں جاکر لیٹ گئے۔ عالیہ انھیں تسلی دینے کے لیے ان کے پاس آئی۔ بڑے چچا نے عالیہ سے جو باتیں کیں وہ ماضی کی یاد اور حال کی تلخ حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک سہانے مستقبل کی امید بھی ہیں۔ عالیہ ان کی باتیں سنتی ہے مگر وہ خود ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ تقسیم ہند کے بعد اقتصادی اور معاشی بحالی کے حوالے سے لوگوں کی امیدوں کو بیان کرتی ہیں۔ عالیہ کی اماں سے جلی کٹی سننے کے بعد بڑے چچا بیٹھک میں چلے جاتے ہیں۔ عالیہ بھی بڑے چچا کی محبت میں ان کے پیچھے بیٹھک میں چلی جاتی ہے۔ بڑے چچا عالیہ سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ چھوٹی دلھن کو مجھ سے نفرت ہے۔ ٹھیک ہے میں نے تمھاری یتیمی کے باوجود تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کیا مگر اب وقت آگیا ہے کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آئے گی۔ مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جارہی ہے۔ پھر دکانوں کو چلانے کے لیے دس پندرہ ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے۔ دراصل بڑے چچا کانگریسی تھے۔ تقسیم ہند کے مخالف اور گاندھی کے حمایتی تھے۔ کانگریس نے اپنے حامیوں کو اچھی ملازمت اور مالی مدد کا خواب دکھایا تھا۔ اسی لیے بڑے چچا اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان جانے کے حق میں نہیں تھے۔

کانگریس کی حکومت سے ان کے دل میں یہ امید جاگی کہ وہ پہلے کی طرح خوش حال ہوجائیں گے۔ حکومت کی مدد سے معاشی بحران ختم ہوجائے گا اور زندگی پہلے سے بھی زیادہ خوش حالی میں گزرے گی۔ بقول شاعر:

ــ دل نا اُمید تو نہیں ناکام ہی تو ہے — لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے (فیض احمد فیض)

یا

ــ موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ — گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے (فانی بدایونی)

مصنفہ بتاتی ہیں کہ بڑے چچا کا خیال ہے کہ معاشی بحالی سے سب کچھ بہتر ہوجائے گا۔ چھوٹی دلھن کے سارے گلے شکوے دور ہوجائیں گے۔ جس وقت وہ یہ تمام باتیں عالیہ سے کررہے ہوتے ہیں، ان کے گھر کے حالات نہایت خراب ہوتے ہیں۔ گھر میں اتنا تیل بھی موجود نہیں ہوتا کہ لالٹین میں ڈال کر اس کی مدھم روشنی کو بحال رکھا جاسکے۔ لیکن بڑے چچا کانگریس کی حکومت سے پُرامید ہیں کہ وہ ان کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اس لیے وہ لالٹین کی مدھم روشنی سے پریشان نہیں ہوتے بلکہ عالیہ سے کہتے ہیں کہ اب اِن شاءاللہ تھوڑے ہی دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال کرالوں گا اور تمھارا اگلے سال ایم۔اے میں داخلہ بھی کرادوں گا۔

مصنفہ مزید بتاتی ہیں کہ عالیہ اپنے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی وہ اپنے والد سے کرتی تھی۔ لہٰذا ان کی شفقت دیکھ کر انھیں چھوڑ کر پاکستان جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ اس کا جی کٹ رہا ہے۔ آنسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ان سب سے بچھڑنے کا دکھ اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ وہ جی ہی جی میں گھٹ رہی تھی۔ وہ اپنا کرب چھپانے کے لیے دل ہی دل میں اپنے بڑے چچا سے کہتی ہے کہ خدا آپ کو سکھ دے۔ آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے۔ وہ اپنے بڑے چچا کو کس طرح کہتی کہ وہ یہاں سے خود بھاگنا چاہتی ہے۔ اتنی شفقت اور جمیل کی محبت کے باوجود وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ کیوں کہ وہ ان تمام حالات وواقعات سے آزاد ہونے کے لیے راہِ فرار تلاش کررہی تھی۔ بقول شاعر:

ــ نہ جانے محبت کا انجام کیا ہے — میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں (احسان دانش)

اس اقتباس میں مصنفہ نے تقسیم ہند کے وقت لوگوں کی جذباتی کشمکش کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں بڑے چچا کا دکھ، عالیہ کی بے بسی اور ماحول کی سنجیدگی ایک ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ سب کرداروں کو ٹوٹتے رشتوں اور جدائی کا دکھ ہے مگر حالات کے سامنے سب مجبور اور بے بس ہیں۔ مصنفہ نے سادہ الفاظ میں گہرے جذبات سمو دیے ہیں۔ اس عبارت میں حالات، جذبات اور ماحول اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اسی لمحے میں محسوس کرتا ہے۔

عبارت نمبر 12

اسرار میاں بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے پٹ کھول رہے تھے۔ عالیہ اٹھ کر صحن میں آگئی۔
اماں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کررہی تھیں۔ جمیل بھیا اب تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے تک آنگن میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی۔

شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن ہورہی تھی۔ چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ ”تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا“

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگی راہ نما پاکستان کے دارالحکومت کراچی چلے گئے۔ لیکن عوام فسادات کا شکار ہوگئے۔ لوگوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ انھی حالات میں عالیہ کے ماموں نے انھیں خط لکھا اور اپنے ساتھ پاکستان جانے کو کہا۔ جس پر عالیہ کی اماں رضامند ہوگئیں۔ سارے گھر والوں نے انھیں جانے سے روکا لیکن وہ بضد رہیں۔ عالیہ، جمیل اور اس گھر کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی اسے پاکستان جانے پر رضامند ہونا پڑا کیوں کہ وہ اپنی اماں کا واحد سہارا تھی اور انھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ ان تمام حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد جمیل بھی اس کے پیچھے چھت پر آگئے۔ وہ اس سے نیم دیوانگی کے عالم میں سوالات کرتے رہے اور اسے جانے سے روکتے رہے۔ لیکن اس نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور خاموش کھڑی رہی۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیم ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

عالیہ بڑے چچا کے پاس، بیٹھک میں تھی۔ بڑے چچا انھیں سمجھانے کی کوشش کررہے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اب ان کے دن بدلنے والے ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا کاروبار ختم ہوگیا تھا اس لیے اب ان کی جماعت کانگریس کاروبار کے لیے انھیں کچھ رقم بھی دے دے گی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ عالیہ اور اس کی اماں پاکستان جانے کا ارادہ ترک کردیں اور ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرلیں۔ بڑے چچا کی باتیں سُن کر اور اماں کے فیصلے کو دیکھ کر عالیہ بہت اُلجھن میں تھی۔ ابھی وہ بڑے چچا کے ساتھ باتیں کررہی تھی کہ اسرار میاں بیٹھک میں داخل ہوئے۔ وہ ابھی دروازے کے پٹ کھول رہے تھے تو عالیہ وہاں سے اٹھ کر صحن میں آگئی۔

اسرار میاں، عالیہ کے سوتیلے چچا تھے۔ وہ اس کے دادا کی دوسری بیوی کے بیٹے تھے۔ اس وقت کی خاندانی روایت کے مطابق سوتیلوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا۔ معزز خاندانوں میں دوسری بیوی کے بچوں کو پہلی بیوی کے بچوں کے برابر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے اسرار میاں رہتے تو بڑے چچا کے گھر میں تھے لیکن ان کو کبھی گھر کا فرد نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان کا ٹھکانہ بیٹھک تک محدود تھا۔ انھیں گھر کے معاملات میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اس گھر کا فرد ہونے کے باوجود خاندان سے الگ تھلگ تھے۔ کریمن بوا جو اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی، ہمیشہ اسرار میاں کے ساتھ تلخ رویہ رکھتی تھی۔ عالیہ نے بھی بچپن سے یہی رویہ دیکھا تھا کہ اسرار میاں خاندان کا حصہ ہوکر بھی ہمیشہ اجنبی اور کمتر تھے۔ اس لیے عالیہ بھی ہمیشہ ان سے دور رہتی تھی۔ عالیہ اور اسرار میاں کے درمیان نہ محبت تھی اور نہ ہی جذباتی قربت۔ حالاں کہ اسرار میاں عالیہ کے سوتیلے چچا تھے لیکن جیسے ہی وہ بیٹھک میں داخل ہوتے ہیں، عالیہ فوراً وہاں سے اُٹھ کر صحن میں آجاتی ہے۔ اس سے خاندان کے اندر طبقاتی، نسبی اور جذباتی تقسیم بھی نظر آتی ہے۔ اگرچہ سوتیلا ہونے میں اسرار میاں کا کوئی قصور نہیں لیکن خاندانی ڈھانچہ اور اس کی روایت ایسی ہے کہ کوئی اس کے قریب آنے کو تیار نہیں۔

بیٹھک سے اٹھ کر عالیہ صحن میں آ گئی۔ وہ شدید ذہنی اور جذباتی دباؤ میں تھی۔ وہ تنہائی کی تلاش میں تھی جہاں وہ کرب کے لمحے گزار سکتی۔ اس نے دیکھا کہ صحن میں اماں اور بڑی چچی باتوں میں مصروف تھیں۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ان کی باتوں میں اب بھی وہی تکرار، تلخی اور شکوے شامل تھے جنھوں نے اسے ہمیشہ الجھن میں رکھا تھا۔ عالیہ ان باتوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا ابھی تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ ان کا یہ عمل ان کے اندر کی بے چینی اور جذباتی طوفان کو ظاہر کر رہا تھا۔ جمیل میاں، جو ہمیشہ پُر اعتماد اور مضبوط نظر آتے تھے، اب اندر سے بکھر رہے تھے، حالات، رشتے، فیصلے، فسادات اور سیاسی تقسیم جیسے مسائل نے انھیں الجھا دیا تھا۔ وہ خاموش تھے لیکن ان کی بے چینی اور دلی کیفیت سب پر عیاں تھی۔

عالیہ تھوڑی دیر کے لیے آنگن میں کھڑی رہی۔ وہ اماں اور چچی کی باتوں، جمیل کی بے چینی اور بیٹھک کی خاموشی کو دیکھ اور محسوس کر رہی تھی۔ وہ ان سب سے دور جانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے اوپر چھت پر چلی گئی۔ اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن اور پرسکون تھی۔ آسمان کے درمیان میں چاند چمک رہا تھا۔ یہ منظر ظاہر کرتا ہے کہ حالات جیسے بھی سنگین ہوں، فطرت کا حسن جلوے دکھاتا رہتا ہے۔ چاند کا آسمان پر چمکنا بھی ایک طرح سے امید، روشنی اور ایک نئی صبح کا اشارہ ہے۔ شبنم سے بھیگی رات، چاند کی نرم و ملائم چاندنی اور رات کا سکون، ایک دل فریب رومانوی منظر پیش کرتا ہے، لیکن عالیہ کے دل کو اس منظر سے کوئی واسطہ نہیں۔ باہر کی دنیا دل فریب تھی مگر وہ اندر سے الجھنوں کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

آنسو تارے رنگ گلاب سبھی پردیس چلے جاتے ہیں آخر آخر تنہائی ہے کس نے کس کا ساتھ دیا ہے (بشیر بدر)

رات کی پُر سکون خاموشی میں روزانہ قریب کی چھت پر گراموفون ریکارڈ بجتے تھے۔ آج بھی حسبِ معمول گراموفون پر ایک ریکارڈ بج رہا تھا:

تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا

اس زمانے میں گراموفون ایک ایسا آلہ ہوتا تھا۔ جس پر گیت بجائے جاتے تھے۔ اس میں ایک بڑا سا سپیکر ہوتا تھا جس سے آواز نکلتی تھی۔ ریکارڈ گراموفون پر رکھ کر ایک مخصوص سوئی سے بجایا جاتا تھا۔ یہ ریکارڈ ہاتھ سے یا خودکار طریقے سے گھومتا تھا اور اس پر ایک سوئی چلتی تھی جس سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہ آلہ بہت عام تھا۔ لوگ اسے گھروں میں موسیقی سننے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہاں گراموفون کا بجنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا اپنی دھن میں مگن ہے اور ہر طرف خوشیاں ہیں لیکن عالیہ کا دل اداس اور غمگین ہے۔

گراموفون پر بجنے والا ریکارڈ ''تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا'' بھی ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔ اس لمحے یہ گیت بہت گہرے اثرات لیے ہوئے ہے۔ گیت کے یہ بول جیسے خود عالیہ کی حالت بیان کر رہے ہیں۔ عالیہ بھی ایک مسافر ہے جو ایک نئے ملک اور نئی منزل کی طرف جا رہی ہے، اس نئی منزل پر وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والی ہے۔ اس کی گٹھڑی میں چور لگا ہے۔ یہ چور وسوسوں اور اندیشوں کا ہے۔ اس کے دل میں دکھ، تذبذب اور الجھنیں چھپی ہوئی ہیں جو اس کا سکون چُرا رہی ہیں۔

آنکھ راہزن نہیں تو پھر کیا ہے لُوٹ لیتی ہے قافلہ دل کا (جلیل مانک پوری)

اس عبارت میں گہرا جذباتی ماحول دکھایا گیا ہے۔ اس میں ہر کردار کسی نہ کسی الجھن اور بے چینی کا شکار ہے۔ سب کردار ایک ہی ماحول میں سانس لے رہے ہیں مگر ہر ایک کی کیفیت الگ ہے۔ مصنفہ نے عورت کا خاموش درد، مرد کی بے آواز تکلیف اور تقسیم کے بعد کے منتشر ماحول کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

عبارت نمبر 13

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی، کیسی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔'' کیا یہ میں ہوں؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی۔۔۔۔ حد ہے دیوانگی کی، وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک بار مڑی تو جمیل بھیا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگی۔ اب یہ کیا کہنے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا۔ ''کیا سچ مچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' انھوں نے دھیرے سے پوچھا۔ ''ہاں'' اس نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔

''تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی۔ تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔'' ''میں ہر جگہ خوش رہوں گی۔ مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ ملک میں جا بجا فسادات برپا تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ایک شام عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور عالیہ کی اماں ان کے ساتھ پاکستان جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ سب گھر والے عالیہ کی اماں کو پاکستان جانے سے روکتے ہیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتی اور بڑے چچا سے بھی اُلجھ پڑتی ہے۔ پہلے پہل عالیہ جمیل کی محبت اور بڑے چچا، چچی کی شفقت کی وجہ سے ادھر رکنا چاہتی تھی لیکن پھر جانے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنفہ کہتی ہیں کہ عالیہ جمیل کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ جمیل نیچے چلے جاتے ہیں اور عالیہ بے قراری سے چھٹی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

اس اقتباس میں عالیہ کی ذہنی و جذباتی کشمکش کو نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ حالات کی شدت اور مستقبل کے خوف سے پریشان ہے۔ وہ حالات کے سامنے ایسی مجبور اور بے بس ہو گئی ہے کہ خود کو پہچاننے سے بھی قاصر ہے۔ دوسری طرف جمیل بھی الجھن کا شکار ہے۔ وہ عالیہ کو روکنا چاہتا ہے لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عالیہ اور جمیل دونوں حالات کے جبر کا شکار ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنفہ عالیہ اور جمیل بھیا کی بے قراری و بے چینی کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ عالیہ ان تمام حالات سے آنکھیں چُراتے ہوئے اپنے دل کو بہلانے کے لیے چھت پر چلی جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتی ہے۔ اپنے آنگن اور جمیل کو چھوڑ کر جانے کا خیال اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ نہایت شکستہ دلی میں عجیب سی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اس کی نفسیاتی کیفیت نہایت عجیب و غریب تھی۔ اس لمحے وہ سب کو چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جمیل سے ہمیشہ کی جدائی کے بارے میں سوچ کر اس کا دل کٹنے لگتا ہے۔ اس لمحے وہ خود کو بے حس و حرکت محسوس کرتی ہے جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔

شاید ان تمام عوامل کے پیچھے جمیل کی محبت کارفرما تھی۔ لیکن وہ اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اپنی اس دیوانگی سے تنگ آ جاتی ہے اور خود سے سوال کرتی ہے کہ کیا یہ میں ہوں؟ جمیل سے جدائی کا احساس اس کے بدن سے جیسے اس کی روح کھینچ رہا ہے۔ اس سے پہلے تو اس کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہوئی۔ وہ بے دھیانی میں باتیں کرنے لگی اور اپنی اس کیفیت سے خود حیران ہو گئی۔ وہ

جانتی تھی کہ وہ جمیل سے محبت کرتی ہے لیکن وہ اس حقیقت سے آنکھیں چُرا رہی تھی اور جا بجا خود کو دھوکا دیتے ہوئے اس کی محبت سے انکار کر رہی تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس محبت کو تسلیم کرنا اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ لیکن اسے تو اپنے وطن پاکستان جانا تھا، جہاں سارے اس کے ہمدرد اور اپنے تھے۔ بقول فیض احمد فیض:

؎ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یا بقول بشیر بدر:

؎ کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

مصنفہ مزید بتاتی ہیں کہ عالیہ اپنے خیالات کی جنگ میں محو چھت پر ٹہل رہی ہوتی ہے۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے پیچھے مڑتی ہے تو جمیل بے حس و حرکت کھڑا ہوتا ہے۔ جمیل کو دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتی ہے اور تیزی سے ٹہلنے لگتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ انھوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا۔ انھوں نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ جمیل بھیا عالیہ سے پوچھتے ہیں کہ تم واقعی پاکستان جا رہی ہو؟ وہ بغیر رُکے یوں ہی ٹہلتے ہوئے انھیں جواب دیتی ہے کہ ہاں! میں جا رہی ہوں۔ جمیل کی حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ اسے یہاں روکنا چاہتا ہے۔ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اسے کہتا ہے کہ تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی۔ تم نے ایک بار کہا تھا کہ یادیں بہت اذیت ناک ہوتی ہیں۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسے ان کی یاد نہیں ستائے گی۔ کیا وہ سب کچھ فراموش کر چکی ہے۔ یہاں سے جا کر وہ یک طرفہ اذیت کا شکار ہو جائے گی۔ کیوں کہ عالیہ کے جانے کا خیال جمیل کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا اور وہ اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جمیل اسے بھی اس بات پر آمادہ کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان نہ جائے، جمیل عالیہ سے کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔ جس پر عالیہ بغیر لچک دکھائے اور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کہتی ہے کہ میں ہر جگہ خوش رہوں گی۔ یعنی اس کو جمیل کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور ان کی موجودگی کا اس کی خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ یہ سب اس لیے کہتی ہے کہ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی۔ تمام عوامل کو پسِ پشت ڈال کر اس نے اماں کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بقول شاعر:

؎ ہائے مجبوری دلِ ناشاد کی روبرو ان کے بھی نہ فریاد کی (یادگار شاہ وارثی)

یہ عبارت انسان کے باطن میں پلنے والی ان الجھنوں کا اظہار ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتیں۔ عالیہ اور جمیل کے درمیان مکالمہ ایک ناتمام رشتے کا درد معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کے دل جذبات سے معمور ہیں لیکن الفاظ کم ہیں۔ دونوں کردار حالات کے سامنے بے بس اور بے اختیار ہیں۔ مصنفہ نے دونوں کرداروں کی باطنی کیفیت کو مکالمے کی صورت میں بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

عبارت نمبر 11

''تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہوگا۔'' وہ جانے کے لیے مڑے۔ ''تم خوش رہو گی نا؟'' انھوں نے رک کر پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ جمیل بھیا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے اور اس نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔ بڑی دیر تک یوں ہی ٹہلنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو چھمی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنفہ کہتی ہیں کہ آخر پاکستان بن گیا۔ مسلم لیگی راہ نما پاکستان چلے گئے۔ ملک کو چاروں طرف سے فسادات نے گھیر لیا۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ایک شام عالیہ کے ماموں کا خط آتا ہے اور عالیہ کی اماں ان کے ساتھ پاکستان جانے کے لیے رضامند ہو جاتی ہیں۔ جمیل بھیا، بڑے چچا، چچی، عالیہ کی اماں کو پاکستان جانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن وہ جانے کے لیے بضد رہتی ہیں اور بڑے چچا کے ساتھ بگڑنے لگتی ہیں۔ عالیہ، جمیل کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود اماں کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ عالیہ کو یوں لگتا ہے جیسے اس فیصلے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت چھین لی ہے۔ وہ چھت پر ٹہلنے لگتی ہے اور ادھر سے جمیل بھی چھت پر آ جاتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے اس لیے اس کا سباق نہیں۔

تشریح

خدیجہ مستور اُردو ادب کی ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے جذبات، معاشرتی مسائل اور تقسیمِ ہند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

عالیہ کی اماں نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانیں۔ بڑے چچا نے جب انھیں اپنا فیصلہ بدلنے کو کہا تو اماں نے طیش میں آ کر انھیں بھی سخت باتیں سنا دیں۔ بڑے چچا دلبرداشتہ ہو کر بیٹھک میں چلے گئے۔ عالیہ نے جا کر انھیں تسلی دی۔ عالیہ شدید ذہنی اور جذباتی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ چھت پر ٹہلنے کے لیے چلی گئی۔ شبنم سے بھیگی رات خوب روشن تھی۔ سارا ماحول پُرسکون تھا۔ قریب سے کہیں گراموفون ریکارڈ کی آواز آ رہی تھی۔

''تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا۔''

اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت چھین لی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی اور اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی کہ آگے کیا ہوگا۔ وہ اس گھر کو چھوڑ کر بہت دور جا رہی تھی۔ اسے اس کا بھی دکھ تھا۔ اسے اس گھر سے، اس آنگن سے اور اس ماحول سے خاص انس اور لگاؤ تھا۔ اس نے یہاں وقت گزارا تھا۔ اسے یہاں کے ہر کونے سے محبت تھی۔ اس کے دل میں بڑے چچا کے لیے احترام تھا، جمیل کے ساتھ ایک بے نام سا رشتہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح سب کچھ اچانک بدل گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی تو اس کا ماحول، یہاں کے لوگوں کے ساتھ تعلق اور خود اس کی اپنی شناخت بھی بدل جائے گی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر صدیوں کی تھکاوٹ طاری تھی اور اس کی روح اس کے جسم سے نکلنے والی ہو۔ اسے اپنی شناخت پر شک ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتی ہے ''کیا یہ میں ہوں؟'' اپنی آواز سن کر وہ خود حیران رہ گئی۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے مڑ کر دیکھا تو جمیل ایک بت کی طرح کھڑا تھا۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت تھا۔ عالیہ تیزی سے ٹہلنے لگی۔ جمیل اس سے تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی پاکستان جا رہی ہے۔ عالیہ اعتراف کرتی ہے کہ وہ ماں کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ جمیل اسے کہتا ہے تم پاکستان جا کر غلطی کرو گی۔ وہ اسے روکنا چاہتا ہے۔ اس کی آواز میں دکھ کے ساتھ خفگی اور نرمی بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم وہاں جا کر خوش نہیں رہو گی۔ عالیہ ایسے جذباتی مقام پر پہنچ چکی تھی کہ اس کے دل میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔ وہ جمیل سے کہتی ہے کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی بات، کوئی تعلق اور کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔

جمیل کو یقین ہو چلا تھا کہ عالیہ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرے گی۔ پھر بھی وہ آخری کوشش کرتا ہے۔ اس کے دل میں جذبات کا طوفان تھا لیکن اس کا انداز بہت مہذب اور شائستہ تھا۔ اس نے ہمت کر کے آخری بات کی جو اس کے جذبات کا بھرپور اظہار تھی۔ اس نے عالیہ سے کہا: ''تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہوگا۔'' یہ ایک جذباتی اور علامتی جملہ ہے جو گہرے معنی رکھتا ہے۔ اس کا مطلب کوئی مالی قرض نہیں بلکہ ایک جذباتی وابستگی اور تعلق ہے جو جمیل عالیہ کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ جمیل یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ عالیہ نے اس کے دل میں جگہ بنائی اور اس کے جذبات، احساسات اور امیدوں کو جگایا۔ اب وہ بغیر کچھ کہے اور بغیر کوئی وعدہ

کیے دور جارہی تھی تو وہ اس تعلق کی مقروض تھی۔ وہ کہتا ہے کہ عالیہ کو یہ قرض چکانا ہوگا۔ یعنی ایک نہ ایک دن عالیہ بھی اس محبت کو محسوس کرے گی اور جمیل کی محبت کا جواب محبت کی صورت میں دے گی۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جمیل عالیہ کو محبت کا، رفاقت کا، شاید کسی خاموش وعدے کا مقروض سمجھتا ہے جو وہ اس جدائی کے لمحے پر لوٹائے بغیر جارہی تھی۔

وہ جانے کے لیے مڑتا ہے لیکن رک کر عالیہ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور آخری سوال کرتا ہے: ''تم وہاں خوش رہو گی ناں؟'' اس سوال میں جدائی کا گہرا دکھ چھپا ہے۔ جمیل جانتا ہے کہ عالیہ خوش نہیں رہ سکے گی۔ عالیہ کو بھی اس بات کا ادراک ہے مگر اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔ عالیہ خاموش رہتی ہے۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کچھ کہہ کر وہ جمیل کی امیدوں کو سہارا نہیں دینا چاہتی۔ جمیل کسی ایسے جواب کا منتظر ہے جو اس کی امید کو زندہ رکھ سکے۔ وہ کچھ لمحے جواب کے انتظار میں کھڑا رہا پھر چپ چاپ چلا گیا۔

جمیل بھیا کے جانے کے بعد عالیہ کو ایسا لگا جیسے وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔ اسے لگا کہ وہ صرف اپنا گھر بلکہ اپنے رشتے اور اپنی پہچان کھو رہی تھی۔ وہ اپنے جذبات اور دل کی گہرائی میں چھپی امید کھو رہی تھی۔ وہ اپنی اس خاموش محبت کو کھو رہی تھی جو اس کے دل میں موجود تھی لیکن وہ اسے کبھی سمجھ نہ سکی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا وجود محض ایک سایہ رہ گیا تھا۔ اس پر محبت کی حقیقت عیاں ہو رہی تھی اور اس کا وجود گویا تحلیل ہوتا جارہا تھا۔

عالیہ بڑی دیر تک یوں ہی ٹہلتی رہی۔ اس کا ٹہلنا اس کے اندر کی بے چینی، اضطراب اور بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے اضطراب کو کم کرنے کے لیے وہ ٹہلتی رہی اور آخر تھک گئی۔ وہ اپنے دل کی کیفیت اور اپنی مجبوریوں کا حال کسی کو سنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے آس پاس کوئی اس کا محرمِ راز نہیں تھا۔ بقول شاعر:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں　　(الطاف حسین حالی)

تھک ہار کر آخر وہ چھمی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ وہ چھمی کو خط کے ذریعے یہاں سے جانے کی اطلاع دینا چاہتی تھی۔

چھمی عالیہ کی چچازاد بہن ہے، وہ بھی پہلے اسی گھر میں رہتی تھی، مگر اب اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے سسرال جا چکی ہے۔ عالیہ کا چھمی سے گہرا تعلق ہے۔ وہ اسے اپنی باتیں، جذبات اور دکھ بانٹنے کے لیے خط لکھنا چاہتی ہے۔ چھمی اس خاندان کے حالات سے واقف ہے اس لیے عالیہ اسے اپنا دکھ سمجھانے میں سکون محسوس کرتی ہے۔

اس عبارت میں عالیہ کا کرب، مجبوری اور بے بسی دکھائی گئی ہے۔ دراصل عالیہ کا دکھ ذاتی نہیں، اجتماعی ہے۔ اس کا درد ایک نسل کا درد ہے۔ ایک ایسی نسل جس نے تقسیم کا عمل نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس عمل کا نتیجہ بھی برداشت کیا تھا۔ ملک کی تقسیم، خاندانوں کی تقسیم بھی تھی۔ خاندانوں کی تقسیم ایک ایسا جذباتی اور نفسیاتی دکھ تھا جو لفظوں میں نہیں سما سکتا۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستان ادھوری　　میری موت سے نہ ہوگی میرے غم کی ترجمانی　　(احمد ندیم قاسمی)

مشقی سوالات

سوال نمبر:۱۔ مختصر جواب دیں۔

۱۔ ناول ''آنگن'' کس تناظر میں لکھا گیا ہے؟

جواب۔ ناول ''آنگن'' ہجرت سے پہلے خاندانی کش مکش کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

۲۔ ''مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جارہا تھا۔'' اس جملے میں ''نچلا نہ بیٹھا جارہا تھا'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب۔ ''مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جارہا تھا۔'' اس جملے میں ''نچلا نہ بیٹھا جارہا تھا'' محاورہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بہت زیادہ پُرجوش تھیں۔

۳۔ عالیہ کی اماں نے بڑے چچا کو کون سے سخت الفاظ کہے؟

جواب۔ عالیہ کی اماں نے بڑے چچا کو غریب، ظالم اور قاتل کہا۔ انھوں نے بڑے سخت لہجے میں ان سے بات کی۔

۴۔ عالیہ نے بڑے چچا کی محبت میں کیا الفاظ ادا کیے؟

جواب۔ عالیہ نے بڑے چچا کی محبت میں کہا کہ انھیں بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اپنے ابا سے تھی۔ اس نے کہا کہ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا۔

سوال نمبر:۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ سبق ''اور پاکستان بن گیا'' خدیجہ مستور کی تصنیف سے ماخوذ ہے:

الف۔ کھیل　　ب۔ بوچھار　　ج۔ چند روز اور　　د۔ آنگن

۲۔ ''آنگن'' نثری اصناف ادب کے لحاظ سے ہے:

الف۔ ناول　　ب۔ ڈراما　　ج۔ داستان　　د۔ افسانہ

۳۔ سبق ''اور پاکستان بن گیا'' کا مرکزی نسوانی کردار ہے:

الف۔ عالیہ　　ب۔ کریمن بوا　　ج۔ عالیہ کی ماں　　د۔ جمیل کی ماں

۴۔ متن کے مطابق جمیل بھیا نے تار کسے بھیجا؟

الف۔ ماموں کو　　ب۔ چچا کو　　ج۔ دوست کو　　د۔ چچی کو

۵۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرندے مسلسل:

الف۔ بول رہے تھے　　ب۔ شور مچا رہے تھے　　ج۔ خاموش تھے　　د۔ اُڑ رہے تھے

۶۔ ''تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا۔'' اس گیت کی آواز کہاں سے آرہی تھی؟

الف۔ ریڈیو سے　　ب۔ ٹیپ رکارڈ سے　　ج۔ گراموفون سے　　د۔ ٹیلی وژن سے

جوابات

۱	آنگن	۲	ناول	۳	عالیہ	۴	ماموں کو	۵	شور مچا رہے تھے
۶	گراموفون سے								

سوال نمبر:۳۔ متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ.....کا خط آ گیا۔

۲۔ جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور.....کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی۔

۳۔ کریمن بوا آج تو.....کی طرح چیخنے لگیں۔

۴۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے.....مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

۵۔ مدھم روشنی میں بڑی چچی اور کریمن بوا کے.....بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جوابات

۱	ماموں	۲	عالیہ	۳	ڈائنوں	۴	پرندے	۵	چہرے

سوال نمبر:۴۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

انسانی معاشرے کا ایک اہم گوشہ حقوقِ نسواں کا ہے۔ اسلام نے حقوقِ نسواں واضح طور پر متعین فرما کر ان کی فراہمی اور استفادے کو بھی یقینی بنایا ہے۔ پوری دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی دوسری تہذیب نظر نہیں آتی جس نے مکمل طور پر عورت کے حقوق کی پاس داری کی ہو۔ اسلام نے خواتین کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہوئے ان کے فرائض کی جہتوں کا تعین کر دیا ہے۔ ان کے فرائض ان کی بساط کے مطابق رکھے ہیں اور ان کی عزت و عظمت کی حفاظت اور پاس داری کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ اسلام نے خواتین کو کسبِ معاش اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری سے مکمل طور پر آزاد کر کے متعلقہ مرد حضرات کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ عورت شادی سے قبل والد کی اور نکاح کے بعد شوہر کی کفالت میں آجاتی ہے۔ اس کی تمام تر بنیادی ضروریات کی فراہمی ان مردوں پر لازم قرار دی گئی ہے۔ عورت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ آزادی سے عمومی تعلیم یا پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت حاصل کرے۔ اسلام خواتین کو ان کے بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی یقینی بناتا ہے اور ان کی کفالت مرد حضرات پر عائد کرتا ہے۔ دین اسلام عورت کے اس مالی حق کی حفاظت کرتے ہوئے ان کو وراثت کا باقاعدہ حصہ دار بناتا ہے۔

آئینِ پاکستان میں بھی خواتین کے حقوق کے بارے میں بالکل واضح قوانین موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے ملک پاکستان اسلام کی روح کے مطابق عورت کو اس کے بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے اور اسی آئین کی روشنی میں وفاق اور صوبوں کی سطح پر حقوق نسواں کے حوالے سے مختلف قوانین بنائے گئے ہیں۔ ان میں بعض قوانین ایسے بھی ہیں جو قیام پاکستان سے پہلے بنے مگر قیام پاکستان کے بعد بھی ان کو جاری رکھا گیا اور بعض قیام پاکستان کے بعد ہی بنائے گئے۔ ان قوانین میں شادی شدہ خواتین کی جائیداد سے متعلق ۱۸۸۲ء کا ایکٹ، کم سنی کی شادی کی ممانعت کا ایکٹ ۱۹۲۹ء، مسلمان خاتون کا تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء، مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء، حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء تحفظ نسواں (فوجداری ایکٹ) ۲۰۰۶ء، ملازمت کی جگہ پر خواتین کو ہراساں کرنے سے متعلق ایکٹ ۲۰۱۰ء، خواتین کے خلاف اقدامات (ترمیم فوجداری قانون) ایکٹ ۲۰۱۱ء اور پنجاب تحفظ نسواں بل ۲۰۱۶ء اہم قوانین ہیں جو کہ اس ملک میں انسانی بنیادی حقوق کے مطابق عورت کو اس کا جائز مقام اور حق دلانے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

سوالات:

۱۔ ''حقوق نسواں'' کے لغوی معنی کیا ہیں؟

جواب۔ ''حقوق نسواں'' کے لغوی معنی ''عورتوں کے حقوق'' ہیں۔

۲۔ اسلام نے خواتین کو کن ذمہ داریوں سے آزاد کیا ہے؟

جواب۔ اسلام نے خواتین کو کسب معاش اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری سے مکمل آزاد کیا ہے۔

۳۔ اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

جواب۔ حقوق نسواں

۴۔ بنیادی انسانی حقوق کی نشان دہی کریں۔

جواب۔ خوراک، لباس اور رہائش بنیادی انسانی حقوق بتائے گئے ہیں۔

ترکیب کے لحاظ سے جملے کے اجزا:

الفاظ کا مجموعہ کلام، مرکب تام یا جملہ کہلاتا ہے۔ جملہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک بے معنی اور دوسرا با معنی۔ با معنی جملے کو جملہ تام کہتے ہیں مثلاً: سیب میٹھا ہے۔ جملہ تام کے دو حصے ہوتے ہیں: وہ حصہ جس میں کسی شخص یا چیز کا ذکر ہو اسے مسند الیہ اور جو کچھ کسی شخص یا چیز کے بارے میں کہا جائے اسے مسند کہتے ہیں۔ اوپر کے جملے میں ''سیب'' مسند الیہ اور ''میٹھا ہے'' مسند ہے۔ جملے میں مسند اسم ہوتا ہے جب کہ مسند کبھی اسم ہوتا ہے اور کبھی فعل۔

جملے کی اقسام: جملے کی دو اہم اقسام درج ذیل ہیں: ۱۔ جملہ اسمیہ ۲۔ جملہ فعلیہ

۱۔ جملہ اسمیہ: ایسا جملہ جس میں مسند الیہ اور مسند دونوں اسم ہوں اور آخر میں فعل ناقص آئے۔ مثلاً: ارشد عقل مند ہے۔

۲۔ جملہ فعلیہ: ایسا جملہ جس میں مسند الیہ اسم ہو اور مسند فعل ہو، مثلاً: لڑکا کھیلتا ہے۔

جملہ فعلیہ کے تین بڑے اجزا فاعل، مفعول اور فعل تام ہوتے ہیں۔ مسند الیہ کو فاعل، مسند کو مفعول اور آخر میں آنے والے فعل کو فعل تام کہتے ہیں۔

سوال نمبر:۵۔ درج ذیل جملوں میں سے مسند الیہ اور مسند علیحدہ علیحدہ کریں۔

۱۔ جانور صحت مند ہے۔

جواب۔ مسند الیہ: جانور مسند: صحت مند ہے۔

۲۔ ارسلان نماز پڑھتا ہے۔

جواب۔ مسند الیہ: ارسلان مسند: نماز پڑھتا ہے۔

۳۔ طلبہ سکول گئے۔

جواب۔ مسند الیہ: طلبہ مسند: سکول گئے۔

۴۔ وہ صبح سویرے اٹھ جاتا ہے۔

جواب۔ مسند الیہ: وہ مسند: صبح سویرے اٹھ جاتا ہے۔

سوال نمبر:۶۔ اس سبق میں سے پانچ جملہ اسمیہ اور پانچ جملہ فعلیہ تلاش کر کے کاپی میں لکھیں۔

جواب۔ **جملہ اسمیہ:**

۱۔ اماں کا منہ سرخ تھا۔ ۲۔ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ ۳۔ پاکستان میں اپنوں کی حکومت ہوگی۔
۴۔ ماموں کا خط آیا۔ ۵۔ سب چلے گئے۔

جملہ فعلیہ:

۱۔ سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ۲۔ ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ ۳۔ عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی۔
۴۔ اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی۔ ۵۔ میں تار کر آیا ہوں۔

ضرب المثل: ضرب کے معنی ہیں بیان کرنا اور مثل کے معنی ہیں مثال۔ ضرب المثل کے معنی ہوئے مثال دے کر بیان کرنا۔ ضرب المثل کو اردو میں مقولہ یا کہاوت بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسا جملہ ہے جو مثال کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس جملے میں جو بات کہی جائے اسے عالم گیر سچائی (Universal Truth) کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ضرب الامثال یا کہاوتیں صدیوں کے تجربات اور انسانی زندگی کے لاتعداد مشاہدات کے جواہر پارے ہوتے ہیں اور انھیں علم و حکمت کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً: آپ کاج مہا کاج، آ بیل مجھے مار، آج کا کام کل پر نہ چھوڑو، وغیرہ

سوال نمبر:۷۔ درج ذیل ضرب الامثال کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

جوابات:

۱۔ **آج مرا کل دوسرا دن**

کون کسی کو یاد کرتا ہے، آج مرے کل دوسرا دن۔

۲۔ **تن کنگال تو من کنگال**

بھوکے پیٹ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا، تن کنگال تو من کنگال۔

۳۔ **ترے گا سو ڈوبے گا**

احتیاط کرنے والے کا نقصان نہیں ہوتا کیوں کہ جو ترے گا سو ڈوبے گا۔

۴۔ **بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی**

اس سے جو ملے لے لو، بزرگ کہتے ہیں بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

۵۔ **اپنا اپنا غیر غیر**

اپنا اپنا ہوتا ہے اور غیر غیر اس لیے کبھی بھی غیروں پر بھروسا نہ کرو۔

۶۔ **دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا**

دو پارٹیوں کے درمیان اسلم کا بہت نقصان ہوا۔ سچ کہتے ہیں دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

سوال نمبر:۱۰۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں۔

۱۔ دارالحکومت، ۲۔ امن، ۳۔ مروت، ۴۔ تیوری،

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
دارالحکومت	دَارُالحُکُومَت	ڈبڈبائی	ڈَبْڈَبَائی	بسیرا	بَسَیْرا	کلیجہ	کَلیجہ
امن	اَمْن	مروت	مُرُوَّت	تیوری	تیْوری		

درخواست نویسی:

اصطلاحاً درخواست وہ تحریر ہے جو کسی ماتحت یا عام آدمی کی طرف سے کسی مسئلے یا شکایات کے حل کے لیے متعلقہ افسر کے نام لکھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی طالب علم کی اپنے ادارے کے پرنسپل کے نام درخواست لکھنا۔ درخواست مجوزہ طریق کار کے مطابق لکھی جاتی ہے۔

درخواست کے حصے:

الف۔ مخاطب ب۔ موضوع ج۔ آداب د۔ نفس مضمون ہ۔ اختتامیہ اور تاریخ

سوال نمبر:11۔اپنے محلے میں مناسب روشنی کے انتظام کے لیے میونسپل ایڈمنسٹریٹر کے نام درخواست لکھیے۔
جواب۔ عملی کام (راہ نمائی کے لیے دیکھیے حصہ درخواست نویسی)
سوال نمبر:12۔سبق ''اور پاکستان بن گیا'' کا خلاصہ تحریر کریں۔
جواب۔دیکھیے سبق کا خلاصہ

مصنفہ سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

درست جواب کا انتخاب کریں۔

(1) خدیجہ مستور پیدا ہوئیں:
(الف)1926ء (ب)1927ء (ج)1928ء (د)1929ء (ب)

(2) خدیجہ مستور فوت ہوئیں:
(الف)1981ء (ب)1982ء (ج)1983ء (د)1984ء (ب)

(3) خدیجہ مستور کا تعلق تھا:
(الف)بریلی سے (ب)دلی سے (ج)لکھنو سے (د)بجنور سے (الف)

(4) خدیجہ مستور گھرانے میں پیدا ہوئیں:
(الف)پٹھان (ب)سندھی (ج)بلوچی (د)پنجابی (الف)

(5) خدیجہ مستور شہر میں پیدا ہوئیں:
(الف)دلی (ب)کلکتہ (ج)لکھنو (د)لاہور (ج)

(6) خدیجہ مستور کی والدہ کا نام ہے:
(الف)بانو قدسیہ (ب)شہناز خاتون (ج)نور جہاں (د)انور جہاں (د)

(7) خدیجہ مستور کی والدہ تھیں:
(الف)شاعرہ اور مضمون نویس (ب)ڈراما نگار اور ناول نگار (ج)ناول نگار اور افسانہ نگار (د)فیشن ڈیزائنر اور شاعرہ (الف)

(8) خدیجہ مستور کی بہن کا نام ہے:
(الف)ادا جعفری (ب)نوشی گیلانی (ج)پروین شاکر (د)ہاجرہ مسرور (د)

(9) خدیجہ مستور کی بہن ادبی صنف کے لحاظ سے مشہور ہے:
(الف)افسانہ (ب)ڈراما (ج)ناول (د)داستان (الف)

(10) خدیجہ مستور نے لکھنا شروع کیا:
(الف)1938ء (ب)1940ء (ج)1942ء (د)1948ء (ج)

(11) خدیجہ مستور نے ادبی زندگی کا آغاز کیا:
(الف)افسانہ سے (ب)ڈراما سے (ج)ناول سے (د)داستان سے (الف)

(12) خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کو انعام دیا گیا:
(الف) قائداعظم ایوارڈ (ب)غالب ایوارڈ (ج)نیشنل ایوارڈ (د)آدم جی ایوارڈ (د)

(13) ناول آنگن کا کینوس اور پلاٹ ہے:
(الف)مختصر (ب)طویل (ج)پیچیدہ (د)محیر العقول (الف)

(14) ناول آنگن پس منظر میں لکھا گیا:
(الف)قیامِ پاکستان (ب)جنگ عظیم اول (ج)جنگ عظیم دوم (د)جنگ آزادی (الف)

(15) خدیجہ مستور نے اپنی کہانیوں میں مسائل کو بیان کیا ہے:
(الف)خواتین کے (ب)بچوں کے (ج)نوجوانوں کے (د)متوسط طبقے کے (الف)

(16) زمین، بوچھار، چند روز اور، تھکے ہارے تصانیف ہیں:
(الف)بانو قدسیہ (ب)ہاجرہ مسرور (ج)رتن ناتھ سرشار (د)خدیجہ مستور (د)

(17) خدیجہ مستور کا انداز تحریر ہے:
(الف)سادہ اور دل کش (ب)مقفیٰ و مسجع (ج)سلیس اور رواں (د)تمثیلی (ج)

(18) خدیجہ مستور کے والد کا نام تھا:
(الف)شیر علی خاں (ب)باقر علی خاں (ج)تہور علی خاں (د)طاہر علی خاں (ج)

(19) جب والدہ فوت ہوئیں تو، اُس وقت خدیجہ مستور کی عمر تھی:
(الف)نو برس (ب)دس برس (ج)گیارہ برس (د)بارہ برس (الف)

(20) خدیجہ مستور کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی پرورش کی:
(الف)دادا نے (ب)نانا نے (ج)چچا نے (د)ماموں نے (ب)

(21) قیام پاکستان کے بعد خدیجہ مستور آ گئیں:
(الف)اسلام آباد (ب)حیدر آباد (ج)کراچی (د)پشاور (ج)

(22) خدیجہ مستور کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کھیل'' شائع ہوا:
(الف)1942ء میں (ب)1944ء میں (ج)1946ء میں (د)1948ء میں (ب)

(23) خدیجہ مستور کا افسانوی مجموعہ ''تھکے ہارے'' شائع ہوا:
(الف)1960ء میں (ب)1962ء میں (ج)1964ء میں (د)1966ء میں (ب)

(24) خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' شائع ہوا:
(الف)1960ء میں (ب)1962ء میں (ج)1964ء میں (د)1966ء میں (ب)

(25) خدیجہ مستور کی آخری تصنیف ''زمین'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی:
(الف)1980ء میں (ب)1983ء میں (ج)1985ء میں (د)1987ء میں (د)

(26) خدیجہ مستور کو آدم جی ایوارڈ ملا:
(الف)بوچھار پر (ب)زمین پر (ج)چند روز اور پر (د)آنگن پر (د)

(27) خدیجہ مستور کا افسانوی مجموعہ ''بوچھار'' شائع ہُوا:
(الف)1942ء (ب)1944ء (ج)1946ء میں (د)1948ء میں (ج)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ سبق ''اور پاکستان بن گیا'' کی صنف ہے:
(الف) ڈرامہ (ب) ناول (ج) افسانہ (د) داستان (ب)

2۔ سبق ''اور پاکستان بن گیا'' کا ماخذ ہے:
(الف) تھکے ہارے (ب) ٹھنڈا میٹھا پانی (ج) زمین (د) آنگن (د)

3۔ سبق ''اور پاکستان بن گیا'' کے کردار ہیں:
(الف) پانچ (ب) چھ (ج) سات (د) آٹھ (ج)

4۔ پاکستان بن گیا تو لگی راہ نما جا چکے تھے:
(الف) کراچی (ب) حیدر آباد (ج) اسلام آباد (د) لاہور (الف)

5۔ جب پاکستان بنا، اس وقت دار الحکومت تھا:
(الف) اسلام آباد (ب) کراچی (ج) لاہور (د) حیدر آباد (ب)

6۔ کس جماعت کے رہنما کراچی جا چکے تھے؟
(الف) کانگریس (ب) جمعیت علمائے اسلام (ج) مسلم لیگ (د) جماعت اسلامی (ج)

7۔ خون کی ہولی کہاں کھیلی جا رہی تھی؟
(الف) پنجاب میں (ب) سندھ میں (ج) اتر پردیش میں (د) علی گڑھ میں (الف)

8۔ کون صدمے سے نڈھال ہو رہے تھے؟
(الف) اسرار میاں (ب) جمیل بھیا (ج) شکیل (د) بڑے چچا (د)

9۔ بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے اُن کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو:
(الف) پانی کی ندی (ب) شہد کی ندی (ج) دودھ کی ندی (د) خون کی ندی (د)

10۔ فساد کی خبر سُن سُن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں:
(الف) اماں (ب) کریمن بوا (ج) چھمی (د) عالیہ (ب)

11۔ سبق ''اور پاکستان بن گیا'' میں کس شہر کے گھرانے کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں؟
(الف) دہلی (ب) لکھنو (ج) یو۔پی (اتر پردیش) (د) کراچی (ج)

12۔ بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں کہ ''کہاں ہو گا میرا _____ :
(الف) شکیل (ب) خلیل (ج) جلیل (د) راحیل (الف)

13۔ جمیل بھیا اماں سے کہتے ہیں، یہ فساد وساد تو ختم ہو جائیں گے:
(الف) دو دن میں (ب) چار دن میں (ج) چھ دن میں (د) آٹھ دن میں (ب)

14۔ جمیل بھیا اماں کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ رہتا:
(الف) سُرخ (ب) روشن (ج) فق (د) خوف زدہ (ج)

15۔ شام سب لوگ بیٹھے _____ پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آ گیا:
(الف) چائے (ب) کافی (ج) لسی (د) دودھ (الف)

16۔ کس کے ماموں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی تھیں؟
(الف) راحیلہ (ب) شکیلہ (ج) عالیہ (د) جمیلہ (ج)

17۔ جمیل بھیا اماں سے کہتے ہیں اپنی دے دوں گا:
(الف) خدمات (ب) جان (ج) قربانی (د) جائیداد (ب)

18۔ جمیل نے بڑی مدت بعد سفارشی نظروں سے دیکھا:
(الف) عالیہ کی طرف (ب) چھمی کی طرف (ج) چچی کی طرف (د) کریمن بوا کی طرف (الف)

19۔ ''عالیہ جانے پر راضی نہیں ہو گی'' یہ کس نے کہا؟
(الف) شکیل نے (ب) بڑے چچا نے (ج) اسرار میاں نے (د) جمیل بھیا نے (د)

20۔ جمیل بھیا اماں سے کہتے ہیں، میں ابھی تار کیے دیتا ہوں کہ سب:
(الف) بیمار ہیں (ب) تیار ہیں (ج) ناراض ہیں (د) پریشان ہیں (ب)

21۔ عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر _____ کرے کہ وہ نہیں جائے گی:
(الف) شور (ب) ہنگامہ (ج) اعلان (د) واویلا (ج)

22۔ عالیہ کے گلے میں تو کانٹے چبھ رہے تھے:
(الف) سیکڑوں (ب) ہزاروں (ج) لاکھوں (د) لاتعداد (الف)

23۔ عالیہ بڑے سکون سے کاٹنے لگی:
(الف) آم (ب) سیب (ج) چھالیہ (د) سبزی (ج)

24۔ عالیہ خود سے ہم کلام ہو کر کہتی ہے کہ اگر تم رہ گئیں تو ہمیشہ کے لیے پھنس جاؤ گی:
(الف) منجھدار میں (ب) دلدل میں (ج) بھنور میں (د) طوفان میں (ب)

25۔ ''کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلھن'' بڑی دیر چپ رہنے کے بعد پوچھا:
(الف) بڑے چچا نے (ب) کریمن بوا نے (ج) اسرار میاں نے (د) بڑی چچی نے (د)

26۔ ''یہ گھر تمھارا ہے چھوٹی دلھن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو'' یہ کس نے کہا؟
(الف) کریمن بوا نے (ب) بڑی چچی نے (ج) چھمی نے (د) عالیہ نے (ب)

27۔ پناہ ڈھونڈنے کے لیے اوپر بھاگ گئی:
(الف) چھمی (ب) کریمن بوا (ج) بڑی چچی (د) عالیہ (د)

28۔ ہائی اسکول کے احاطے میں مسلسل شور مچا رہے تھے:
(الف) بچے (ب) اساتذہ (ج) پرندے (د) چپراسی (ج)

29۔ عالیہ جب نیچے اُتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں بیٹھے تھے:
(الف) محو (ب) گم (ج) کھوئے ہوئے (د) مگن (د)

30۔ عالیہ نے سُوئی کرسی کی طرف دیکھا تو خیال آیا:
(الف) شکیل کا (ب) جمیل بھیا کا (ج) بڑے چچا کا (د) اسرار میاں کا (ب)

31۔ ''جانے یہ سر پھرا آدمی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا'' عالیہ نے یہ جملہ کس کے بارے میں کہا؟
(الف) شکیل میاں (ب) اسرار میاں (ج) جمیل بھیا (د) راحیل بھیا (ج)

32۔ لالٹین کی بتی خراب تھی اس لیے اس میں سے لویں اُٹھ رہی تھیں:
(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ (الف)

33۔ لالٹین کی چمنی ایک طرف سے ہو گئی تھی:
(الف) سُرخ (ب) سیاہ (ج) سفید (د) پیلی (ب)

34۔ مدھم روشنی میں اماں، بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے لگ رہے تھے:
(الف) خوب صورت (ب) روشن (ج) پیارے پیارے (د) بگڑے بگڑے (د)

35۔ جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور بیٹھ گئے:
(الف) چارپائی پر (ب) پلنگ پر (ج) کرسی پر (د) بنچ پر (ج)

36۔ جمیل بھیا سے یہ کس نے کہا کہ ''تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آ جایا کرو؟''
(الف) بڑے چچا نے (ب) بڑی چچی نے (ج) کریمن بوا نے (د) اسرار میاں نے (ب)

37۔ مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں رہیں:
(الف) بہادری سے (ب) دلیری سے (ج) جرأت سے (د) ڈٹ کر (د)

38۔ ''کون جا رہا ہے پاکستان؟'' صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا:
(الف) اسرار میاں نے (ب) کریمن بوا نے (ج) جمیل بھیا نے (د) بڑے چچا نے (د)

39۔ ''میں اور عالیہ جائیں گے اور کسے جانا ہے'' اماں نے جواب دیا:
(الف) تڑاخ سے (ب) سختی سے (ج) بدتمیزی سے (د) پیار سے (الف)

40۔ ''کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا'' یہ کس نے کہا؟
(الف) جمیل بھیا نے (ب) اسرار میاں نے (ج) بڑے چچا نے (د) بڑی چچی نے (ج)

41۔ عالیہ کہتی ہے ''مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی _____ ہے:''
(الف) اماں سے (ب) بھائی سے (ج) ابا سے (د) چچی سے (ج)

42۔ عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر چلی گئی:
(الف) ڈرائنگ روم میں (ب) بیٹھک میں (ج) صحن میں (د) برآمدے میں (ب)

43۔ عالیہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر ______ :
(الف) رونے لگی (ب) چلی گئی (ج) سسکنے لگی (د) پریشان ہوگئی (ج)

44۔ بڑے چچا بتاتے ہیں کہ انھیں بڑی اچھی دی جا رہی ہے:
(الف) ملازمت (ب) کوٹھی (ج) دکان (د) رقم (الف)

45۔ بڑے چچا کہتے ہیں کہ انھیں دکانوں کو چلانے کے لیے امداد بھی ملنے کی توقع ہے:
(الف) پانچ دس ہزار (ب) دس پندرہ ہزار (ج) پندرہ بیس ہزار (د) بیس پچیس ہزار (ب)

46۔ بڑے چچا نے بڑے پیار سے تھپکا:
(الف) چھمی کو (ب) شکیلہ کو (ج) عالیہ کو (د) نبیلہ کو (ج)

47۔ لالٹین کی روشنی ہوتی جا رہی تھی:
(الف) دھیمی (ب) کم (ج) ختم (د) مدھم (د)

48۔ بڑے چچا عالیہ سے کہتے ہیں تم داخلہ لے لو:
(الف) ایف۔اے میں (ب) بی۔اے میں (ج) ایم۔اے میں (د) ایم۔فل میں (ج)

49۔ عالیہ ایک لمحے تک ______ کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی:
(الف) برآمدے میں (ب) آنگن میں (ج) بیڈروم میں (د) بیٹھک میں (ب)

50۔ شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی ہو رہی تھی:
(الف) روشن (ب) تاریک (ج) حسین (د) پیاری (الف)

51۔ عالیہ نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر رہ گئی:
(الف) پریشان (ب) متحیر (ج) حیران (د) دنگ (ج)

52۔ عالیہ ایک بار مُڑی تو بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے:
(الف) بڑے چچا (ب) جمیل بھیا (ج) اسرار میاں (د) شکیل بھائی (ب)

53۔ جمیل بھیا عالیہ سے کہتے ہیں کہ تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ دور رہ کر یادیں بہت ہو جاتی ہیں:
(الف) خطرناک (ب) اذیت ناک (ج) ہیبت ناک (د) خوف ناک (ب)

54۔ جمیل بھیا عالیہ سے کہتے ہیں کہ تم میری ہو:
(الف) مقروض (ب) محسن (ج) شکر گزار (د) مخلص (الف)

55۔ عالیہ بڑی دیر ٹہلنے کے بعد جب تھک گئی تو خط لکھنے بیٹھ گئی:
(الف) شکیل بھائی کو (ب) بڑے چچا کو (ج) چھمی کو (د) کریمن بوا کو (ج)

سبق ۹: نیا قانون

مصنف
سعادت حسن منٹو
(1912-1955)

مصنف کا تعارف

سعادت حسن منٹو ضلع لدھیانہ (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی گئے مگر اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو ادھورا چھوڑ کر عملی زندگی کا آغاز کیا۔

آل انڈیا ریڈیو لاہور اور بمبئی سے وابستہ ہوئے۔ کئی فلمی رسالوں کی ادارت کی اور فلموں کی کہانیاں اور مکالمے تحریر کیے۔ منٹو نے بعض ایسے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات پر نہایت جرأت اور فنی نزاکت کے ساتھ قلم اٹھایا اور ایسی کہانیاں لکھنے میں کام یاب ہوئے

جو صرف منٹو جیسے ادیب کا خاصہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے اُردو افسانہ نگاری کو پُر تکلف زبان سے نجات دلا کر بے تکلفی کی فضا سے آشنا کیا۔ ان کی تحریروں کا اہم عنصر حقیقت نگاری اور سچائی ہے۔

منٹو قیامِ پاکستان کے بعد بمبئی سے لاہور آ گئے لیکن یہاں انھیں معاشی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے زندگی کو ایک بازی کی طرح کھیلا اور ہار کر بھی جیت گئے۔ اپنی بیس سالہ ادبی زندگی میں انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں افسانے اور ڈرامے یادگار چھوڑے۔

انھوں نے روایتی تصورات پر کاری ضرب لگائی۔ اگرچہ منٹو کی بے باک اور حقیقت پسندانہ تحریریں بہت سے حلقوں کو ناگوار بھی گزرتی تھیں۔ تاہم وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ "لوگ کیا کہیں گے" بے باکانہ لکھتے رہے اور انھیں اس ضمن میں کئی عدالتی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ اپنے معاشرے کی بے ہودگیوں اور منافقتوں کا پردہ چاک کرنے سے باز نہ آئے۔

سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کے دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں:

تصانیف

"سرگزشتِ اسیر"، "سنگ"، "گنجے فرشتے" اور "لاؤڈ سپیکر"، آتش پارے، منٹو کے افسانے، دھواں، لذتِ سنگ، چغد، ٹھنڈا گوشت، یزید، نمرود کی خدائی، بادشاہت کا خاتمہ وغیرہ۔

یہ سبق پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:
- ☆ طلبہ کو ادبی زبان اور اسلوب سے واقف کرانا۔
- ☆ منٹو کی حقیقت نگاری اور مختلف سماجی، سیاسی مسائل کی پیش کش سے آگاہ کرنا۔
- ☆ طلبہ میں تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنا۔
- ☆ منٹو کے افسانوی کرداروں کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔
- ☆ طلبہ کو استعماریت اور استعماری ہتھکنڈوں سے آگاہ کرنا۔

مشکل الفاظ کے معانی

(60) **کوچوان:** (گھوڑا گاڑی چلانے والا، گاڑی بان، بگھی یا فٹن ہانکنے والا) **مدبرانہ انداز:** (تدبر اور دانش مندی کا انداز) **پیش گوئی:** (کسی بات کی پہلے سے خبر دینا) **افواہ:** (غیر مستند یا اُڑائی ہوئی خبر) **متانت:** (سنجیدگی، مضبوطی) **اعتراف:** (تسلیم کر لینا، مان لینا، اقرار) **مال روڈ:** (لاہور میں واقع ایک مصروف شاہراہ ہے جس کو شاہراہِ قائدِ اعظم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) **فساد:**